سانس ساکن تھی
نمرہ احمد

پیش لفظ

''سانس ساکن تھی'' کہانی میری اُن تحریروں میں سے ایک ہے جب میں نے لکھنا شروع کیا۔ اس تحریر کی اشاعت سے مجھے حوصلہ ملا اور مزید لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ یقیناً آپ کو اس کہانی میں بہت سی غلطیاں اور خامیاں نظر آئیں گی۔ مگر اس کے باوجود بہت سے لوگوں نے میری اس تحریر کو بہت پسند فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اردو پاپولر فکشن میں ایک مقام عطا کیا۔

میں خواتین ڈائجسٹ کی ایڈیٹر امت الصبور کی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے میری تحریر کو اپنے ڈائجسٹ میں جگہ دے کر میری حوصلہ افزائی کی۔

اس کے ساتھ میں اپنے پبلشرز جناب گل فراز احمد صاحب کی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے میری اس تحریر کو کتابی شکل میں لانے کا اہتمام کیا۔

دعاؤں میں یاد رکھیئے گا، جزاکم اللہ خیراً

نمرہ احمد

جب بھی کسی ایونٹ کو منعقد ہونے سے چند ہفتے قبل کینسل کر دیا جاتا، سب سے زیادہ غصہ فرحین کو چڑھا کرتا تھا۔ ایسی صورت میں اسے اپنے چیئرمین صاحب کی جانب سے ایک لمبا چوڑا لیٹر دبئی میں آئی سی سی کو بطور احتجاج بھجوانا پڑتا تھا اور اپنے آفس ورک میں یہی واحد کام تھا جس سے فرحین کو نفرت تھی۔

اس دفعہ انکار آسٹریلین بورڈ کی جانب سے آیا تھا، جس پر اسے ہمیشہ کی طرح ایک احتجاجی خط ٹائپ کر کے پوسٹ کرنا تھا تاکہ دبئی میں بیٹھے کرکٹ کے کرتا دھرتا لوگوں کو بھی علم ہو جائے کہ پاکستان کو برا لگا ہے۔

ان ہی باتوں اور فضول پالیسیوں کی وجہ سے اسے اپنے چیئرمین سے خاصی نفرت تھی مگر وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی کیونکہ سیکرٹری کی یہ معمولی جاب بھی اس کی بہت بڑی ضرورت تھی۔

وہ پچھلے پانچ سال سے قذافی سٹیڈیم سے منسلک تھی...... یہ ان پانچ سالوں کی محنت سے جمع ہونے والی رقم کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ اپنی بہن کی شادی کے قابل ہوئی تھی۔

ان دنوں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں اور ساتھ ہی آفس میں کام بھی بڑھ گیا تھا۔

وہ وقت سے پہلے ہی آفس پہنچ گئی سات بج کر پینتالیس منٹ پر وہ خط کا متن تقریباً چالیس فیصد لکھ چکی تھی جب یونہی کن اکھیوں سے کھڑکی سے باہر دیکھنے پر اسے پارکنگ لاٹ میں ایک مرسڈیز کھڑی دکھائی دی۔ اسے حیرت ہوئی یہ گاڑی تو یہاں کسی کے پاس نہ تھی۔

قریباً سولہ سترہ منٹ بعد اسے محسوس ہوا کہ دروازہ ہولے سے کھول کر کوئی اندر داخل ہوا ہے۔ وہ متوجہ ہوئے بغیر ٹائپنگ میں غرق رہی۔

"Your boss inside"

چند ثانیے یونہی بیت گئے جب فرحین کو نووارد کی آواز آئی۔ وہ بڑی شستہ انگریزی میں اس سے مخاطب تھا۔ اس کا لہجہ خالص برٹش تھا اور فرحین کو پتہ نہیں کیوں منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولنے والوں سے نفرت تھی۔

"جی نہیں، وہ ابھی نہیں آئے۔" اس نے اس کی جانب دیکھے بغیر ہی روکھے لہجے میں کہا۔

"آل رائٹ آئی کین ویٹ۔" وہ پھر انگریزی میں مخاطب ہوا تھا۔ فرحین کو چڑ سی ہوئی تھی۔

پتہ نہیں لوگ کیوں منہ ٹیڑھا کر کے بندروں کی طرح انگریزی بولتے ہیں۔

یکدم کی بورڈ پر متحرک اس کی انگلیاں تھم گئیں اسے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ وہ جسے اس کا منہ ٹیڑھا کر کے انگلش بولنا سمجھ رہی تھی وہ کچھ اور تھا۔

فرحین نے سر اٹھا کر اس کی جانب پہلی دفعہ دیکھا۔ وہ رخ قدرے موڑ کر کھڑا تھا۔

اس نے سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا جس میں سے گرے شرٹ کالرز باہر نکل رہے تھے۔ فرحین کو اس کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔

وہ بے حد دبلا پتلا انسان تھا۔ اس کا ہاتھ، جو اس نے لاشعوری طور پر میز پر رکھا ہوا تھا استخوانی تھا جیسے انگلیوں پر گوشت نہیں ہے۔ ہاتھ کی نسیں ابھری ہی ہوئی تھیں جیسے عموماً بوڑھے لوگوں کی ہوتی ہیں۔

اس کے سر کے بال جگہ جگہ سے سفید تھے جن سے فرحین نے اس کی عمر کا اندازہ پچاس سے اوپر ہی لگایا تھا۔

''آپ ویٹنگ روم میں جا کر ویٹ کرلیں۔'' وہ دوبارہ اپنے خط کی طرف متوجہ ہوگئی۔

وہ خط کی آخری سطور لکھنے میں بری طرح سے الجھی ہوئی تھی جب ''کلک.....کل۔'' کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے بری طرح چونک کر سر اٹھایا اور یہ دیکھ کر بھونچکی رہ گئی کہ وہ چیئرمین کے آفس کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کررہا تھا۔

فرحین کا پارہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔

''Just stop it!!!''

وہ غصے سے چلائی اور تیزی سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھی۔ اس نے نہایت بے دردی سے اس کا پتلا، کمزور ہاتھ ہینڈل سے ہٹایا اور غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے بولی۔

''کیا کہا تھا میں نے آپ کو ہاں؟ آپ ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھیں، سر آئیں گے تو میں آپ کو بلالوں گی اور آپ کی کوئی اپائنٹمنٹ بھی ہے یا نہیں؟ یا ایسے ہی منہ اٹھا کر......'' وہ یک لخت رک گئی۔

نووارد کا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ وہ الجھی نگاہوں سے اس کو دیکھنے لگی۔ اس نے آنکھوں پر لگائے سن گلاسز اتارے تو فرحین کے لیے وہ مزید ''قابل شناخت'' ہوگیا۔

اس کی جلد بے حد زرد تھی اور چہرے پر سے گویا خون اور گوشت دونوں نچوڑ لیے گئے تھے۔ ہونٹ اور آنکھوں کے اطراف جھریوں کی طرح کی دھیمی دھیمی سی لکیریں پڑی تھیں اور کنپٹیوں سے بال کافی زیادہ سفید تھے۔ اس نے اپنے گرے بالوں کو جیل لگا کر اٹالین بزنس مینوں کی طرز سے پیچھے کر رکھا تھا اور بغیر ٹائی کے سوٹ پہن رکھا تھا اور اس شخص سے بے حد مختلف لگ رہا تھا جسے وہ اچھی طرح جانتی تھی، مگر پھر بھی وہ اسے پہچان گئی اور ایک دم کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔

اس نے آنکھوں میں بے حد حیرت اور بے یقینی لیے اپنے سامنے کھڑے آدمی کی بھوری رنگت میں موجود سرد مہری کو دیکھا، اس کے چہرے، گردن، بازو، ہاتھ، پاؤں غرض جسم کے ہر حصے کو اوپر سے نیچے تک بے یقینی سے دیکھا۔ وہ شاید یقین کرنا چاہ رہی تھی کہ ''وہ'' اس کے سامنے کھڑا ہے۔

اسے بھلا کیسے یقین آ سکتا تھا؟ یہ وہ شخص تھا جس کی ''فاتحہ'' اس نے کئی برس پہلے پڑھ لی تھی، پھر بھلا یہ کیسے واپس آ سکتا تھا؟

عیسیٰ واپس آ سکتے ہیں، اس پر یقین آ سکتا تھا مگر یہ شخص واپس آ سکتا ہے، یقین نہیں آ سکتا تھا کیونکہ وہ تو کئی برس پہلے صلیب پر چڑھ چکا تھا۔

اس نے اب غور سے اس کے سوٹ کو دیکھا۔ اسے یاد آیا اس نے یہی سوٹ اپنی شادی پر پہنا تھا۔

''اوپن اٹ'' (اسے کھولو) اس نے تحکم سے دروازے کے لاک کی جانب اشارہ کیا تو فرحین کسی معمول کی طرح اپنی میز کے دراز کی طرف بڑھی اور اس میں سے چابی نکال کر دروازہ کھول دیا۔

وہ بغیر کچھ اور کہے اندر چلا گیا اور اپنے پیچھے دروازہ کھڑاک سے بند کیا۔

زوردار آواز پر وہ حقیقت حال میں واپس آئی اور اپنے سن ہوتے دماغ کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس نے شہادت کی انگلی سے کنپٹیوں کو سہلایا، پھر کام کی جانب متوجہ ہوگئی۔

خط ختم کر کے اس نے پرنٹ آؤٹ نکالا اور بے اختیار ٹشو پیپر سے چہرے پر آیا پسینہ صاف کیا۔ اے سی کی سرد اور خشک ہوا کے باوجود اس کو ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔

اس کو اپنے ہاتھ پیروں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی وہ خود کو بے حد لاچار اور بے بس محسوس کر رہی تھی۔

وہ چیئرمین صاحب کو ''اس'' کی ان کے آفس میں موجودگی کا کیا جواز پیش کرے گی؟ ہو سکتا ہے اسے نوکری سے نکال دیا جائے مگر اس نے کہا تھا ''اوپن اٹ'' اور وہ کم از کم اس شخص کو انکار نہیں کر سکتی تھی۔

چیئرمین صاحب کے پہنچنے تک وہ پورا ٹشو پیپرز کا ڈبہ خالی کر چکی تھی۔ ان کو دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور نہایت پیشہ وارانہ انداز میں سلام کرنے کے بعد کہنے لگی۔

''سر! بی سی سی آئی سے مسٹر پوار کی کال آئی تھی، آپ آفس میں نہیں تھے، ان کو کال بیک کرنا ہے اور اس کے علاوہ شام چار بجے آپ کی چیف سلیکٹرز کے ساتھ میٹنگ ہے اور وہ لیٹر میں نے ٹائپ کر لیا ہے، آپ اس پر دستخط کر دیں۔''

اس نے جلدی سے پرنٹ شدہ کاغذ اور پین ان کی جانب بڑھایا۔

چیئرمین مرزا جاوید صاحب نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا، وہ بعد میں بھی وہ لیٹر سائن کرانے کے لیے ان کے پاس لا سکتی تھی مگر فرحین اچھی طرح جانتی تھی کہ اندر بیٹھے شخص کو دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں ایسے پھولیں گے کہ وہ کچھ بھی سائن کرنے کی سکت خود میں نہیں پائیں گے۔

انہوں نے دستخط کر کے اندر کی جانب قدم بڑھایا، فرحین نے بے حد سرسری انداز میں بتایا۔

''سر! ایک وزیٹر ہیں آپ کے لیے۔''

''ان کو تھوڑی دیر بعد بھیجیے گا۔'' وہ مصروف سے انداز میں کہتے ہوئے مڑنے لگے تھے جب وہ بول اٹھی۔

''سر وہ آپ کے آفس میں ہیں۔''
وہ چونک کر پلٹے اور نہایت خفگی سے اسے دیکھا۔
''میرے آفس میں کیوں؟ کون ہے وہ؟''
''سر! وہ شاید آپ کو جانتے ہیں۔'' وہ ان کے سوال کو نظر انداز کر گئی جبکہ وہ اسے گھورتے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گئے۔
دروازہ بند ہونے پر وہ نڈھال سی ہو کر کرسی پر گر گئی۔
اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ ضرور کسی مقصد کے تحت واپس آیا تھا ورنہ اسے یوں اچانک آنے کی ضرورت نہ تھی۔
وہ بس اتنا نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا انتقام لینے آیا تھا اور انتقام لینا تو اس کی پرانی عادت تھی۔
اس کی نگاہوں کے سامنے اس کا جذبات سے عاری، جھریوں زدہ چہرہ اور کھچڑی بال گھوم گئے۔
دکھ کی ایک لہر نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔
شیر کچھار سے نکل کر اپنی راج دھانی پر قبضہ جمانے کے لیے واپس تو آ چکا تھا، مگر بوڑھا ہو کر۔
ریان حیدر بوڑھا ہو چکا تھا، مگر شیر بوڑھا ہو جائے تو زیادہ خطرناک ہوا کرتا ہے۔
اس نے اپنے باس کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھ کر بے اختیار سوچا تھا۔
آج ان دونوں میں سے کوئی نہ کوئی checkmate ہو کر بساط سے باہر پھینک دیا جائے گا، پر وہ کون ہوگا؟
پاکستان کرکٹ بورڈ کا چیئرمین یا پھر......ایک سابق کپتان؟
وہ خاموشی سے بند دروازے کو دیکھتی رہی۔

☆☆☆

جاہل، گنوار، اجڈ، بدتہذیب، منہ پھٹ اور نالائق ہونے کے ساتھ ساتھ اگر اس میں کہیں کوئی خوبی تھی تو وہ اس کا گورا رنگ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تھیں وہ گوری رنگت خوب صورت رہتی، اگر دو مہینے تک نہانے کی قسم اس نے نہ کھائی ہوتی۔ اس کی جلد سردیوں میں پھٹی ہوتی اور گرمیوں میں گرد و میل سے اٹی رہتی تھی۔ لے دے کر آنکھیں ہی بچی تھیں، جن کی پلکوں پر بکھری خشکی، صبح اٹھنے پر کناروں پر جما میل اور اس کے گھور گھور کر جاہلوں کی طرح دیکھنے والی عادت نے ان کی کشش چھین لی تھی۔
وہ (گنوار تھی، اجڈ تھی، جاہل تھی، نالائق تھی مگر ذہین تھی۔ وہ ذہانت جو دکھائی نہ دیتی تھی وگرنہ اس کا دوسرا پلس پوائنٹ بن جاتی) اس کی کھوپڑی میں چین و غفلت کی نیند سوئے، زنگ آلود ہو رہی تھی۔
بات یہیں ختم ہو جاتی تو شاید یہ کہانی نہ لکھی جاتی۔ اگر اس میں کچھ عجیب عادات نہ ہوتیں۔ اس کو اچھے اچھے رنگین خواب دیکھنے، اور خوب صورت و جاذب نظر لباس و زیورات پہننے کا شوق تھا۔ اس کا دل چاہتا، اس کی

دسترس میں ڈھیروں بیش قیمت لباس اور زیورات ہوں، خواب دیکھتے وقت وہ بس یہ بھول جاتی تھی کہ اس کا باپ رحیم بخش ایک مزدور جبکہ ماں درزن تھی۔

رحیم بخش بھی ایک عجیب ہی کردار تھا۔ روز صبح سویرے صابرہ سے لڑ جھگڑ کر مزدوری کی تلاش میں نکل جاتا اور رات گئے لوٹتا۔ وہ ہفتے میں سات دن مزدوری ڈھونڈتا اور بمشکل تین اور کبھی کبھی دو روز ہی کامیابی نصیب ہوتی۔ دن بھر حیوانوں کی مانند کی جانے والی محنت کے صلے میں ملنے والی دہاڑی سے گھر کا خرچ نکلنا بہت مشکل ہوتا تھا اسی لیے صابرہ محلے و آس پاس کے لوگوں کے کپڑے سیتی تھی۔ چند پیسے وہ اس کے ہاتھ پر رکھتی، وہ بھی وہ ''لٹا'' آتا بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنی کمائی لٹا آتا تھا۔

رحیم بخش کو شراب، ہیروئن یا عورت کسی بھی چیز کی لت نہ تھی۔ اس کے ساتھ بس ایک ہی مسئلہ تھا۔ وہ فضول خرچ اور خوش خوراک تھا۔ اس کے ہاتھ میں گویا سوراخ تھا۔ پیسہ جتنی محنت و مشقت سے اس تک پہنچتا تھا، اسی تیزی سے وہ خرچتا تھا۔ اگر اس کی بیٹی کو اچھا پہننے کا شوق تھا تو اسے اچھا کھانے کا ہوا تھا۔ جس روز جیب میں زیادہ رقم ہوتی، وہ بازار سے چاول، چھولے، دہی بڑے، چاٹ وغیرہ گھر خرید لاتا اور صابرہ کے نزدیک یہ سب عیاشی میں شمار ہوتا تھا۔ وہ اپنی کمائی کو لٹتا دیکھ کر رحیم بخش سے احتجاج کرتی تو وہ الٹا اس نصیبوں جلی کی دھنائی کر کے رکھ دیتا۔ اس کے پاس خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ البتہ دبا دبا سا احتجاج وہ ضرور ''رجسٹر'' کراتی تھی۔ کوئی چھوٹا سا طعنہ، کبھی اونچی بڑبڑاہٹ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رحیم بخش نے ''من و سلویٰ'' گھر لانا چھوڑ دیا۔ وہ وہیں بازار میں ریڑھیوں پر کچھ نہ کچھ کھا کر اپنی اشتہا مٹا لیتا اور صابرہ کے طعنوں سے بھی بچا رہتا۔

صابرہ کو احساس تھا کہ اس کی کمائی وہ نہایت بے دردی سے خرچ کر رہا ہے، اسی لیے شروع کے چند برس خاموش رہنے اور معمولی سی مزاحمت کے بعد اس نے پوری رقم رحیم بخش کے ہاتھ پر رکھنا چھوڑ دی۔ وہ چند روپے اپنے شوہر کی نگاہ سے بچا کر رکھنے لگی تھی۔

اس کو اس رویے پر غصہ آتا تھا۔ منہ پھٹ اور بدلحاظ بھی تھی۔

مگر نجانے یہ اس کی خوبی تھی یا خامی، وہ بزدل تھی، ڈرپوک تھی اور سب سے زیادہ باپ سے ڈرتی تھی۔

اسے ہر اس چیز سے ڈر لگتا تھا جس سے نہیں لگنا چاہیے تھا۔ اسے رات کو آنے والی آندھی طوفان اور گرج چمک سے ڈر لگتا تھا، چاہے وہ آسمان پر خدا کی جانب سے برسے یا گھر میں رحیم بخش کے منہ سے مغلظات کی صورت میں۔

ان کے دو کمروں کے اس ڈربے کو گھر کہنا بلا شبہ زیادتی ہوئی۔ وہ دو کمرے بھی آٹھ ضرب نو سے زیادہ کے نہ ہوں گے۔ دیواروں پر جگہ جگہ سے سیمنٹ اور پلستر کھرچا ہوا تھا۔ جابجا اکھڑے فرش اور سیلن زدہ چھتیں اس کے گھر کے مکینوں کی خستہ حالی کی غماز تھیں۔ ایک چھوٹا سا صحن، جس کے دائیں جانب باورچی خانہ اور بائیں جانب کھلی چھت والا غسل خانہ تھا۔

اس گھر سے وابستہ بچپن کی کئی یادوں میں سرفہرست وہ گھرر...... گھرر کی آواز تھی جو نشتر کی طرح اس کے کانوں میں چبھتی تھی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، اماں کی مشین کی ''گھرر گھرر'' اس کے کانوں میں پڑتی تھی۔

اس کا خیال تھا، پیدائش کے وقت اس کی سماعت میں اذان کی آواز کے بجائے سلائی مشین کا شور گونجا ہوگا۔ ایک زمانے تک تو اس کو یہ بھی شک رہا کہ اماں شاید پیدا ہی ایک سلائی مشین کے ساتھ ہوئی تھی۔

رات کو ہونے والی گرج چمک سے اس کو بے شک خوف آتا تھا، مگر دن کو برسنے والی موسلا دھار بارش اسے بے حد پسند تھی۔ وہ گلی میں اپنے جیسے گنوار، نالائق اور سکول سے بھاگے ہوئے بچوں کے ساتھ بارش کے پانی میں سارا دن کھیلتی رہتی، کاپیوں اور کتابوں کے صفحے پھاڑ کر کشتیاں بناتی یا گدلے پانی میں نہاتی۔ اس کے علاوہ ہر جمعے کو خالہ رضیہ کے گھر ٹی وی پر انگریزی فلم دیکھنے جاتی۔ ''پٹھو'' اور ''گلی ڈنڈے'' سے تو اسے خاص شغف تھا۔ غرض ہر وہ کام کرتی جس سے اس کی پڑھائی کا حرج ہوتا اور اماں سے ڈانٹ یا مار پڑتی۔

سکول سے اسے سخت نفرت تھی۔ کتابوں سے بیر اور اساتذہ سے دشمنی تھی۔ روز ٹاٹ پر بیٹھ کر تختہ سیاہ کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھنا، سلیٹ پر چاک سے روز کا کام لکھ کر تھوک سے مٹانا، استاد جی سے مار کھانا۔ ان سب کاموں کو وہ نہایت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس کی ماں چاہتی تھی وہ پڑھ لکھ جائے تاکہ کل کو اس کی طرح لوگوں کے کپڑے نہ سینے پڑیں لیکن اس کو اچھے کپڑے زیب تن کرنے کے ساتھ ساتھ اچھے کپڑے سینے کا بھی شوق تھا۔ اسے اماں کی مشین، سوئی دھاگے، فیتے، ربن، لیس اور گوٹا کناری وغیرہ نہایت دلچسپ لگتے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا وہ بھی ایسے اور اس سے بھی اچھے کپڑے بنائے مگر الماس یہ سوچتے ہوئے ہمیشہ بھول جاتی تھی کہ وہ رحیم بخش مزدور اور صابرہ درزن کی بیٹی ہے۔

☆☆☆

''تقریباً'' کتنا دے گی وہ کلموہی تیری ایک ہفتے کی محنت کا؟'' صابرہ کو کافی دیر سے مشین پر جھکے سلائی میں مصروف دیکھ کر نہایت اکتائے ہوئے لہجے میں الماس نے پوچھا تھا۔

صابرہ نے قدرے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

''کس کو کلموہی کہہ رہی ہے، منحوس ماری؟'' وہ آنکھیں نکالتے ہوئے بولی۔ گالی کے بغیر اس گھر کے کسی مکین کا فقرہ مکمل نہ ہوتا تھا۔

''وہی کالی میم جس کے کپڑے تو پچھلے آدھے گھنٹے سے سی رہی ہے۔'' ماں پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر اس نے بے نیازی سے کہا اور پاؤں کے قریب دھرا گنا اٹھا لیا۔ کل ہی ساتھ والی خالہ فہمیدہ کے گھر گنے آئے تھے تو اس نے آدھا درجن صابرہ کی طرف بھجوا دیے تھے۔

''مر جانیئے۔ الماس! تو رضوی صاحب کی بی بی کو کلموہی کہہ رہی ہے؟'' اپنی بیٹی کی بدلحاظی سے وہ تنگ تھی اسی لیے سر پکڑ کر بولی۔ دوسرا خطاب جو الماس نے رضوی صاحب کی بیگم کو دیا تھا اس پر شاید ابھی صابرہ نے دھیان نہیں دیا تھا، ورنہ جوتی اٹھا کر اس کو دے ماری ہوتی، تب ہی دروازہ زور زور سے بجنے لگا تھا۔

''الماس دروازہ کھول، تیرا ابا آیا ہوگا۔ مل گئی ہوگی اب عیاشیوں سے فرصت۔''

مگر ابا کے ڈر کے باعث وہ فوراً اسے پیشتر دروازے کی جانب بڑھی۔

''مت لگایا کر کنڈا۔ بڑا خزانہ پڑا ہے گھر میں جو کوئی چرا کر لے جائے گا۔'' وہ عادتاً بڑبڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

''ابا! وہ مجھے بجار (بازار) سے وہ چابی والی گڈی لے دے، وہ چھیمو کے پاس بھی ہے نا!'' وہ ابا کے بیٹھتے ہی بول پڑی۔

''گھر آتے ہی نواب زادی کی فرمائشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ جا اندر جا کر مر۔''

جواب میں اس نے اتنی بری طرح پھنکارا کہ الماس کی بولتی بند ہو گئی۔ وہ فوراً سے پیشتر اندر بھاگ گئی۔

''نا اب تو مجھے کھانا دے گی یا بھوکا مارے گی؟ جب دیکھو، مشین اٹھا کر گھڑ گھڑ لگائی ہوتی ہے۔ کماتی ایک آنہ بھی نہیں ہے اور کرتی سارا وقت یہی ناٹک ہے۔'' اس کی گولیوں کی زد میں صابرہ بھی آ گئی تھی۔

''نہ تو جیسے بڑا کچھ اٹھا کر لے آتا ہے نا باہر سے۔ صرف مجھ غریب پر بولنا آتا ہے تجھے۔'' وہ تلملا کر بولی۔

''میرے آگے بک بک نہ کر۔'' وہ غصے سے چلایا۔ ''کتے کی طرح زبان چلتی ہے تیری۔ جلدی کھانا دے۔''

''کھانا میں کہاں سے لاؤں۔ جو کچھ تھا، وہ تو صبح اٹھا کر لے گیا تھا۔ اب ہمیں ہی بھوکا مارے گا۔'' وہ جواباً چیخی تھی۔

''ہاں، تم لوگ مرو بھوکے، مجھے پروا نہیں ہے۔ بھاڑ میں جاؤ تم......'' اس نے گالیاں بکتے ہوئے صابرہ کو دو ہاتھ دے دیے۔

وہ بے چاری چیختی چلاتی، روتی رہی اور رحیم بخش پھر بکتا جھکتا باہر چلا گیا تھا۔

اس کی جیب میں یقیناً کچھ تھا، ورنہ وہ باہر نہ جاتا۔

اس طرح کی لڑائیاں الماس کے گھر کا معمول تھیں۔ اسے ہمیشہ ان سے نفرت ہوتی تھی اور اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کے ماں باپ آرام سے پیار محبت سے رہیں مگر ایسا ممکن نہ تھا۔

اس روز وہ بڑے عرصے بعد قاعدہ کھول کر بیٹھی تھی، وجہ صبح استاد جی سے پڑنے والے تین تھپڑ تھے، جن کے باعث اس کے سر میں ابھی تک درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

اس سے کچھ بھی نہیں پڑھا جا رہا تھا مگر اماں کے ڈر سے وہ قاعدہ کھول کر خالی خالی نگاہوں سے حروف کو تکنے لگی۔ اسی اثناء میں دروازہ زور زور سے بجنے لگا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھی اور ابا کی آمد کا سوچتے ہوئے دروازہ کھول دیا مگر سامنے کا منظر اس کے حواس گم کرنے کو کافی تھی۔

☆☆☆

اس نے بڑے غور سے بلے کے کنارے کو چوم کر ہوا میں کئی فٹ اوپر بلند ہوتی گیند کو دیکھا مگر بیڑا غرق ہو نیوٹن کا اگر وہ کشش ثقل دریافت نہ کرتا تو اتنی اوپر اچھالی گئی گیند یوں تیزی سے نیچے کا سفر نہ کرتی۔ اسے اب ذینی پر غصہ آ رہا تھا جس نے اس سے ایک اوور کھیلنے پر اصرار کیا تھا (اور وہ پتہ نہیں کیسے مان گیا تھا) ذینی کے ساتھ ساتھ اسے سڑک کے دوسری جانب موجود گھر میں آنے والے نئے کرایہ داروں کے گملے پر غصہ چڑھنا شروع ہو گیا تھا جو

غالباً اسی گیند کے انتظار میں ان کی بالکونی پر سن باتھ لے رہا تھا۔

اس نے ایک چبھتی ہوئی تیز نگاہ ڈینیئل اور میری اینے پر ڈالی۔ نہ ڈینی اس کو میچ کھیلنے پر مجبور کرتا اور نہ میری اینے اوور کی پہلی گیند ہی اتنی شارٹ کراتی کہ وہ اتنی اونچی ہٹ لگا دیتا۔

اس نے گلوز اتارے، پیڈ کو اپنی ٹانگوں سے علیحدہ کر کے نہایت بے دردی سے زمین پر دے مارا اور بڑے آرام سے کچھ فاصلے پر پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اگر ان کے گھر سے کوئی آ گیا تو؟'' وکٹ کیپنگ کرتی انجی نے پریشانی سے کہا تو تمام بچوں کی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کرنے لگیں جو نہایت لاپروائی سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔

''اب کیا ہوگا؟'' ڈینی کے منہ سے نکلا۔

''فار گاڈ سیک۔ اگر کچھ ہو گیا تو ممی مجھے گھر میں گراؤنڈ کر دیں گی۔'' اب کے میری اینے بولی تھی۔

''اچھا بزدلو......! اندر جا کر چھپ جاؤ۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

اور واقعی وہ سب ایک دم ہی وہاں سے بھاگ نکلے۔ جب وہ جا چکے تو اس نے میز پر رکھی کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ابھی ہاتھ بڑھا ہی تھا کہ چیختی چنگھاڑتی ڈور بیل نے اسے ایک لمحے کو گڑبڑا کر رکھ دیا۔

وہ چند ثانیے سوچتا رہا پھر جی کڑا کر کے اٹھا اور دروازے پر جا کر آنے والی مصیبت کا استقبال کیا۔

سامنے کھڑی شخصیت کے ہاتھ میں ڈینی کی گیند دیکھ کر نہ تو اس کے حواس گم ہوئے نہ ہی اسے پسینہ آیا۔

''پلیز کم ان'' شائستگی سے کہتے ہوئے اس نے راستہ چھوڑ دیا۔

نووارد کے پیچھے چلتا ہوا وہ اندر لان تک آ گیا۔

''بال کس نے پھینکی تھی؟'' اسے اپنے مہمان کے لہجے کی شائستگی پر حیرانی ہوئی۔

''کون سی بال؟'' اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔

''یہ والی۔'' اس لحیم شحیم کالے بالوں اور کشادہ پیشانی والے آدمی نے ڈینی کی گیند اس کی بھوری آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

مگر اس وقت چونکہ باقی لوگ نو دو گیارہ ہو چکے تھے اور لان کا حلیہ بتا رہا تھا کہ یہاں بڑا زبردست کرکٹ میچ ہوتا رہا ہے اس لیے اس نے کمال ڈھٹائی سے اعتراف کیا۔

''میں نے مارا تھا یہ شاٹ، مگر بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ گیند اتنی اونچی نہیں گئی۔''

''اور مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس نے میرا گملا توڑ دیا ہے۔'' اس کا مہمان اپنے مخصوص آسٹریلین لب و لہجے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ جسے سمجھنے میں اسے خاصی دشواری ہو رہی تھی۔

''ہاں میں نے دیکھا تھا۔ اس بے چارے کی زندگی ہی اتنی تھی۔ آج میری گیند نہیں تو کل کو آپ کے بچے ہی توڑ ڈالتے۔''

وہ کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کتنی عمر ہے تمہاری؟''

''پندرہ سال اور چار ماہ۔'' وہ حساب میں اچھا تھا، جھٹ سے بولا۔

''کب سے کرکٹ کھیل رہے ہو؟''

''بارہ منٹ پہلے سے۔''

''نام کیا ہے تمہارا؟''

''فرسٹ نیم، مڈل نیم، سرنیم یا نک نیم؟''

''پورا نام۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''ریان عظیم حیدر۔ میرے دوست مجھے ریان کہتے ہیں مگر میری اپنے مجھے کبھی کبھی رونی کہہ دیتی ہے۔ ڈیڈ مجھے مسٹر فرازڈیا اور میری ٹیچرز مسٹر زبل سم کہتے ہیں۔''

''ماما کیا کہتی ہیں؟''

''مما؟ وہ مجھے اڈیٹ کہتی ہیں۔'' وہ مزے سے بولا۔

''میں کیا کہوں؟''

''آپ؟ آپ زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کرتے ہوئے مجھے ریان حیدر کہہ لیں۔'' وہ ابرو چڑھا کر بولا تو نو وارد ہنس دیا۔

''تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟''

''آرٹسٹ۔''

''تم کبھی کرکٹ ٹیم کے لیے اپلائی ضرور کرو۔ سلیکشن کمیٹی تمہیں ریجیکٹ نہیں کرے گی۔'' بڑا مخلصانہ مشورہ تھا۔

''آپ بھی کر دیں نا قومی ٹیم کے لیے اپلائی۔ سلیکشن کمیٹی آپ کو بھی ریجیکٹ نہیں کرے گی۔'' وہ اسی کے انداز سے بولا۔

''میں نے کیا تھا اپلائی۔'' وہ بتانے لگا۔

''پھر ریجیکٹ کیوں ہوئے؟'' وہ بے ساختہ ہی بیچ میں بول اٹھا تھا۔

''اوں......ہوں میں تو سلیکٹ ہو گیا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' ریان کو تمام معاملہ جان لینے میں دلچسپی سی محسوس ہو رہی تھی۔

''پھر۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''فی الحال میں اپنے ملک کی نیشنل ٹیم کا وائس کیپٹن ہوں۔''

جس وقت اس نے گیٹ کھولا تھا تو ایسے ہی ایک لمحے کو ذہن میں خیال کوندا تھا کہ اس آدمی کی شکل ڈینی کے کمرے میں لگے پوسٹر پر گرین اور یلو کٹ اور بیگی گرین کیپ پہنے کرکٹر سے ملتی جلتی ہے۔ اب اپنے خیال کی تصدیق پر اس کو سنبھلنے میں ایک لمحہ لگا تھا۔

''آپ کا نام تو اسٹیو ہے نا؟ اوہ میں نے پہچانا ہی نہیں۔''

جواب میں اسٹیو محض مسکرا دیا۔

''ڈیڈی آپ کا بہت بڑا فین ہے۔اور میری اپنے بھی۔''

''اور تم؟''

''میں تو اولیور کا ہن، لوئس فیگو اور زیڈان کا فین ہوں۔'' وہ شانے اچکا کر بولا۔ ''یہ کرکٹرز بڑے بورنگ ہوتے ہیں۔''

''کیوں؟'' اسٹیو حیران ہوا تھا۔

''کیوں کا کیا سوال؟ بس بورنگ ہوتے ہیں۔''

''یہ تمہارا گھر ہے۔'' اسٹیو نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میری خالہ کا ہے۔ میں تو چھٹیوں پر آیا ہوں۔''

''تم برٹش ہو؟''

''آپ کو کیسے پتہ؟'' اب کے ریان حیران ہوا تھا۔

''تمہارا لہجہ اور شکل برٹشرز والی ہے۔''

''میں نیوکاسل میں رہتا ہوں اسی لیے میرا لہجہ انگلش ہے ورنہ دراصل میں اسکاٹش، پاکستانی اور فرنچ مکس ہوں۔ میری دادی اسکاٹش تھی، دادا پاکستانی جبکہ مما فرنچ ہیں۔''

''نیوکاسل میں گھر ہے تمہارا؟'' اسٹیو کو اس تیز طرار حاضر جواب بچے میں بہت دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

''جی۔ مگر وہ میرے ڈیڈ کا سمر ہاؤس ہے۔ میرا اصل گھر کراچی میں ہے۔'' ریان کو ہر بات تفصیل سے بتانے کی عادت تھی۔

''کیا ہابیز ہیں تمہاری؟''

''ریڈنگ، فٹ بال اور پینٹنگ۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔

''اور؟'' فوراً سوال آیا تھا۔

''اور فرینڈز کے ساتھ انجوائے کرنا۔'' وہ اپنے سابقہ لہجے میں بولا۔

''کیا انجوائے کرنا؟''

اسے اب اتنے سوالوں پر اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔

''ظاہر ہے لائف انجوائے کرنا۔'' وہ اپنے لہجے کی اکتاہٹ چھپا نہ سکا تھا، نہ ہی چھپانے کی کوشش کی تھی۔

''لگتا ہے تمہارے فرینڈز کافی ڈرپوک ہیں۔'' وہ ارد گرد نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ ''اسی لیے بھاگ گئے۔''

''ہاں تو اچھا کیا نا انہوں نے۔ کم از کم فضول کی تفتیش سے ہی بچ گئے۔'' نہایت جلے بھنے انداز میں جواب ملا تھا۔

''ویسے میں بھی فرینڈز پر کسی زمانے میں بہت انحصار کرتا تھا۔ مگر بعد میں پتہ چلا یہ سب وقتی تعلقات ہوتے ہیں۔ مصیبت میں سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔''

''پتہ نہیں۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''ٹھیک ہے میں چلتا ہوں مگر اتنا یاد رکھنا کہ اگر کبھی کرکٹ کھیلنے کا ارادہ ہو تو میرے پاس ضرور آنا۔'' وہ گیند اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔''میں تمہیں سکھاؤں گا یہ گیم۔''

ریان نے جواب نہیں دیا اور اسٹیو کو جاتے دیکھنے لگا۔ اس کے پاس اس کی فضول باتوں کے جواب میں کہنے کو کچھ بھی نہ تھا یا شاید وہ جواب دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

اس کی نگاہیں رحیم بخش کے خون میں لت پت وجود سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ حیرت اور صدمے سے گنگ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی جس کی چارپائی محلے کے چند مردوں نے اٹھا رکھی تھی۔

اس کا باپ چھولے، چاول لینے کے لیے سڑک کے اس پار موجود ریڑھی کی جانب جاتے ہوئے ایک نشے میں دھت ٹرک ڈرائیور کی معمولی سی ''غلطی'' کا شکار ہو گیا تھا۔

اس کی اور اس کی ماں کی زندگی اس واقعے کے بعد بالکل اندھیر ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی تھیں۔

چندے کی رقم سے جب رحیم بخش کے کفن دفن کا انتظام ہوا تو صابرہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا، نہ ہی اس کے پاس کوئی نقدی تھی۔ چند روپے رحیم بخش کی جیب میں تھے، جو اس کے ایکسیڈنٹ کے بعد راہ گیروں نے اچک لیے تھے۔

چند روز تو کھانا ہمسائیوں کے یہاں سے آتا رہا۔ کچھ جاننے والوں نے اس کے ہاتھ پر جاتے وقت ترس کھا کر چند ایک نوٹ بھی رکھ دیے تھے سو ایک مہینہ تو ان کا گزارا چلتا رہا۔ رحیم بخش مر گیا تھا اور اس گھر سے زندگی کا سامان بھی جاتے سے لوٹ کر لے گیا تھا۔ صابرہ کا اس دنیا میں اب الماس کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ جو رشتے دار تھے وہ ان ہی جیسے غریب اور افلاس زدہ تھے۔ باقی بچے محلے والے تو وہ رحیم بخش کے وصال سے لے کر ایک مہینے تک ان کی ہر ممکن مدد کر رہے تھے۔ اب کوئی کسی کے لیے کتنا کر سکتا تھا۔

دکھ، بے یقینی اور صدمے سے بھرا وہ پورا مہینہ گزر گیا تو صابرہ کو کچھ ہوش آیا۔ مرنے والوں کے ساتھ مر نہیں جاتے، وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کا واحد سہارا اس کی بیٹی تھی۔ اس کو اب اپنی اکلوتی اور معصوم بچی کو اس سفاک دنیا سے بچانا تھا۔

الماس کا نام سکول سے کٹ گیا تھا اگر نہ بھی کٹتا تو بھی صابرہ کے پاس اس کو مزید پڑھانے کے لیے رقم نہ تھی۔ اس کے پاس تو فی الحال سلائی کا کوئی کام بھی نہ تھا۔ محلے کی عورتوں نے شاید اس کی غم زدہ کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو سینے کے لیے کوئی کام نہ دیا تھا۔

اپنی زبوں حالی اور ممکنہ فاقوں سے بچنے کے لیے صابرہ نے محلے کی عورتوں سے کام مانگنا شروع کر دیا۔ کچھ عورتوں نے اسے سلائی کے کپڑے دینے شروع کر دیے البتہ چند ایک عورتیں (بشمول رضوی صاحب کی بیگم نے) اس کو سہاگ اجڑی اور بیوہ کہہ کر کام دینے سے انکار کر دیا مبادا ایک بیوہ عورت کے سلے ہوئے کپڑے پہن کر ان کے

ہنستے بستے گھر کو بھی کسی کی نظر لگ جائے۔
صابرہ کے لیے یہ صورت حال نہایت تکلیف دہ تھی مگر اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے اس نے صبر کیا تھا۔

☆☆☆

''اماں! مجھے بھوک لگی ہے۔'' الماس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔
''میں کہاں سے لاؤں کھانا؟'' وہ بے بسی سے رو پڑی تھی۔ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ہمسائیوں سے پہلے ہی اتنا مانگ چکے تھے کہ انہوں نے اور کچھ نہیں دینا تھا۔ کسی کے کپڑے بھی سینے والے نہیں تھے۔ پچھلے دو دن سے دونوں نے کچھ نہیں کھایا تھا، خالی پیٹ تو وہ بھی تھی مگر بیٹی کی بگڑتی حالت دیکھ کر وہ اپنے فاقے بھول گئی تھی۔
''اماں! کہیں سے لا دے۔'' بارہ سالہ الماس نے بے چارگی سے کہا۔
''اچھا، ٹھہر میں بلقیس سے پتا کرتی ہوں۔'' اماں کو محلے کے اس واحد گھر کا خیال آیا جن کا قرضہ انہیں نہیں چکانا تھا۔
وہ بھاگتی ہوئی ننگے پاؤں ہی ان کے گھر گئی اور بلقیس سے منت کی کہ وہ اسے کچھ کھانے کو دے دے۔
بلقیس خود بھی اسی کی طرح غریب تھی مگر پھر بھی اسے صابرہ کی حالت پر اتنا ترس آیا کہ اس نے گھر میں پکی دال کی ایک پلیٹ اس کو نکال کر دے دی۔ ساتھ ہی دو روٹیاں بھی تھما دیں۔
بھاگم بھاگ گھر پہنچی اور الماس کے منہ میں لقمے ڈالے مگر مسلسل فاقے سے الماس کی حالت بے حد بگڑ چکی تھی۔ وہ جو کھاتی، باہر نکال دیتی اور اس بات نے صابرہ کے حواس مختل کر دیے۔ وہ دال کی پلیٹ وہیں چھوڑ کر ہمسائیوں میں گئی اور فہمیدہ سے منت سماجت کی کہ وہ اپنے بیٹے کو اس کے ساتھ بھیج دے تاکہ وہ الماس کو ہسپتال لے جائے مگر فہمیدہ کا بیٹا خود کام پر گیا ہوا تھا۔
صابرہ واپس آئی تو الماس بے ہوش ہونے کے قریب تھی اس نے بالآخر خود ہی ہمت کی اور اسے اٹھا کر باہر لے آئی۔
محلے کا ایک رکشہ والا بڑی مشکلوں سے ہسپتال جانے پر راضی ہوا اور تقریباً پینتالیس منٹ بعد ایک خیراتی ہسپتال کے آگے جب دونوں ماں بیٹی کو چھوڑا تو الماس نیم جاں ہو چکی تھی۔
ڈیوٹی پر موجود کوئی ڈاکٹر اتنا فارغ نہ تھا کہ اسے دیکھتا۔ وہ اپنی تڑپتی ہوئی بیٹی کو لے کر زمین پر بیٹھی نم آنکھوں سے ہسپتالوں کے عملے کے حضور گڑگڑا رہی تھی۔
''میری بچی کو دیکھ لو۔ تمہیں خدا کا واسطہ اسے دیکھ لو، نہیں تو یہ مر جائے گی۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
''معاف کرو مائی، تنگ مت کرو۔'' ریسپشنسٹ تنگ آ کر بولی ''باری آنے پر ڈاکٹر صاحب دیکھیں گے۔''
وہ اپنی بیٹی کی حالت دیکھ کر رونے لگی۔
تب ہی ہسپتال کی مین انٹرنس کا دروازہ کھول کر ایک لڑکی اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے اپنے سیاہ بالوں کو کیچر میں باندھ رکھا تھا۔ اور نہایت وقار سے چلتی ہوئی ریسپشن کی جانب آئی تھی۔ جب دفعتاً اس کی نگاہ ایک کونے

میں روتی ہوئی صابرہ پر پڑی۔

''یہ عورت کیوں رو رہی ہے؟'' اس نے اچنبھے سے ریسپشنسٹ سے پوچھا تو وہ بے اختیار نگاہیں چرا گیا۔

''میم! وہ اس کی بیٹی کی حالت بگڑ رہی ہے۔''

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا، پھر صورت حال سمجھتے ہوئے بولی ''جاؤ اور فوراً کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔''

''بی بی! کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے روتی ہوئی صابرہ سے پوچھا۔

''میری بچی مر رہی ہے، کوئی ڈاکٹر دیکھتا ہی نہیں ہے۔ میں کیا کروں؟''

''فکر نہیں کرو بی بی! میں نے ڈاکٹر کو بلوایا ہے یہ میرے شوہر کا ہسپتال ہے۔'' صابرہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہاں تمہاری بچی کا بہتر علاج ہو جائے گا'' وہ کہہ رہی تھی جب ہی ایک ڈاکٹر وہاں پہنچ گیا۔

''یس میڈم! آپ نے بلایا؟'' وہ مودب لہجے میں پوچھنے لگا۔

''جی یہ بچی ہے، اس کو فوراً دیکھیں اور مجھے اس سلسلے میں کوئی شکایت نہیں ملنی چاہیے۔ آل رائٹ؟'' وہ قدرے رعب سے بولی تو ڈاکٹر نے فوراً سر ہلا دیا۔

''آپ فکر نہ کریں مسز عظیم! میں خود اس کیس کو دیکھتا ہوں۔''

الماس نے بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے اس خوش شکل عورت کو دیکھا جو کہیں سے بھی بیس سے اوپر کی نہیں لگتی تھی۔

یہ اس کی رانیہ عظیم وقار سے پہلی ملاقات تھی۔

☆☆☆

''میں اندر آسکتی ہوں؟'' آواز پر صابرہ نے چونک کر دروازے میں کھڑی اس مہربان عورت کی جانب دیکھا، جس کے باعث اس کی بیٹی کی جان بمشکل بچ پائی تھی۔

''آ...... آؤ بی بی جی!'' وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی، اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے لیے راستے میں پلکیں بلکہ اپنا آپ ہی بچھا دیتی۔

وہ نہایت ستائش سے اس دراز قد متناسب جسم اور خوب صورت تیکھے نقوش والی عورت کو دیکھ رہی تھی۔

رانیہ اندر آ گئی اور بغیر کسی تکلف کے الماس کے بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ کر اس کا حال احوال دریافت کرنے لگی۔

''بیٹا! کیا حال ہے آپ کا؟ ٹھیک ہو نا؟''

الماس نے اس کی بادامی، بھوری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔

''کوئی پرابلم تو نہیں ہے ادھر؟ اگر ہے تو بتا دو۔'' وہ اپنے مشفق انداز میں اس سے مخاطب تھی۔

الماس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

رانیہ، صابرہ کی جانب مڑی ''کیا نام ہے بچی کا؟''

''وہ جی الماس خاتون جی!'' صابرہ نے فوراً نام بتایا۔

''ویسے اچھا نام ہے آپ کا۔'' وہ مسکراتے ہوئے الماس سے کہہ رہی تھی اور اس کے لیے تو حیرت کا مقام یہ تھا کہ زندگی میں پہلی بار اسے کسی نے آپ کہا تھا ورنہ ابا، اماں اور پھپھو وغیرہ تو بس تو سے ہی کام چلاتے تھے۔

''بی بی جی!'' صابرہ نے موقع دیکھ کر بات کا آغاز کیا۔

''مجھے جی کسی کام پر لگا دو۔ میں درزن ہوں جی، کپڑے سی لیتی ہوں۔'' وہ خوشامدی لہجے میں بولی تو الماس کو ماں کا یہ انداز اچھا نہیں لگا۔

''درزن ہو؟ اچھا۔'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔''ویسے مجھے درزن کی ضرورت تو نہیں ہے مگر ایک دو بیڈ شیٹ وغیرہ سلوانا تھی، سی سکتی ہو؟''

''جی وہ کیا سلوانے ہیں؟''

''بیڈ شیٹس۔ میرا مطلب ہے بستر کی چادریں اور......اور لحاف وغیرہ۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''جی، جی میں سی لیتی ہوں جی!''

''چلو پھر ٹھیک ہے، آپ میرے گھر آ جانا، یہ کارڈ رکھ لیں۔ اس پر گھر کا ایڈریس پتہ ہے۔''

''جی میں آ جاؤں گی جی!'' صابرہ نے جلدی سے کارڈ پکڑ لیا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

☆☆☆

رانیہ کی ماں فرنچ تھی، باپ جرمن اور شوہر پاکستانی۔ وہ رومن کیتھولک پیدا ہوئی تھی، مگر زندگی میں کبھی چرچ نہیں گئی سوائے کرسمس اور دیگر تہوار کے۔

وہ ہمیشہ سے کنزرویٹو رہی تھی کبھی حدود کراس نہیں کیں۔ زندگی میں صحیح معنوں میں صرف ایک ہی شخص سے دوستی کی اور پھر اس کا مذہب قبول کر کے شادی بھی کر لی۔

اس نے مذہب صرف شادی کے لیے بدلا تھا مگر حقیقی مطالعہ بعد میں کیا، اور اپنے پہلے بیٹے کی پیدائش کے چند ہفتوں بعد تک وہ دل سے مسلمان ہو چکی تھی۔

رانیہ کے چار بچے تھے، پانچویں بیٹی گود لی تھی۔ اس کے دیور نے اتفاق سے اسی کے خاندان کی لڑکی سے شادی کی تھی جس سے رانیہ کا تعلق تھا مگر فرق یہ تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہوئی اور شادی کے تین سال بعد ایک بیٹی چھوڑ کر اپنے شوہر کے ہمراہ ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئی۔

وہ بیٹی بعد میں اس کے تایا، تائی یعنی رانیہ اور عظیم نے گود لے لی تھی۔

رانیہ اور عظیم پانچ برس پہلے پاکستان شفٹ ہوئے تھے مگر بڑے بچے پڑھائی کی غرض سے باہر ہی تھے۔ بڑا بیٹا علی امریکہ میں پڑھتا تھا، وہ انتہائی خود غرض اور سیلف سینٹرڈ قسم کا انسان واقع ہوا تھا اس سے چھوٹا ریان اپنی ''ضد'' کے باعث انگلینڈ میں تھا۔

ریان، رانیہ کے تمام بچوں سے مختلف تھا۔ وہ کبھی اپنی فیملی سے اٹیچڈ نہیں رہا تھا اسی لیے اسے فیملی کی قدر و قیمت کا احساس نہیں تھا۔

اس کے نزدیک صرف اس کے دوست اہم تھے، اس کے دوست بیک وقت اس کے کزنز بھی تھے۔ اس بات سے بے پروا ہو کر ان کے اور اس کے درمیان "مذہب" کی دیوار حائل ہے وہ صرف اور صرف ان ہی سے تعلق رکھتا تھا۔
ریان کی خالہ کی بیٹی انجلینا اپنے پیرنٹس کے ہمراہ تین سال پہلے نیو کاسل شفٹ ہوگئی تو ریان نے بھی وہیں انگلینڈ شفٹ ہونے کی بات کی، ویسے بھی باقی دوست بھی ادھر ہی جا رہے تھے۔
عظیم ظاہر ہے کہ اپنا بنا بنایا کاروبار اپنے بیٹے کی احمقانہ ضد کے باعث چھوڑ نہیں سکتے تھے اسی لیے اس کی بات نہ مانی گئی مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا، اس نے منوا کر ہی چھوڑا اور خود ہی وہیں رہنے پر بالآخر اپنے باپ کو راضی کر ہی لیا۔ رانیہ اس بات سے ناخوش تھی مگر بیٹے کی ضد کے آگے وہ کیا کر سکتی تھی؟
ریان نے بات نہ مانی جانے پر ماں باپ کو کٹہرے میں لا کر اپنا اور علی کا موازنہ شروع کر دیا تھا۔
اس نے ان سے پوچھا تھا کہ علی کو کیوں امریکہ بھیجا گیا، اس سے تین گناہ زیادہ جیب خرچ کیوں اسے ہر ماہ ملتا ہے اور یہ کہ اسے ہر بات میں علی سے کمتر کیوں رکھا گیا ہے؟
ریان اور علی میں بہت فرق تھا۔ ریان کو خود ہی اپنے طور پر انگلینڈ میں رہنے کی اجازت مل گئی، پاکٹ منی بھی بڑھا دی گئی اور اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے قریب رہے۔
باپ سے تو نہیں، البتہ ماں سے اسے ہمیشہ یہ شکایت رہی تھی کہ اس کو اپنی ماں کے دودھ سے محروم رکھا گیا تھا۔
یہ بات سچ تھی۔ ریان کی پیدائش کے دو ماہ بعد ہی رانیہ بیمار ہوگئی تھی اور پھر بیماری نے دو سال تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس دوران ریان کو اس کی چچی نے فیڈنگ کرائی تھی اور اس لحاظ سے وہ انیہ (رانیہ کے دیور کی بیٹی) کا رضاعی بھائی بھی تھا۔
بس ایک ہی کمپلیکس تھا جو اس کے دل میں بری طرح جڑ پکڑے بیٹھا تھا، باقی ہر لحاظ سے اس کی زندگی مطمئن تھی۔
طوفانوں کے آنے سے پہلے زندگیاں ہمیشہ مطمئن ہی ہوا کرتی ہیں۔

☆☆☆

وہ گھر نہیں، ایک وسیع عریض محل تھا۔ سفید گیٹ کے پیچھے سفید پتھروں کا خوب صورت سا ڈرائیو وے بنا تھا جبکہ دونوں اطراف میں بڑا سا لان تھا۔ صابرہ نے گیٹ کو زور سے بجایا۔ گیٹ بجانے کے قریباً پندرہ سیکنڈ بعد ہی ایک جھٹکے سے گیٹ کھلا اور ایک گن مین نمودار ہوا۔ اس کے کاندھے پر لٹکی بندوق نے الماس کو کچھ خوف زدہ کر دیا تھا۔
"کیا بات ہے بی بی؟" وہ کرخت لہجے میں پوچھنے لگا۔
"وہ بھائی صاحب! یہ رانیہ بی بی کا گھر ہے؟" صابرہ کچھ مرعوب، کچھ خوفزدہ ہو کر بولی۔
"ہاں کیا کام ہے؟"
"وہ جی ہمیں بی بی نے بلایا تھا۔ چادریں سلوانی تھیں۔"
"رانیہ بی بی نے؟"

''جی۔'' وہ فوراً بولی۔

''اچھا اندر آ جاؤ میں بی بی سے پوچھتا ہوں۔''

وہ دونوں اس کے پیچھے اندر آ گئیں۔ وہ دونوں کو لان میں گھاس پر بٹھا کر اندر چلا گیا۔

رانیہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس، پاؤں میں سلیپرز ڈالے باہر آئی تھی۔

''ارے صابرہ آ گئیں؟'' وہ ایک مدھم، شفیق مسکراہٹ کے ساتھ بولی ''گھر آسانی سے مل گیا تھا نا؟''

''جی بی بی!'' صابرہ اسے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی تھی۔

''اور بچی کیسی ہے تمہاری؟'' اس نے الماس کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

الماس کو ہسپتال سے گھر آئے آج پانچواں دن تھا اور وہ تقریباً ٹھیک ہو چکی تھی۔

''بھلی چنگی ہے، جی۔''

''اچھا تم اندر آ جاؤ۔'' وہ اندر کی جانب بڑھی تو صابرہ اور الماس نے بھی اس کی تقلید کی۔

اندر سے وہ گھر اور بھی زیادہ خوب صورتی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ رانیہ ان دونوں کو ایک قیمتی اشیاء سے سجے ہوئے لاؤنج میں لے گئی۔

اسی اثناء میں ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی، ہاتھ میں کارڈلیس فون اٹھائے ان کی طرف آئی۔

الماس نے اتنی خوب صورت لڑکی آج تک نہیں دیکھی تھی، ویسے تو اس نے زندگی میں جتنی بھی لڑکیاں دیکھی تھیں ان میں سے کوئی بھی لڑکی اتنی خوب صورت نہ ہوگی جتنی وہ دونوں خصوصاً انیہ تھی الماس ابھی تک ان کو بہنیں سمجھ رہی تھی۔

''بی بی جی!'' اعتماد کی کمی کے باوجود اس نے رانیہ کے دوستانہ رویے کے سبب پوچھ لیا۔ ''آپ دونوں بہنیں ہو؟''

رانیہ اور انیہ نے ایک لمحے کو ایک دوسرے کو دیکھا۔

''نہیں۔ میں اس کی ماں ہوں۔'' رانیہ مسکرا کر بولی تو الماس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ رانیہ خود بمشکل بیس برس کی دکھتی تھی جبکہ انیہ کم سے کم پندرہ سال کی ہوگی۔ بھلا وہ دونوں ماں بیٹی کس طرح ہو سکتی تھیں؟

''مگر لگتا تو نہیں۔'' وہ بمشکل بولی۔

''عظیم کو بتانا ضرور!'' وہ فوراً انیہ سے مخاطب ہو کر بولی۔

''میں کہوں گی ڈیڈ! وہ لڑکی مما کو کہہ رہی تھی آپ انیہ کی ماں نہیں نانی لگتی ہو۔'' وہ بے ساختہ ہنس رہی تھی۔

''ایڈیٹ۔'' رانیہ نے کشن اٹھا کر اس کے سر پر مارا۔

الماس اب دیوار پر ٹنگی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ انیہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں اس فریم کو دیکھا تو الماس نے فوراً پوچھا ''بی بی جی! یہ کون ہے؟''

''یہ، یہ لڑکی میری امی ہیں اور یہ میرے ابو ہیں۔'' انیہ نہایت عام سے انداز سے بتانے لگی۔

الماس نے حیرت سے انیہ کو دیکھا۔ ابھی وہ کہہ رہی تھی کہ رانیہ اس کی ماں ہے، اب وہ کہہ رہی ہے کہ تصویر والی لڑکی اس کی ماں ہے۔

''مگر بی بی! تمہاری امی تو رانیہ بی بی ہیں؟''

''ہاں یہ میری مما ہیں، وہ میری ممی ہیں۔'' انیہ مختصراً بولی

الماس نے دوبارہ کچھ نہ پوچھا۔ اس کو یقین ہو چکا تھا کہ انیہ کا دماغ خراب ہے۔

''اور یہ کون ہے؟'' وہ ایک دوسری تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگی جس میں انیہ کے ہمراہ ایک لڑکا تھا۔ اس نے بازو انیہ کے کندھوں کے گرد پھیلایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں رانیہ کی شہد رنگ آنکھوں سے مشابہت رکھتی تھیں۔

''یہ میرا دوسرے نمبر کا بیٹا ہے۔'' اب کے رانیہ بولی تھی۔ ''ریان'' جس صوفے پر الماس بیٹھی تھی اس کے ساتھ چھوٹی سی سائیڈ ٹیبل پر رکھی تصویر کی جانب اشارہ کر کے رانیہ بتانے لگی۔

''یہ میرا بڑا بیٹا ہے علی اور اس کے ساتھ ریان ہے۔ یہ لڑکی میری بیٹی ہے ربیعہ اور یہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا بشیم ہے۔''

الماس اب تصویر کر بغور دیکھ رہی تھی۔ رانیہ کا بڑا بیٹا قریباً سولہ سترہ برس کا تھا جبکہ دوسرے نمبر والا انیہ کا ہم عمر تھا۔ دوسرے نمبر والا شکل میں اچھا تھا مگر بڑا والا انتہائی خوب صورت، ڈشنگ اور بے حد پرکشش تھا۔ اس کی شکل دیوار پر ٹنگے فریم میں موجود انیہ کے ''ابو'' سے بہت ملتی تھی۔

بٹلر الماس کے لیے اورنج جوس، وائن گلاس میں ڈال کر لے آیا مگر الماس کو معلوم نہ تھا کہ گلاس کو کیسے پکڑتے ہیں۔ اس نے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اس بڑے سے گلاس کو تھاما۔ گھونٹ بھرنے کی ناکام کوشش میں وہ جوس اپنے کپڑوں پر گرا بیٹھی جبکہ گلاس قالین پر گر گیا۔

☆☆☆

''ڈیم اٹ۔'' اس نے زور سے دیوار کو ٹھوکر ماری۔

''اس طرح کک مارنے سے فیونا کا کچھ نہیں بگڑے گا، البتہ تم ہاسپٹل پہنچ جاؤ گے۔'' میری ایئنے نے اسے دھمکاتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک دفعہ پھر دیوار پر غصہ نکالتے ہوئے اسے ٹھڈا مارا مگر میری ایئنے کی پیش گوئی حقیقت کا روپ ڈھلنے کے قریب پا کر...... دوبارہ اپنا دکھتا ہوا پاؤں دیوار پر مارنے کی غلطی نہ دہرانے کا عزم کیا اور خالی بینچ پر بیٹھ گیا۔

''تم یوں منہ لٹکا کر بیٹھے ہوئے بالکل اچھے نہیں لگتے ایسا لگتا ہے یرقان ہو گیا ہے۔'' میری ایئنے کی بات پر اس نے پہلے تو گھور کر اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر بولا۔

''میرا دل کر رہا ہے کہ میں اس کا خون پی جاؤں۔''

''مجھے معلوم ہے کہ تم ویمپائر ہو، مگر فیونا پر حملہ نہ کر کے یہ راز مجھ تک ہی رہنے دو تو بہتر ہے۔''

''دیکھو میری ایئنے!''

''کیا دیکھوں؟ تمہاری شکل؟ سوری، مجھے کارٹون نہیں پسند۔'' وہ نخریلے انداز میں بولی۔

''پہلے صرف فیونا پر غصہ تھا اب دل کر رہا ہے تم دونوں کو قبر میں اتار دوں۔'' وہ جل بھن کر بولا۔

''لیکن ریان!'' میری اینے معصومیت سے پوچھنے لگی۔

''قبر میں آکسیجن سسٹم ہوگا؟''

''نہیں۔'' وہ چیخ کر بولا۔

''پھر تمہیں سزائے موت ہو جائے گی۔ اگر تمہیں مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو دریا میں چھلانگ لگا لو۔ درد تو نہیں ہوگا نا!'' وہ ہمدردی سے بولی۔

''تمہیں ساتھ لے کر چھلانگ ماروں گا۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

''مجھے نہیں لائف جیکٹ کو۔'' اپنے تئیں میری اینے نے تصحیح کی تھی۔

''اس چڑیل کی اتنی ہمت کہ وہ مجھ سے پنگا لے؟'' وہ غصے سے بڑبڑا رہا تھا۔

''واٹ، تم سے کسی چڑیل نے بھی پنگا لیا ہے؟ مجھے بتایا کیوں نہیں؟ کیسی تھی وہ چڑیل؟ تمہارے جیسی خوف ناک شکل کی تھی یا پھر......؟''

جواباً ریان نے اسے خفگی سے بھرپور نگاہوں سے گھورا اور چہرہ پھیر لیا۔

''اچھا، سمجھ گئی تم فیونا پر غصے ہو۔'' اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بہت بڑی دریافت کر لی ہو۔ محض یوریکا کہنے کی کسر تھی۔

''میں اسے سبق سکھانا چاہتا ہوں۔'' وہ تنفر سے بولا۔

''اس کا خون پینے، سر پھوڑنے، قبر میں اتارنے اور قتل کرنے کے علاوہ اگر کوئی اور پلان تمہارے زرخیز ذہن میں بن رہا ہو تو براہ مہربانی مجھے آگاہی سے محروم نہ رکھو۔''

میری اینے کا معصوم اور ملتجی انداز تھا جس پر ریان بے اختیار ہنس دیا تھا۔

''اب بتاؤ کیا کرنا ہے۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں گویا ہوا۔

''کرنا کیا ہے۔ ہمارے گینگ کا برین کہاں ہے؟'' میری اینے کا اشارہ اینجی کی جانب تھا۔

''برین اس وقت فیول بھر وا رہا ہوگا۔ کینٹین پر۔'' سب جانتے تھے کہ انجلینا کتنا کھاتی تھی۔

''پھر چلو۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

دو روز پہلے ہونے والے میتھس کے ٹیسٹ میں فیونا ہڈسن ان کی کلاس میٹ نے ریان کے پیپر سے نقل ماری تھی۔ ریان نے ایک سوال غلط کر دیا تھا۔ نتیجتاً فیونا کے پیپر میں بھی وہی غلطیاں پروفیسر والٹر کی نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکیں اور انہوں نے ریان پر نقل کا الزام لگا کر اسے خوب ڈانٹ پلائی جبکہ فیونا اپنی معصوم شکل وصورت کے باعث بچ گئی۔ ٹیچرز کی رائے ریان کے متعلق بری نہیں تھی مگر وہ اکثر حلقوں میں ''مسٹر ٹربل سم'' کے نام سے مشہور تھا۔ اس وقت بھی مسٹر ٹربل سم کے دماغ کی پھرکی اس بے عزتی پر گھومی ہوئی تھی۔ اس کو ٹھنڈا کرنے کے بعد میری

اپنے اسے لے کر کینٹین پر آ گئی جہاں اپنی مخصوص ٹیبل پر بیٹھ کر انجلینا بھاپ میں پکے آلو کھا رہی تھی۔

''ڈینی کہاں ہے؟'' ریان گمشدہ پیس کے متعلق پوچھنے لگا۔

''ساتویں آسمان پر۔'' اینجی بے ساختہ بولی۔

''ہیں؟'' میری اینے چلائی۔ ''وہ گزر گیا؟''

دھپ کر کے کیمسٹری کی ضخیم کتاب میری اینے کے سر پر لگی تھی۔

''ہاں، ہاں، گزر گیا ہوں میں۔'' نروٹھے لہجے میں کہتا ڈینی کرسی پر آن بیٹھا۔ ''تم تو خوش ہو جاؤ گی نا میرے مرنے پر۔''

''صرف خوش؟ زبردست ٹریٹ دوں گی۔''

''اس کے لیے پیسے مجھ سے ادھار لے لینا۔'' اینجی نے ٹکڑا لگایا۔

''مستقبل کی آرتھوپیڈک سرجن کو ادھار مانگنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ فخریہ انداز سے بولی۔ میری اینے کو بچپن سے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔

ریان نے یاد دلایا ''اگر تم لوگوں کا بکواس سے دل بھر گیا ہے تو ذرا میرے مسئلے پر بھی غور کر لو۔''

اس نے مختصراً ساری بات ان دونوں کے گوش گزار کر دی۔ بلکہ ساری بات کہاں، وہ دونوں ریان کے بے عزتی پیریڈ کے وقت موقع پر موجود ہی تھے۔ اسی لیے میری اینے نے انہیں ریان کے جذبات سے آگاہ کر دیا۔

''اب اینجی! بتاؤ ذرا کوئی حل۔''

''گارلک پزا کا کلر کیسا ہوتا ہے؟'' اینجی کچھ سوچتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''تمہیں گارلک پزا کا خیال کیوں آ رہا ہے؟'' ریان حیران ہوا تھا۔

''پتا نہیں۔ مگر کھائے اتنا عرصہ گزر گیا ہے کہ مجھے تو پزا کی شکل ہی بھول گئی ہے۔''

''میں تمہیں پزا کھلا دوں گا۔ مگر کوئی حل سوچو۔'' ریان اس کا مطلب سمجھ کر فوراً بولا۔

''حل؟ ہاں بھئی، سوچتی ہوں۔'' وہ کہنے لگی ''ویسے ریان! تمہیں لزانیہ کی خوشبو یاد ہے؟''

''میں تمہیں لزانیہ بھی کھلا دوں گا۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

''پھر تو مسئلہ ہی کوئی نہیں۔'' اینجی کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا تھا۔ ''ذرا کان ادھر لاؤ۔''

تقریباً پانچ منٹ کی کانا پھوسی کے بعد میری اینے نے سر جھٹک کر کہا۔ ''امپاسبل۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو ہم چاروں ایکسپیل ہو جائیں گے۔'' وہ بخوبی جانتی تھی کہ بینن میئر ہائی سکول کے اصول کتنے سخت تھے۔

''ہم سکول میں کچھ نہیں کریں گے۔'' ڈینی بولا۔ ''ہم اس کے گھر میں یہ تمام کام کریں گے۔''

''نہیں۔'' میری اینے نے سر نفی میں ہلایا۔ ''چھوڑ دو فیونا کا پیچھا۔'' وہ اب دلائل دے کر باقی گروپ کو سمجھانے لگی مگر ریان کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

''ریان!'' میری اینے نے ہاتھ اس کے آگے لہرایا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''میں سوچ رہا ہوں کہ گھر میں کرنا زیادہ بہتر ہے اور جہاں تک بات ہے فیونا کا پیچھا چھوڑنے کی، تو اپنے سے پنگا لینے والوں کو میں چھوڑتا نہیں ہوں۔''

☆☆☆

فیونا کا گھر ''نائن اینڈ ویز'' کاؤنٹی میں واقع تھا جو ریان کی کاؤنٹی گیٹ شیڈ سے زیادہ دور نہ تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ کی ڈرائیو تھی۔

ریان گیٹ شیڈ میں رہائش پذیر تھا جبکہ میری اینے، انجلینا اور ڈینئل فینہم میں رہتے تھے۔ طے پایا تھا کہ تمام لوگ ریان کے گھر جمع ہوں گے اور پھر آنٹ فلورل سے نگاہ بچا کر کھسک جائیں گے۔ آنٹ فلورل، جو ریان، اینجی اور ڈینی کی خالہ جبکہ میری اینے کی پھپھو لگتی تھی، پی ایچ ڈی کرنے کے لیے نیو کاسل میں رہائش پذیر تھی۔ اس کی سخت طبیعت کے باعث تمام بچے اس سے ڈرتے اور رعب میں رہتے تھے۔

اس رات، جب فلورل سونے لگی تھی، تو وہ چاروں فلورل کی بلیو سوک میں نائن اینڈ ویز کی دسویں اسٹریٹ کی جانب گامزن ہو گئے۔ ڈرائیونگ لائسنس نہ ہونے کے باوجود بھی سولہ سالہ ریان گاڑی چلا رہا تھا۔ بیک سیٹ پر اینجی اور ڈینی کے درمیان ایک چھوٹی سی بالٹی رکھی تھی جبکہ میری اینے کی گود میں ایک پلاسٹک بیگ کے اندر چار برش اور گلوز کے چار جوڑے رکھے تھے۔

''ریان! تمہیں ڈر نہیں لگ رہا؟'' اینجی کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''ڈر کیسا؟'' وہ لاپروائی سے ہنسا۔ ''یہی تھرل اور ڈینجر تو لائف ہے۔ ایک دانشور نے کہا تھا، رسک سیفٹی سے بہتر ہوتا ہے۔''

''لیکن اگر ہم پکڑے گئے تو؟'' ڈینی بھی اندر ہی اندر کسی نامعلوم خوف کا شکار تھا۔

ریان نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ ''بہرحال جس جس نے اترنا ہے فوراً اتر جائے۔ میں بزدلوں کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔''

''گاڑی چلاؤ ریان!'' اینجی کچھ اعتماد سے بولی۔ ''فی الحال کوئی نہیں اتر رہا اور نہ ہی کوئی اترے گا۔''

''ہم ہمیشہ تمہارے ساتھ تھے، ہیں اور رہیں گے۔'' ڈینی نے کہا ''میرا مقصد محض نتائج سے آگاہی تھا۔''

''ریان گاڑی چلاؤ۔'' میری اینے نے سنجیدگی سے کہا۔ ریان نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

☆☆☆

اس نے ایک خوف زدہ نگاہ قالین پر گرے گلاس پر ڈالی اور ڈرتے ڈرتے رانیہ اور انیہ کی جانب دیکھا۔ ایک ہی لمحے میں الماس نے آنے والے حالات کا تصور کر لیا تھا۔ اس کو اور صابرہ کو اس بدتمیزی کے نتیجے میں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا جائے گا۔

اس کے لب کپکپا رہے تھے اور پورا جسم لرز رہا تھا۔

''پیچ بیٹا! دھیان سے پکڑتے ہیں نا۔ انیہ جاؤ اسے کسی چھوٹے گلاس میں جوس ڈال دو اور بٹلر کو کہو کہ قالین

آ کر صاف کرے'' رانیہ کا لہجہ اتنا میٹھا تھا کہ الماس کو کسی خواب کا گمان ہونے لگا۔ وہ انیہ، جو اس کے خیال میں کافی مغرور اور اکھڑ مزاج تھی، آرام سے اٹھی، قالین پر گرا گلاس اٹھایا اور کچن کی جانب چل پڑی۔

''بی بی جی! وہ غ...... غلطی ہوگئی میں۔'' وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں معافی مانگنے کی کوشش کرنے لگی۔

''ارے بیٹا! کوئی بات نہیں۔ آپ ڈر کیوں رہے ہو؟ ابھی وہ آپ کو اور جوس لا دیتی ہے۔ وہ پی لینا ٹھیک؟'' وہ پیار سے کہہ رہی تھی۔

الماس کو وہ عورت بہت اچھی لگی تھی۔ اس نے الماس کو نیچے بیٹھنے کو کہنے کے بجائے صوفے پر بٹھایا تھا۔ اس بات سے بے پروا کہ میلے کپڑوں اور گندے جوتوں والی بچی اس کا لائٹ گرے صوفہ خراب کرے گی۔ کوئی اتنا اچھا بھی ہو سکتا ہے الماس نے تو سوچا بھی نہ تھا۔

جب دوپہر کو کھانے کا وقت ہوا تو صابرہ نے اسی کمرے میں جبکہ الماس نے رانیہ اور انیہ کے ساتھ ڈائننگ ہال میں کھانا تناول کیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر موجود کسی چیز سے بھی تیرہ سالہ الماس واقفیت نہیں رکھتی تھی۔

چمچہ یا فورک کو استعمال میں لائے بغیر وہ اپنے میلے ہاتھوں سے ہی چاول کھانے لگی۔ چاول ختم کر کے اس نے ''بیف چلی کینین...... اسٹائل'' میں سے بیف کے فنگرلٹس نکال کر کھانے شروع کر دیے۔ اب وہ بغیر کانٹے کی مچھلی سالم نگل رہی تھی۔ اتنی لذیذ اشیاء اس نے خواب میں بھی نہ کھائی تھیں انیہ نے ''ندیدے پن'' پر محض دو دفعہ اس کی جانب دیکھا اور پھر خاموشی سے اپنا کھانا ختم کرنے لگی۔ جب اس کی پلیٹ خالی ہوگئی تو اس نے ایک دفعہ پھر انیہ کی جانب نگاہ اٹھائی، جس نے بغیر برا مانے اس کی پلیٹ کو دوبارہ بھر دیا اور وہ ایک دفعہ پھر صدیوں کے بھوکوں کی مانند کھانے میں مشغول ہوگئی۔ وہ پلیٹ تین دفعہ بھری گئی تھی۔

کھانے کے بعد جب اس نے الماس کے پیالے میں ''آئس کریم'' ڈالنا چاہی تو الماس نے فوراً یہ کہہ کر انیہ کو روک دیا کہ ''بی بی جی! بس۔'' شام تک صابرہ نے سلائی کا کام مکمل کر لیا تو رانیہ نے چار ہزار اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

''مجھے اب دو تین روز تک باہر جانا ہے، اس لیے میں باقی چادریں وہیں سے سلوا لوں گی۔ اب آپ کی ضرورت نہیں۔'' شائستگی سے کہہ کر رانیہ نے دونوں ماں بیٹی کو رخصت کر دیا۔ مگر جانے سے پہلے اس نے ان کو چائے ضرور پلائی تھی۔ یہ چائے کے دوران ہی ہوا تھا کہ جب الماس نے اپنی زندگی کی پہلی اور آخری چوری کی۔

لاؤنج میں آتش دان طرز پر بنی انگیٹھی کے اوپر رکھے سنہری فریم میں سے رانیہ کے دوسرے نمبر والے بیٹے کی تصویر اس نے رانیہ کی غیر موجودگی میں نکال لی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے ایسی حرکت کیوں کی تھی۔ اس کو بس اس لڑکے کے صاف کپڑے پسند آگئے تھے اور اس نے اتنا جرات مندانہ قدم اٹھا لیا تھا۔

جاتے وقت اس نے انیہ سے ایسے ہی پوچھ لیا ''آپ کے دوسرے نمبر والے بھائی کا نام کیا ہے؟''

انیہ نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولی ''ریان حیدر۔''

جب وہ چلی گئیں تو انیہ نے لاؤنج میں انگیٹھی پر رکھا وہ فریم اٹھا کر اپنے کمرے کی الماری میں رکھ دیا مبادا

رانیہ گمشدہ تصویر کے متعلق استفسار کرے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ رانیہ کو الماس کی اس حرکت کا علم ہو اور وہ اسے چور سمجھے۔

☆☆☆

اور یہ اسی رات کا قصہ ہے کہ جب میری اینے کا نام بدل گیا۔

ریان نے اسٹریٹ نمبر تین کے دہانے پر لے جا کر گاڑی آہستہ سے روک دی۔ نگاہوں کے سامنے دوسرے نمبر کا گھر ''ہڈسنز'' کا تھا۔ اس نے ایک نگاہ ان تینوں پر ڈالی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

جب وہ تینوں بھی گاڑی کے باہر آن کھڑے ہوئے تو ریان نے کہا ''میری اینے! تم وہ تمام برش پکڑو اور ڈینی تم بکٹ اٹھاؤ گئے۔'' اس کے حکم کی تعمیل کے بعد وہ چاروں گلوز پہننے لگے۔

''آر یو شیور، وہ لوگ گھر پر نہیں ہیں؟'' ڈینی کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

''نہیں، میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ آف کورس وہ لوگ گھر پر نہیں ہیں۔ میں نے کنفرم کر لیا ہے۔'' بلیک ہائی نیک کی آستینیں جو اس نے کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں ہاتھوں تک کرتے ہوئے بولا۔

''دیوار'' نامی کوئی چیز فیونا ہڈسن کے گھر کے اردگرد موجود نہ تھی۔ بس ایک لکڑی کا جنگلہ تھا جسے پھلانگنا نہایت آسان تھا۔ سو وہ آسان مرحلہ طے کر کے ریان اور میری اینے نے باقیوں کے لیے اندر سے کنڈی کھول دی۔

''یہ دروازہ کیسے کھلے گا؟'' ڈینی نے مین ڈور کو لاکڈ دیکھ کر پوچھا۔

''میری این پن دینا۔'' ریان نے لاک کا بغور معائنہ کرتے ہوئے پیچھے میری اینے کی جانب ہتھیلی بڑھائی۔

''میرا نام مت بگاڑو۔'' وہ بگڑ کر بولی۔

''یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ میری این! پن دو۔'' وہ درشتی سے بولا۔

اس کے حکم پر عمل کرتے ہوئے میری اینے نے اپنی ہیر پن اتار کر ریان کو تھما دی۔ تقریباً دو منٹ بعد ہی ریان نے انیہ کو بتاتے ہوئے ''ٹوٹکوں'' پر عمل درآمد کرتے ہوئے وہ لاک کھول لیا تھا۔

لونگ روم سے ہوتے ہوئے وہ اوپر والی منزل پر آ گئے جہاں ریان کے اندازے کے مطابق فیونا کا کمرہ ہونا چاہیے تھا۔ اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ وہ کمرہ کسی لڑکی کے زیر استعمال تھا۔ یہ بات کمرے کی نفاست اور بے بی پنک پردے بتا رہے تھے۔ مزید تصدیق فیونا کے بیک پیک نے کر دی تھی جو صوفے پر دھرا تھا۔

ریان نے اس کا بیک پیک کھولا اور میتھس کا جنرل نکال کر ڈینی کے حوالے کر دیا۔ جس نے نہایت تیزی سے سرخ رنگ کے پینٹ سے اسے رنگ دیا۔ تقریباً آدھی بالٹی تو رجسٹر کا ایک ایک صفحہ رنگنے میں ہی ضائع ہو گئی۔ باقی آدھی سے انہوں نے لائٹ پنک پردوں، بیڈ کورز، صوفوں اور کارپٹ کا حلیہ بگاڑنے کے علاوہ دیوار پر بڑا بڑا کر کے F.4 لکھ دیا۔ انہوں نے خاص ایکسپیریہ پینٹ خریدا تھا جو آسانی سے اترنے والا نہیں تھا۔

جب یہ تمام کارروائی مکمل ہو گئی تو جس خاموشی سے وہ لوگ آئے تھے۔ اسی خاموشی سے واپس آ گئے گاڑی میں بیٹھتے ہی ریان نے اسے واقعتاً اڑانا شروع کر دیا۔ جب وہ وہاں کی حدود سے باہر نکل آئے تو ایک دم ریان ہنسنے لگ گیا۔ ڈینی اور رانجی بھی ساتھ ساتھ ہنسنے لگے البتہ میری اینے کچھ خاموش سی بیٹھی تھی۔

''میری ان۔'' ریان نے ہنسی روک کر اسے مخاطب کیا۔

''میری اینے۔'' وہ ایک دم بھڑک کر بولی۔

''ہاں وہی۔ خیریت ہے؟''

''تم لوگ اس کا کمرہ بے شک خراب کر دیتے مگر اس کے جنرل کو تو بخش دیتے۔''

''کیوں؟'' اس نے مجھ سے پنگا کیوں لیا؟ اگر چیٹنگ کرنے پر مجھے ایکسپیل کر دیا جاتا تو میرا تو فیوچر تباہ ہو جاتا۔ ابھی میں نے اسے معاف کر دیا ہے تو ہاتھ تھوڑا نرم رکھا ہے ورنہ تم مجھے جانتی ہو۔'' وہ درشت لہجے میں بولا۔

''واہ! اچھا معاف کیا ہے تم نے۔'' میری اینے نے سر ہلا دیا۔

''اوہ ڈیم اٹ میرین تم کیوں......''

''مائی نیم از میری اینے، ایم اے آر اے اے این این ای انڈر اسٹینڈ؟'' وہ اکتا کر بولی۔ ریان کے ہاتھ تو گویا ایک مشغلہ لگ گیا تھا۔

''ہاں ہاں معلوم ہے مجھے میرین!'' وہ اسے چڑانے کو بولا تھا۔

''میری اینے!''

''آف کورس مائی ڈیر میرین!'' وہ خاموش ہوگئی اور غصے سے گاڑی کے باہر دیکھنے لگی۔

اس دن کے بعد سے وہ میری اینے سے میرین بن گئی تھی۔

☆☆☆

نیو کاسل اپون ٹائن میں دو بڑے ''پزا ہاؤس'' تھے۔ انجی کے بے پناہ اصرار پر ریان پورے گروپ کو نسبتاً بڑے اور مہنگے ''پزا ہاؤس'' میں لے گیا۔

''اب اتنا کھاؤ کہ تمہیں دس دن تک مزید بھوک نہ لگے۔'' قدرے الگ تھلگ کیبن کی جانب جاتے ہوئے ریان نے انجلینا سے کہا۔

''یہ تو منحصر ہے اس پر کہ تم کتنا کھلاتے، ورنہ میں تو......'' ریان کو چڑانے کے لیے اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ورنہ تم تو ''ندیدے پن'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے دنیا کے پچھتر فیصد بھوک سے بے حال افراد کو بھی مات دے سکتی ہو۔'' میرین نے جھٹ کہا اور باقیوں کی تقلید میں کرسی سنبھال لی۔

''بالکل۔'' ڈینیئل نے اتفاق کیا تو انجلینا تلملا کر رہ گئی۔

''اچھا مسٹر......! اب کچھ آرڈر بھی کرو، مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔'' میرین نے مسکینوں والی شکل بنا کر ریان کو طلب کیا۔

''ریان جلدی یار! تھوڑی سی دیر اور ہوگئی تو یہ خواتین فوت ہو جائیں گی۔'' ڈینیئل نے ''خواتین'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''یہ خواتین کس کو کہا ہے؟'' میرین ایک دم سلگ اٹھی۔

ڈینئیل نے اردگرد نگاہ دوڑائی اور کسی ''خواتین نما چیز'' کو نہ پا کر میرین سے بولا۔''جہاں تک میری آنکھوں نے دیکھا ہے، یہاں تم اور انجی ہی تشریف فرما ہو۔''

''ایک تو یہ کہ گنہگاروں کا کوئی اعتبار نہیں اور دوسرے یہ کہ میں صرف سولہ سال کی ہوں اور...''

ریان نے میرین کی بات کاٹ دی۔''اور ابھی فیڈر میں دودھ پیتی ہوں۔''

''ایڈیٹ!'' میرین نے اپنا ہینڈ بیگ ریان کے شانے پر مارا۔''میں تم سے بڑی ہوں۔میرا ادب کیا کرو۔''

''جی ہاں۔مگر اس ایک دن کے بڑے پن کا فائدہ نہ اٹھاؤ۔'' وہ تڑ سے بولا۔

''تھوڑی دیر کے لیے سیز فائر کر کے ذرا ادھر متوجہ ہو جاؤ اور آرڈر کرو۔'' ریان نے سب کی توجہ ویٹرس کی جانب مبذول کی تو میرین نے جھٹ مینیو کارڈ اٹھالیا۔مگر اینجلینا نے فوراً وہ کارڈ اس کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھ دیا۔

''دس گھنٹے تک تم مینیو پڑھتی رہتی ہو اور اینڈ پر آرڈر ہمیشہ'اٹالین کش'' ہی کرتی ہو۔اس لیے بہتر ہے تم یہ جاب میرے حوالے کر دو۔''

میرین قدرے جھینپ کر مسکرا دی۔اینجلینا نے لمبا چوڑا آرڈر نوٹ کرایا۔

ریان نے اپنے ساتھ ساتھ میرین کا بھی متوقع آرڈر نوٹ کرا دیا۔وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی پالک پنیر والا پزا کا آرڈر دے رہا تھا۔

''اب جی بھر کے کھانا۔'' ریحان نے اینجلینا کو چڑانے والے انداز میں کہا

''اچھا مستقبل کی آرتھوپیڈک ڈاکٹر اور سناؤ؟ واٹس اپ؟'' ریان اب میرین سے مخاطب تھا۔

''فی الحال تو تمہاری جیب خالی ہونے کے علاوہ کوئی نئی نیوز نہیں ہے۔'' وہ کچھ ترس کھانے والے انداز میں بولی۔

''میری جیب کی فکر مت کرو۔'' وہ ہنسا۔''ڈیڈ زندہ باد۔''

''کتنے اچھے ہیں عظیم انکل'' انجی پرستائش انداز میں بولی۔''چاہے ان کا بیٹا بدتمیزی اور فضول خرچی کی انتہا کر دے مگر وہ پیسے ضرور بھجوائیں گے۔''

''مجھ جیسا کفایت شعار اور سوچ سمجھ کر خرچنے والا بیٹا ان کا کوئی بھی نہیں ہے۔'' وہ گردن اکڑا کر بولا۔

''ویسے یہ بات تو ٹھیک ہے۔'' میرین نے اتفاق کیا۔''تم علی سے کم شاہ خرچ ہو۔''

''علی کا تو ذکر ہی نہ کرو۔'' ریان نے واقعتاً کانوں کو ہاتھ لگائے۔''وہ ڈیڈ سے مجھ سے فور ٹائمز زیادہ پاکٹ منی مہینے میں تین بار لیتا ہے۔''

''تم دونوں بہت ڈفرنٹ ہو۔'' میرین کہہ رہی تھی۔''علی اور تم لاسٹ ایئر جب میں ڈیڈ کے ساتھ ڈی سی گئی تھی تو علی سے ملی تھی۔وہ کافی فلرٹ ٹائپ کا لڑکا ہے مگر تمہاری تو میں نے آج تک کوئی گرل فرینڈ نہیں دیکھی۔''

''تعریف کر رہی ہو تو شکریہ۔نہیں کر رہیں تو میں بتاتا چلوں کہ لڑکیاں سر کا درد ہوتی ہیں۔ان سے ریلیشن رکھنا کنوئیں میں چھلانگ لگانے سے بدتر ہوتا ہے۔''

''تمہیں تو خیر ہر اچھی چیز بری لگتی ہے۔'' میرین نے اپنی صنف کی اس عزت افزائی پر ناک چڑھا کر کہا۔

''لڑکیوں کے علاوہ کس چیز کو جناب اچھا کہہ رہی ہیں؟'' ریان کو میرین کو چھیڑنے میں بے حد مزا آتا تھا۔

''تمہیں جیوگرافی بری لگتی ہے اور...... اور تمہیں کرکٹ بری لگتی ہے۔'' میرین نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''جیوگرافی، فزکس اور اوپرا کی اچھائی تو میں تسلیم کرسکتا ہوں مگر کرکٹ کا نام مت لو۔'' وہ منہ بنا کر بولا ''تم تینوں کو نجانے کیوں اتنے فضول، غیر دلچسپ اور سست رو کھیل میں دلچسپی ہے۔ پانچ دن دھوپ میں جانوروں کی طرح کھڑے ہو کر بھی اگر میچ ڈرا ہو جائے تو پھر اتنی محنت کا کیا فائدہ؟ فٹ بال اچھی ہوتی ہے، نوے منٹ میں ختم۔''

''فٹ بال!'' ڈینیئل نے ابرو اٹھائی ''یار اٹس بورنگ!''

''ڈیم اٹ...... فٹ بال از ناٹ بورنگ......''

''فٹ بال میں کوئی بھی پلس پوائنٹ نہیں ہے۔'' ڈینیئل بولا۔ ''پاگلوں کی طرح بائیس کھلاڑی ایک گیند کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ عجیب سی تیزی اور افراتفری ہے۔ کرکٹ بہتر ہے۔ آرام و سکون سے دیکھی تو جاتی ہے۔ فٹ بال دیکھ کر تو مجھے سانس چڑھ جاتی ہے۔''

''خیر اس کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ ریان! تم بڑے ہو کر فٹ بالر بن جانا اور ڈینیئل تم کرکٹر بس اب بحث ختم کرو۔'' میرین سمیت تمام افراد پزا لانے والے ویٹر کی جانب متوجہ ہو گئے، یہ جانے بغیر ہی کہ تقدیر نے میرین کے الفاظ میں اپنی مرضی سے ردوبدل کر دی تھی۔

☆☆☆

''سوچتی ہوں صابرہ تو تے بھری جوانی میں بیوی ہو گئی۔ ابھی تو تیری بچی بھی چھوٹی ہے اور تیرے سر سے مرد کا آسرا ہی اٹھ گیا......'' پھوپھی شکورن نے ایک سرد آہ بھری۔

''مرد نہ ہو تو عورت کا کوئی نہیں ہوتا۔''

اپنے ازلی گنوار پن سے سالن کچھ کھاتی اور باقی منہ اور کپڑوں پر گراتی الماس نے اس آخری فقرے پر نہایت چونک کر پھوپھی شکورن کی جانب دیکھا تھا اور جی ہی جی میں سوچا تھا ''یہ غلط کہہ رہی ہے۔ کوئی کیسے نہیں ہوتا؟ اللہ تو ہوتا ہے نا!'' وہ چاہنے کے باوجود بھی یہ بات با آواز بلند نہیں کہہ سکتی تھی۔

''بے چاری عورت تو تنہا رہ جاتی ہے۔ مرد کے سہارے کے بغیر یہ زندگی بہت مشکل لگتی ہے۔'' اب وہ کچھ دیر کو رکی اپنا سانس بحال کیا اور ایک دفعہ پھر اسی رفتار سے بولنے لگی۔ ''اب تو کیا کرے گی صابرہ؟ کدھر جائے گی؟'' اپنے ساتھ چارپائی پر بیٹھی پریشان سی صابرہ کو وہ مزید پریشان و ہراساں کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''معلوم نہیں پھوپھی! میں کدھر جاؤں گی؟ اکیلی دھی کو لے کر کس کس در کی خاک چھانوں گی؟ اب تو کوئی نہیں رہا ہمارا۔''

''میری بات مان صابرہ! تو دوجا ویاہ کر لے۔'' اس بات پر صابرہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔ اس کی

آنکھوں میں بلا کی حیرت تھی۔

''پھپھی......!'' وہ بمشکل بول پائی تھی۔ ''تو تو ایسا نہ کہہ۔''

''اری صابرہ! مجھے بتا، کیا برائی ہے دو جے ویاہ میں اور......''

پھوپھی شکورن نے اگلے آدھے گھنٹے میں ڈھائی ہزار دلائل اور مختلف احادیث کا حوالہ دے ڈالا۔ اپنی تقریر کے اختتام پر پھوپھی شکورن نے قدرے دھیمی آواز میں کہا ''وہ فضل دین ہے نا، وہ اپنا ساجد کا سالہ، ساجد کباڑیے کا۔''

''فضلو؟'' صابرہ نے کچھ حیران سی ہو کر ذہن پر زور ڈالا۔

''ہاں وہی۔ وہ دراصل شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے پیغام بھیجا ہے تو میں ادھر تیرے پاس آئی ہوں۔'' وہ رازدارانہ لہجے میں بتانے لگی تو صابرہ ہکا بکا اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''مگر پھوپھی! وہ تو نشہ کرتا ہے۔'' وہ منمنائی۔

''تو کون سی کنواری دوشیزہ ہے؟ تو بھی تو بیوہ ہے نا!'' پھر وہ قدرے ملائمت سے گویا ہوئی ''پہلے کرتا تھا نشہ، اب یہ لت چھوڑ دی ہے۔ اب تو وہ کاروبار کرنے لگا ہے۔'' اس طرح کی اور درجنوں باتیں صابرہ کے کان میں بھر کر، اپنا ٹوپی والا برقعہ سنبھالتی اس سیلن زدہ اور خستہ حال گھر سے چلی گئی۔ صابرہ نے ان باتوں کو بظاہر کوئی اہمیت نہ دی مگر اگلے روز اس سے اگلے روز اور پھر دو ہفتے تک تقریباً ہر روز جب پھوپھی شکوران ان کے گھر آ کر بیٹھ جاتی اور دھیرے دھیرے دنیا کی ''اونچ نیچ'' سمجھانے لگتی تو صابرہ قدرے بے بس سی دکھائی دیتی۔

الماس، اپنی ماں کی کیفیت سے بے نیاز، کھیل کود میں مگن رہتی۔ رانیہ کے دیے گئے پانچ ہزار میں وہ لوگ تقریباً چار ماہ گزارہ کرتے رہے تھے اور اب پچھلے گیارہ ماہ سے صابرہ کی سلائی کڑھائی گھر چلانے کا سبب بن رہی تھی۔ الماس خوش تھی کیونکہ اسے بھوک اور بدحالی کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ اسے سکول نہیں جانا پڑتا تھا وہ آزادی کے ساتھ گلی میں اپنے جیسے اجڈ اور گنوار بچوں کے ساتھ کھیل سکتی تھی، اس کے تن پر کپڑا (چاہے جتنا میلا سہی) موجود تھا اور پیٹ میں روٹی تھی۔ وہ اس سے زیادہ کی تمنا بھی نہیں کرتی تھی۔

مگر چند خواہشات سورج کی پہلی کرن کی مانند وجود میں پھوٹتی رہتی تھیں۔ ایک دو اچھے جوڑے اور زیورات پہننے کی امنگ اس کے دل میں اس کے ساتھ پروان چڑھ رہی تھی۔

انیہ کے بھائی کی تصویر بھی اس نے ان کپڑوں کے پیچھے چھپائی تھی۔ بھوری آنکھوں والا مسکراتا ہوا وہ لڑکا، اس نفیس سی ڈارک اور لائٹ بلیو دھاریوں والی شرٹ میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی شرٹ اتنی پیاری تھی کہ الماس اکثر تکیے کے غلاف میں چھپائی گئی وہ تصویر نکال کر گھنٹوں تکتی رہتی۔

اس کے لیے دن رات ویسے ہی گزر رہے تھے جیسے ہمیشہ گزرتے تھے مگر صابرہ ایک نئی مشکل کا شکار ہو گئی تھی۔ اپنی اسی مشکل کو حل کرنے کے لیے اس نے ایک روز الماس سے بات کی تھی۔

''الماس۔! وہ جو پھوپھی شکورن ہے نا، وہ میرے لیے ایک رشتہ لائی ہے۔'' نہایت جھجکتے ہوئے اس نے بات کا آغاز کیا تھا۔

''تو سی لینا ماں!'' وہ سمجھی تھی شاید پھوپھی بھی کوئی کپڑا لائی ہے۔

''الماس...... !وہ میرے لیے رشتہ لائی ہے۔''

''ہیں؟'' الماس ہکا بکا سی اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''وہ جو ساجد کباڑیے کا سالا ہے نا فضل دین، وہ فضلو جو تیرے باپ کے جنازے پر پیلی قمیص میں تھا۔ یاد ہے؟'' صابرہ پہلی دفعہ بیٹی کے سامنے شرمندہ ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی الماس بہت ناراض ہوگی، بہت دکھی ہوگی ماں کی دوسری شادی پر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ الماس اگر نہیں چاہے گی تو وہ ہرگز اقرار کرنے کی غلطی نہیں کرے گی۔

''اسی فضلو کا رشتہ ہے۔''

''اماں......! وہ فضلو تجھ سے ویاہ کرنا چاہتا ہے؟'' وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں۔'' صابرہ نے سر جھکا دیا۔

''پھر اماں؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

صابرہ نے قدرے چونک کر سر اٹھایا اور بغور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔

''پھر کیا؟''

''تو شادی کر کے یہاں سے چلی جائے گی؟'' اس کے لہجے میں اضطراب تھا۔

''نہیں تو، میں اور تم اکٹھے یہاں سے جائیں گے۔'' صابرہ نے ہولے سے کہا ''مگر الماس! تو کیا چاہتی ہے؟ میں اس سے شادی کر لوں؟''

''فضلو سے؟''

''ہاں۔''

''اماں تو کیا چاہتی ہے؟''

''جو تو کہے گی میں وہی کروں گی۔'' اسے یقین تھا کہ الماس نہیں مانے گی۔

'کر لے۔'' وہ بے نیازی سے شانے اچکا کر دوبارہ کاغذ کی کشتیاں بنانے میں مگن ہوگئی۔ آج بادل چھائے تھے اور لگتا تھا مینہ کھل کر برسے گا۔ اسی بارش کے لیے وہ کشتیاں بنا رہی تھی۔

☆☆☆

بات ٹائی ٹینک سے شروع ہوئی تھی۔ ریان کو موؤی بس ''ٹھیک'' ہی لگی تھی، اسی لیے اس کو اس طرح گہرائی میں جا کر ڈسکس کرنے سے اسے کافی بوریت محسوس ہو رہی تھی۔ ڈراما کلاس سے یوں بھی اسے نفرت تھی۔ جو واحد وجہ اس کلاس کو اٹینڈ کرنا تھی وہ وہاں کی پرفسوں آب و ہوا میں نیند کا اچھا آنا تھا، ورنہ وہ کبھی یہ کلاس نہ لیتا۔ اس کے برعکس کلاس کی تمام لڑکیاں بالخصوص میرین اور اینجلینا بڑھ چڑھ کر بول رہی تھیں۔

جو واحد لڑکا گفتگو میں حصہ لے رہا تھا وہ اینڈریو تھا۔

''حیدر، لگتا ہے تمہیں موؤی نے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا کرنا چاہیے تھا؟'' اس کی ہمیشہ بولتی اور لاجواب کر

دینے والی زبان کو خاموش دیکھ کر مسز کیمرون نے پوچھ لیا۔

''نو میم۔'' وہ دھڑلے سے بولا۔''کیونکہ میں لڑکیوں اور بعض ''لڑکوں'' کی طرح emotional sickness کا شکار نہیں ہوتا۔'' اس کا اشارہ اینڈریو کی جانب تھا جو خوامخواہ اپنی نالج جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہے یہ میم! حیدر صرف mental sickness (ذہنی بیماری) کا شکار ہوتا ہے۔'' اینڈریو نے کہا تو ساری کلاس سوائے اس کے دوستوں کے ہنس پڑی۔ جب کوئی کلاس فیلو خوب صورت ہو، امیر ہو، ذہین اور حاضر جواب ہو اور سب سے بڑھ کر ٹیچرز کا فیورٹ ہو تو دیگر طلباء کا اس سے جیلس ہونا فطری عمل ہے۔

ریان نے جواب نہیں دیا، وہ محض مسکرا دیا البتہ اندر ہی اندر اس کا خون کھول رہا تھا۔ میرین نے کچھ سخت کہنے کے لیے منہ کھولا مگر ریان نے نامحسوس انداز میں اس کے ہاتھ کی پشت کو دبا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

ٹائی ٹینک سے ہوتے ہوئے بات Ernest Hemigway wrestling تک چلی گئی۔ ریان نے یہ مووی بھی دیکھ رکھی تھی مگر وہ اینڈریو کی طرح نالج جھاڑنے کے بجائے خاموش بیٹھا تھا۔ اینڈریو اس فلم سے کافی متاثر نظر آرہا تھا۔ نوے کی دہائی کے وسط میں ریلیز ہونے والی اس فلم کی کہانی دو بوڑھے دوستوں کے درمیان گھومتی ہے۔ اینڈریو، فرینک کے کردار کو بڑی دلجمعی سے بیان کر رہا تھا۔

وہ ''فرینک'' کے دوست کے کردار کو پرفارم کرنے والے ایکٹر کا نام بھی غلط بتا رہا تھا۔ وہ اس کو رابرٹ ویلمر کہہ رہا تھا جبکہ وہ رابرٹ ڈووال تھا۔ کلاس میں شاید کسی نے وہ مووی نہیں دیکھی تھی ورنہ کوئی اس کی تصحیح کر دیتا۔

ریان کے پاس موقع تھا کہ وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ چکا سکے، مگر وہ ٹھنڈا کر کے کھانے کا عادی تھا۔

''میرا خیال ہے میم! جس طریقے سے اینڈریو اس کردار کی وضاحت کر رہا ہے لگتا ہے اس نے بہت غور سے مووی دیکھی ہے اور اس کردار کو ٹھیک سے سمجھا بھی ہے۔ کیوں نہ ہم اس کو ایکٹ کریں؟'' جب اینڈریو بول چکا تو اس نے ستائشی انداز میں کہا۔

یوں اگلے سنڈے کے لیے وہ فلم، پلے کی صورت میں ڈھال کر آڈیٹوریم میں ''ایکٹ'' کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ اینڈریو کافی خوش دکھائی دے رہا تھا جب فرینک کے کردار کو پرفارم کرنے والے سٹوڈنٹس کا نام زیر بحث آیا تو ریان نے فوراً اینڈریو کے حق میں ووٹ دے دیا۔

''میں اینڈریو کے تجزیے سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ میرا خیال ہے یہ کردار اسی کو ملنا چاہیے۔''

وہ کردار اینڈریو کو ہی مل گیا۔

بائیولوجی کلاس کی طرف جاتے ہوئے میرین نے ریان کو مخاطب کر کے کہا''میرا خیال تھا تم اس پر غصے ہو، مگر تم نے ایک لیڈنگ کیریکٹر اس کو دینے کا فیصلہ کیوں کروایا؟''

''اس گدھے کو یہ معلوم نہیں کہ یہ فلم ایک تھکی ہوئی فلاپ ترین فلم ہے۔ آج اس نے میرا مذاق اڑایا ہے نیکسٹ سنڈے میں دیکھوں گا جب پورا سکول اس کا مذاق اڑائے گا۔ میں خود سے زیادتی کرنے والوں کو چھوڑتا نہیں ہوں۔''

میرین نے حیرت سے اسے دیکھا ''تمہیں کیسے اور کیوں یقین ہے کہ پورا سکول اس کا مذاق اڑائے گا؟''

''مجھے پتا ہے کہ وہ رچرڈ ہیرس کو کاپی کرے گا اور رچرڈ ہریس نے اس فلم میں اپنی زندگی کی بدترین پرفارمنس کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر وہ بدترین پرفارمنس کو کاپی کرے گا تو اس کی پرفارمنس ایک درجہ مزید ''خراب'' ہو جائے گی نا۔'' ریان فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

ریان حیدر نے اسے پھنسایا ہے، اس کی بے عزتی کروائی ہے محض اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لیے اس بات کا اندازہ۔ اینڈریو کو پلے ختم ہونے کے بعد ہوا تھا۔ اس نے ریان کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ اور آنکھوں میں تمسخر کی چمک دیکھی تھی اور اس نے عہد کیا تھا کہ وہ بدلہ ضرور لے گا۔

اور اس دن ریان نے اپنا پہلا دشمن بنایا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ دشمن عنقریب اس پر خوش قسمتی کے دروازے کھولنے والا ہے۔

☆☆☆

وہ دونوں کہیں نہیں گئے فضلو رخصت ہو کر ان کے گھر آ گیا۔

رحیم بخش کے بعد وہ دوسرا شخص تھا جس سے الماس کو ڈر لگتا تھا۔ اس کی کالی آنکھیں انتہائی خوف ناک اور سیاہ ہونٹ بے حد موٹے تھے۔ وہ خود بھی کافی بھاری بھرکم اور ڈیل ڈول والا تھا۔

آئے دن ان کے صحن میں مہمان آئے بیٹھے ہوتے۔ وہ بھی اس کی طرح عجیب وغریب اور ڈراؤنے ہوتے تھے۔ عجیب جناتی اور بے ہنگم اونچے اونچے قہقہے لگاتے مرد اسے زہر لگتے تھے۔ شام کے بعد ''مہمان'' صحن میں ہوتے تو وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتی۔

صابرہ کو بھی عجیب چپ لگ گئی تھی۔ وہ اب پہلے سے دگنی محنت کرتی اور آدھی اجرت فضلو کے ہاتھ پر رکھ کر باقی چھپا دیتی۔ اس نے صرف الماس کو بتایا تھا کہ وہ باورچی خانے میں مرتبان کے اندر وہ پیسے رکھتی ہے اور یہ کہ وہ رقم ''برے دنوں'' کے لیے ہے۔

الماس کو معلوم نہ تھا کہ برے دن کون سے ہیں اور کب آئیں گے؟ اسے تو تمام دن برے لگتے تھے۔ اپنے گھر کے حالات سے بچنے کے لیے یا پھر ''نئے ابو'' کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے چھپنے کے لیے اس نے ایک دفعہ پھر اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں وہ ساتویں پاس کر کے بمشکل آٹھویں چڑھی تھی۔ بس ایک وہ رزلٹ کارڈ ہی تھا جو اسے پڑھا لکھا بتاتا تھا ورنہ مجال ہے وہ اپنے حلیے سے کسی کو شک بھی ہونے دے کہ وہ ساتویں پاس ہے۔

فضلو سے شادی کے دسویں ماہ صابرہ ایک مردہ بچے کو جنم دینے کے بعد بستر سے لگ کر رہ گئی۔ الماس نے اپنی ''بہن'' کو دیکھا تھا۔ کالی سیاہ، سوکھی سڑی ہوئی لاغر کمزور سی بچی جو بچی کم اور ڈھانچہ زیادہ لگتی تھی۔ اچھا ہی ہوا جو مرگئی ورنہ گھر کے اخراجات میں سے اس کا حصہ نکالنا مشکل ہی ہوتا مگر وہ اپنے ساتھ ساتھ صابرہ کو بھی مار ہی گئی۔ اس دن کے بعد نہ تو کبھی صابرہ بستر سے اٹھ کر بیٹھی نہ ہی اس کی چارپائی کے ساتھ رکھی میز پر موجود دوائیوں میں کمی آئی بلکہ دن بدن اس کی بیماریاں بڑھتی جارہی تھیں۔ یہ الماس تھی جو گھر کا سارا کام کرتی، ناشتہ بناتی، جھاڑو دیتی، جھاڑو پونچھا کرتی، پھر سکول چلی جاتی۔ واپس آتی تو کھانا بناتی، پھر شام کو ہی رات کا کھانا بنالیتی اور اس کے بعد اپنے

کمرے میں بند ہو جاتی۔ اس کے کمرے میں کوئی گھڑی تو تھی نہیں، مگر وہ جانتی تھی کہ صحن سے جو قہقہوں کی آوازیں آ رہی ہیں، وہ رات دو بجے تک جاری رہنا ہیں۔

آج کل، بلکہ پچھلے چند ماہ سے وہ مسلسل جیت رہا تھا۔ ابھی ہارنے کا موقع نہیں آیا تھا اسی لیے گھر کا چولہا جل رہا تھا۔

فضلو کا رویہ اس کے ساتھ برا نہیں تھا۔ وہ دونوں زیادہ بات نہیں کرتے تھے مگر پھر بھی اس کی نگاہوں سے الماس کو گھن آتی تھی، خوف آتا تھا۔ وہ جتنا وقت گھر میں ہوتا، وہ اس کے سامنے نہ آتی، نہ ہی وہ اسے پکارتا۔ شروع شروع میں اس نے ایک اچھا باپ بننے کی کوشش کی تھی مگر الماس نے ''لفٹ'' نہ کرائی تو وہ ازخود ہی پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔

کبھی کبھی رات کو لیٹے ہوئے، چھت کو گھورتے اور صحن سے آتی چنگھاڑتی ہوئی قہقہوں کی آواز سنتے ہوئے وہ سوچتی اگر میں کسی بڑے اور دولت مند گھر میں پیدا ہوئی ہوتی تو میرے پاس بھی اچھے کپڑے ہوتے، پہننے کو مہنگے مہنگے زیور ہوتے، میں اچھی قیمتی خوشبوئیں لگاتی۔ وہ تکیہ میں سے تصویر نکال کر دیکھتی۔ کیا میں ساری زندگی ایسے ہی رہوں گی؟ انہی میلے کچیلے کپڑوں میں ٹاٹ والے سکول میں پڑھتے۔ ان ہی گلیوں میں زندگی گزار دوں گی؟ کیا میں کبھی رانیہ اور انیہ کی طرح ''خوب صورت'' امیر اور خوش لباس نہیں ہو سکوں گی؟ اور جب ان سوالوں کا جواب ان پلستر سے اکھڑی دیواروں سے نہ ملتا تو وہ، وہ تصویر تکیے کے غلاف میں رکھ کر اپنا سر تکیے پر پھینک دیتی اور صحن سے اٹھتی آوازوں کے باوجود اسے نیند آ جاتی۔

☆☆☆

شاید اسے لگ رہا تھا یا پھر فضلو واقعی پچھلے چند دنوں سے پریشان تھا۔ اس کو اماں اور فضلو کے کمرے سے دونوں کے جھگڑنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ غصے میں گالیاں بک رہا تھا اور اماں چیخ رہی تھی۔ پھر اماں خاموش ہو گئی تو اس نے فضلو کو کمرے سے تیزی سے باہر نکلتے دیکھا۔ وہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک دم رک گیا اور بغور اس کا چہرہ دیکھ کر بولا۔

''شام کو تیار رہنا، تیرا نکاح ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر رکا نہیں بلکہ سیدھا باہر نکل گیا۔

الماس ساکت سی ہو کر بے یقینی سے اس جگہ کو تک رہی تھی جہاں چند لمحے پہلے وہ کھڑا تھا۔

فضلو کی آواز اس کی سماعتوں سے بار بار ٹکرا رہی تھی تو کیا فضلو جوا ہار گیا؟ اور اس نے مجھے بیچ دیا؟ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اماں کے کمرے کی طرف بھاگی۔

''اماں! یہ کیا کہہ رہا تھا؟'' وہ صابرہ کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ صابرہ کا چہرہ دائیں جانب تھا۔ شاید وہ بیٹی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''اماں، وہ کہہ رہا ہے شام کو میرا نکاح ہے۔ اماں کچھ کر..... اماں میں مر جاؤں گی۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ صابرہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

''اماں، اس کو منع کر..... خدا کا واسطہ تجھے اماں! اسے.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

صابرہ کیوں کوئی جواب نہیں دے رہی تھی؟ وہ کیوں خاموش لیٹی تھی؟

اس نے ڈرتے ڈرتے ماں کا چہرہ ادھر کیا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پہلے باپ اور اب ماں......اس کی اماں مرگئی تھی۔

''اماں، اماں!'' وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے اس کے بے جان وجود کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ صابرہ کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی۔ اس کا جسم برف کی مانند ٹھنڈا اور پتھر کی طرح سخت واکڑا ہوا تھا۔

''اماں اٹھ، اٹھ جا تجھے خدا کا واسطہ تجھے رسول کا واسطہ۔ اماں وہ مجھے بیچ دے گا۔ اماں خدا کے لیے اٹھ جا۔'' وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اسے ایک موہوم سی امید تھی کہ اماں شاید اس کے جھنجوڑنے اور ہلانے پر اٹھ جائے مگر وہ نہ اٹھی۔

اور نجانے کافی دیر وہ اسی طرح روتی، بلکتی رہی۔ اسے ماں کی موت کے ساتھ ساتھ اپنی موت کا بھی افسوس تھا۔ وہ خود بھی مرنے جا رہی تھی۔ فضلو نے شام کو تیار رہنے کا کہا تھا، اور شام ہونے میں اب کتنی گھڑیاں باقی تھیں؟ اس کے جنازے میں اب کتنی گھڑیاں باقی تھیں؟ اس نے آنسو پونچھے اور آنے والے لمحات کا تصور کرنے لگی۔ اس کا نیا ابا اس کے لیے کوئی شہزادہ گلفام تو تلاش کرنے سے رہا جو دولہا وہ اس کے لیے ''ڈھونڈ'' چکا تھا وہ یقینی طور پر فضلو کی طرح ہی کوئی آوارہ نشئی اور جواری ہوگا۔ ایک بھاری بھر کم، کالا کلوٹا جواری۔ اس کی زندگی بھی ایک جواری کی بیوی بن کر اماں کی طرح بستر پر بیمار رہ کر گزرے گی۔

وہ اجنبی نگاہوں سے در و دیوار کو دیکھ رہی تھی۔

''جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا خدا ہوتا ہے۔'' یہ الفاظ اس نے کہاں سے سنے تھے اسے یاد نہیں، مگر اسے اتنا یاد تھا کہ اس نے یہی الفاظ اپنی ماں کے سامنے دہرائے تھے اور اس کی ماں نے اس کا یقین نہیں کیا تھا بدلے میں اس کی ماں کو کیا ملا؟ اس نے نظر بھر کر ماں کے کمرے کی جانب دیکھا جہاں اس کی بے گور کفن لاش رکھی تھی اور بے ساختہ ایک جھرجھری لی۔

وہ اب کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

اس کو اس کا حق نہیں مل رہا تھا۔ اس کو اپنا حق چھیننا تھا۔ اسے زندگی سے بہت کچھ حاصل کرنا تھا۔

اس کو یاد آیا، اماں کچھ پیسے بچا کر مرتبان میں رکھتی تھی۔ اس نے جلدی سے الماری کھولی جس میں وہ مرتبان رکھا تھا۔

اس نے مرتبان میں موجود رقم گنی۔ اماں کتنے عرصے سے اس کے لیے رقم جوڑ رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ تقریباً دو ہزار روپے تھے۔ اس نے آنسو پونچھے۔ اب رونے کا وقت نہیں تھا۔ اسے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔ ابا کے آنے سے پہلے پہلے تک۔

اس نے مرتبان واپس رکھا اور جلدی سے اندر کمرے میں جا کر اپنے چار جوڑے ایک بڑے دوپٹے میں گٹھڑی کی صورت میں باندھ دیے۔

پھر یکا یک اسے ایک خیال آیا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے وہ پتلا سا شاپر نکالا جس میں وہ تصویر اور کافی عرصے پہلے رانیہ کا دیا گیا کارڈ موجود تھا۔ اس نے وہ شاپر بھی کپڑوں کے ساتھ رکھ دیا اور تیزی سے گھر کی دہلیز پار کر کے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

''کل اپریل فول کیسے منانا ہے؟'' اس کا خیال تھا، باقی سب بھی اس کی طرح کل کے دن کے لیے پر جوش ہوں گے مگر اس بے تکے سوال پر انجلینا نے جن نگاہوں سے اسے گھورا وہ کچھ گڑبڑا کر بولا ''میرا مطلب ہے کوئی پریکٹیکل جوک وغیرہ......''

''تمہیں کس کو بے وقوف بنانا ہے؟'' میرین نے تیکھی اور مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

''کسی کو بھی۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔ ''کل تو ہر طرح کی فولنگ جائز ہوگی۔''

''تمہیں تو بے وقوف بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ریان! تمہیں تو خدا نے بنایا ہے۔'' ڈینی نے لقمہ دیا۔

''ہنسنا تھا؟'' اس نے بے زاری سے پوچھا۔

''نہیں، اپنی کمزوریوں پر کوئی نہیں ہنستا۔'' وہ برجستہ بولا۔

''میری بات تو سنو۔'' وہ قدرے جھلا کر بولا۔

''ہاں بالکل بھونکو۔'' ریان نے ڈینی کو تیز نظروں سے گھورا اور بولا۔

''دیکھو، کل ہمیں لوگوں پر ٹرکس کرنا ہیں۔ ان کے ساتھ مذاق کرنے ہیں، جیسے میں سٹور فون کر کے کہتا ہوں آپ کے پاس کین میں پرنس البرٹ ہے؟ تو وہ کہیں گے جی ہے۔'' پھر میں کہوں گا'' اگر ہے تو اسے باہر نکالو۔''

وہ تینوں اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''پرنس البرٹ تمباکو ہوتا ہے، یہ کین میں ملتا ہے۔'' ریان نے وضاحت کی۔

''یہ مذاق تھا؟'' میرین نے پوچھا۔

''پہلے تو مجھے شک تھا اب یقین ہوگیا ہے کہ لڑکیوں میں حس مزاح نامی چیز ناپید ہے۔''

اسی اثنا میں کسی گہری سوچ میں گم انجلینا کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''آپ کس مراقبہ میں ہیں؟''

''میرے ساتھ ایک عجیب سا مسئلہ ہوگیا ہے۔'' وہ اسی گم صم لہجے میں بولی۔

''آج کھانا نہیں کھایا لوگوں نے جو مسئلے ہو رہے ہیں؟''

''کھایا ہے کھانا۔ بلکہ میرے حصے کا بھی ٹھونس لیا ہے۔'' میرین نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بتایا۔

''اچھا...... چلو کوئی بات نہیں اینجی نے چاکلیٹس بنائی ہیں وہ کھالو۔'' میرین نے لاپروائی سے کہا تو اینجلینا فوراً کچن میں گئی۔ اس کی واپسی ایک کینڈی ڈش کے ہمراہ ہوئی تھی جس میں چار عدد چاکلیٹس موجود تھیں۔ اندھے کو

بھی نظر آرہا تھا کہ ان کے اوپر چاکلیٹ لگائی گئی تھی۔

اینجلینا نے ڈش اس کے سامنے کی مگر اس نے ''دل نہیں کر رہا'' کہہ کر پیشکش ٹھکرا دی۔ ان تینوں نے باری باری ایک ایک چاکلیٹ اٹھائی اور مزے سے کھانے لگے۔

وہ سمجھ گیا ان تینوں کا مقصد ریان کو''زیادہ الرٹ'' کرنا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ چاکلیٹس کو ''ایکسٹرافنی'' سمجھ کر کھانے سے انکار کر دے اور وہ آرام سے ان کو منہ میں رکھ کر اس کو یہ بتائیں کہ وہ بے وقوف بن گیا ہے مگر وہ بھی استادوں کا استاد تھا۔ اس نے یہ ظاہر ہی نہیں کیا کہ اسے شک گزرا ہے کہ چاکلیٹس کے ساتھ کوئی خرابی ہے وہ مسکرا دیا۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ بات مکمل کیے بغیر ہی فون کی طرف لپکا۔

''ہیلو؟''

''ہیلو!'' ایک بچے کی آواز ریان کی ساعت سے ٹکرائی۔

''آپ کے پاس کین میں پرنس البرٹ ہے؟'' اس بچے کی آواز میرین کے چھوٹے بھائی سے بڑی ملتی تھی۔

''جی ہاں ہے۔'' اس نے معصومیت سے کہا۔

''اچھا؟ تو ایک پاؤنڈ کا کین کتنے کا ہوگا؟''

''مجھے کیا پتا۔''

''کیوں؟ یہ ایز ڈا سٹور نہیں ہے۔''

''جی نہیں یہ بے چارہ گھر ہے۔ ایز ڈا سٹورز یارکشائر میں ہیں۔''

''تو آپ کے پاس تمباکو کیسے ہے؟'' وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔

''خیر۔ وہ تو میرے پاس نہیں ہے مگر میرا خیال تھا کہ آج آل فولز ڈے ہے تو شاید آپ کوئی ٹرک کھیلنا چاہتے ہیں مجھ پر؟'' ریان نے کہا۔ ''اور شاید آپ کا نام چارلس ہے اور نک نیم چک ہے۔''

''جی نہیں۔'' اتنا کہہ کر ٹھک سے اس نے فون رکھ دیا۔

وہ ریسیور رکھ کر پلٹا تو وہ سب جا چکے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈش میں موجود آخری چاکلیٹ اٹھالی اور مزے سے کھانے لگا۔

اور اندر سے صابن نکلا۔

''اوہ......ڈیم اٹ۔'' اس نے صابن کے ٹکڑے تھوکتے ہوئے خود پر ہزار بار لعنت بھیجی۔

☆☆☆

اپنی بقا کی جنگ لڑتے ہوئے اس نے گھر سے باہر پہلی رات ایک پارک کے جنگلے سے ٹیک لگا کر گزارنے کی کوشش کی تھی۔

آج اسے اپنے ٹوٹے پھوٹے، خستہ حال ''ڈربے نما'' گھر کی قدر آرہی تھی۔ وہاں اور کچھ نہیں کم از کم

سکون تو تھا۔ دنیا والوں کا مہیب سناٹے اور چنگھاڑتی ہوئی تاریکی کا ڈر تو نہیں تھا۔

اگر اس کا باپ نہ مرتا...... اگر اس کی ماں دوسری شادی نہ کرتی...... اگر وہ اس شادی کا مشورہ نہ دیتی......

اگر اس کی ماں بیمار پڑ کر مرنہ جاتی...... اگر فضل دین اس کی شادی نہ کرارہا ہوتا...... نجانے کتنے ہی ''اگر'' تھے۔

مگر ہوتا وہی ہے جو قسمت کو منظور ہوتا ہے۔ آج وہ تنہا صرف اللہ کے آسرے وہاں بیٹھی تھی۔

وہ اپنی ہی سوچوں میں مگن تھی جب اسے دو سایے اپنی جانب آتے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک قدرے لڑکھڑا رہا تھا۔ الماس کو بے تحاشا خوف محسوس ہوا۔ قریب آ کر وہ دونوں جنگلے سے کمر ٹکا کر کھڑے ہو گئے۔

ان میں سے ایک دوسرے سے لڑکھڑاتی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ الماس کو ''دھندا'' اور ''باقی'' جیسے چند ایک الفاظ ہی سمجھ آئے تھے۔ وہ ڈر کے مارے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایک دم چونک کر ایک آدمی نے اس کو دیکھا تھا۔ اپنی گٹھڑی سینے سے لگائے ایک اکیلی (قدرے فربہی مائل) لڑکی، وہ بھی جوان اور خوب صورت رات کے اس پہر وہاں کیا کر رہی تھی؟

وہ گھبرا کر چلنے لگی تھی۔

''اے سالی کدھر جاتی ہے؟'' اس کے عقب سے آواز آئی تھی۔ وہ دونوں بندے اب مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے بلکہ اس کے پیچھے بھی آ رہے تھے۔

وہ تیز تیز چلنے لگی۔

''گھر سے بھاگی ہے؟'' وہ اس کا پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔

خوف سے اس کی ٹانگیں تھر تھر کانپ رہی تھیں مگر اس کے باوجود نتائج سے بے خبر ہو کر الماس نے سرپٹ بھاگنا شروع کر دیا۔

وہ بغیر رکے بغیر پیچھے دیکھے اندھا دھند بھاگ رہی تھی اسے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز بخوبی سنائی دے رہی تھی۔

تاریک سنسان سڑک پر اس وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی اسی لیے وہ کسی کو مدد کے لیے بلانے سے بھی قاصر تھی۔

ایک موڑ مڑ کر وہ بڑی شاہراہ پر آ گئی اور تھوڑے ہی فاصلے پر سڑک کے دوسری جانب اسے ایک پولیس موبائل دکھائی دی۔ الماس بے اختیار آگے بڑھی اور ہاتھ کے اشارے سے اس کو روکنا چاہا۔

اس نے پیچھے مڑ کر ان دونوں کو دیکھا جو اس سے بیس پچیس گز کے فاصلے پر ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

موبائل الماس کے قریب آ کر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا اور اندر سے ایک آدمی باہر نکلا۔ اس آدمی کو نکلتا دیکھ کر پہلے تو وہ آپس میں بات چیت کرنے لگے پھر الٹے قدموں واپس پلٹ گئے۔

اسے اطمینان ہوا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑے آدمی کو دیکھا وہ ایک اونچا لمبا پچیس چھبیس برس کا مرد تھا۔ جس نے پولیس کا یونیفارم پہن رکھا تھا۔

''وہ......وہ......'' وہ اپنا تنفس بحال کرنے لگی۔

''وہ میرے پیچھے آرہے تھے۔'' وہ بے ربط سانسوں کے درمیان بتانے لگی۔

اس نے ایک نظر بھر کر الماس کو دیکھا۔ سیاہ چادر کے اندر اس کی کھلتی ہوئی گوری رنگت بہت نمایاں تھی۔ سیاہ بالوں کی چند ایک الجھی ہوئی لٹیں اس کے چہرے پر بکھری تھیں۔ ہاتھ میں گٹھڑی پکڑے وہ چودہ پندرہ برس کی لڑکی کہاں سے چلی آرہی تھی؟

''کہاں سے پیچھے کیا انہوں نے تمہارا؟'' وہ اب اسے تیکھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''وہ، وہ بچوں کا نہیں ہوتا، کیا کہتے ہیں اسے؟ ہاں پارک وہاں میں کھڑی تھی۔'' وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔

''اور تم وہاں کیا کر رہی تھیں؟'' وہ اس کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ الماس نے ایک دم ٹپٹا کر اسے دیکھا تھا۔

''میں تو......'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے۔

''گھر سے بھاگی ہو؟'' وہ کچھ غرا کر بولا تھا۔

''نہیں نہیں نہیں میں گھر سے نہیں بھاگی، میں قسم کھاتی ہوں۔ میرا یقین کرو، میں گھر سے نہیں بھاگی۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''تو اس وقت کہاں سے آرہی ہو؟'' رمیز نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''گھر، گھر سے۔'' وہ گھگھیائی۔

''کہاں ہے تمہارا گھر؟''

''میرا کوئی گھر نہیں ہے صاحب جی!'' وہ رو پڑی تھی۔

اسے روتا دیکھ کر وہ عجیب سے مخمصے میں پھنس گیا تھا۔

''دیکھو روؤ نہیں۔ گاڑی میں بیٹھو، میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔'' وہ کچھ ہمدردی سے بولا تاکہ اس سے اصل حقیقت اگلوا سکے۔

''نہیں نہیں...... مجھے گھر نہیں جانا۔'' وہ دہشت سے بولی۔

''اچھا، گاڑی میں بیٹھو۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا اور دروازہ کھول دیا۔

اس کے بیٹھتے ہی رمیز نے موبائل چلا دی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' وہ پوچھنے لگا۔

خاموشی......

''کہاں سے آئی ہو؟'' اس نے ایک دفعہ پھر کوشش کی۔

ہنوز خاموشی۔

''باپ کا نام کیا ہے؟'' وہ تحمل سے بولا۔

چپ۔

''میں تمہیں تھانے لے جا کر الٹا لٹکا دوں گا تو یہ زبان فرفر بولے گی۔'' وہ ڈپٹ کر بولا۔

''الماس نام ہے میرا، ابا کا نام رحیم بخش تھا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''ہوں.....کہاں سے آئی ہو؟'' وہ ونڈ اسکرین پر نگاہیں جمائے پوچھ رہا تھا۔

''گھر سے۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

''جہاں اللہ لے جائے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''میں ابھی گاڑی کھمبے میں مار دوں گا تو بی بی اللہ فوراً ہی تمہیں اوپر لے جائے گا۔ سیدھی طرح بتاؤ گی یا تمہیں تھانے لے جاؤں؟'' اس کے لہجے میں دھمکی تھی جس نے الماس کو دبکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''مجھے نہیں پتا مجھے کہاں جانا ہے صاب جی!'' وہ دھیرے سے بولی۔

''گھر سے کیا سوچ کر نکلی تھیں؟'' رمیز نے اپنا لہجہ کچھ نرم کر لیا تھا۔

''کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔'' وہ بڑبڑائی۔ وہ تو بغیر سوچے سمجھے نکل پڑی تھی، اتنا بھی نہیں سوچا تھا کہ دنیا کتنی بے رحم اور سفاک ہوتی ہے۔

''باپ کیا کرتا ہے تمہارا؟'' رمیز نے کچھ دیر کے توقف سے پوچھا۔

''وہ مر گیا ہے۔'' الماس نے اپنی گٹھڑی کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''چلو ماں تو ہوگی نا؟'' وہ موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔

''وہ بھی مر گئی ہے۔'' وہ گود میں رکھی گٹھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔

''لو جی۔ تمہارا ابھی جواب نہیں ہے۔'' وہ لاپروائی سے ہنسا تھا۔ ''باپ کو پوچھا تو وہ مر گیا ہے، ماں کا پوچھو تو وہ بھی مر گئی ہے۔ گھر سے آ رہی ہو مگر گھر کوئی ہے نہیں۔ کہیں جانے کے ارادے سے ہی نکلی تھیں مگر اپنی منزل کا بھی پتہ نہیں۔ واہ۔''

وہ خاموش رہی، کیا بتاتی کہ یہی سچ تھا۔

''تم لڑکیاں بھی نا، بس.....ذرا ماں باپ سے جھگڑا ہو، ذرا کوئی تلخ کلامی ہو، گھر سے بھاگ جاتی ہو۔ اتنا بھی نہیں سوچتیں کہ تمہارے ماں باپ پر کیا گزرے گی۔ وہ بے چارے تمہیں پال پوس کر بڑا کرتے ہیں۔ تمہارے نازنخرے اٹھاتے ہیں جبکہ بدلے میں تم لڑکیاں ان کے گلے میں ہمیشہ کے لیے رسوائی کا طوق ڈال دیتی ہو۔''

''میرے ماں باپ مر چکے ہیں کتنی دفعہ بتاؤں؟'' وہ چیخ کر بولی۔ ایک دم وہ پرانی الماس بن گئی تھی۔ ''کان نہیں ہیں تیرے بابو؟ اگر ہیں تو لگتا ہے ان میں سے میل صاف نہیں کرتا، تجھے میری آواز سنائی نہیں دیتی؟''

رمیز کو ایک لمحہ لگا تھا سنبھلنے میں۔

''کب مرا ہے باپ؟''
''کافی عرصہ ہو گیا ہے۔'' وہ نخوت سے بولی۔
''ماں کب مری؟'' ایسے سوال کوئی پولیس والا ہی کر سکتا تھا۔
''آج صبح (صبح)۔'' وہ چڑ کر بولی۔
''اوہ گاڈ..... تمہاری ماں آج مری ہے۔ اور تم آج ہی گھر سے بھاگ آئی ہو؟'' وہ حیران سا ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔
''میں گھر سے نہیں بھاگی ہوں۔'' اسے اب ان سوال جواب سے چڑ ہونے لگی تھی۔
''اوہ بی بی! رات کے اندھیرے میں اپنا سامان اٹھا کر سڑک پر تنہا چلتی لڑکی کو کوئی گدھا بھی گھر سے بھاگی لڑکی ہی کہے گا۔ شاباش، مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بتاؤ۔ میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔'' وہ اپنا لہجہ بات کی مناسبت سے اونچا نیچا کرتا رہا تھا۔
''مجھے گھر نہیں جانا۔'' وہ احتجاجاً بولی۔
''مگر میں تمہیں تمہارے گھر کے علاوہ کہیں نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ اپنی بات پر ہنوز ڈٹا ہوا تھا۔
''نہیں نہیں صاب جی.....! خدا کا واسطہ ہے مجھے اتار دو.....یہیں اتار دو۔'' وہ سچ مچ گھبرا گئی تھی۔
''مجھے لگتا ہے جس کے ساتھ تم بھاگی تھیں وہ تمہیں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ میری مانو تو اپنے گھر واپس چلی جاؤ۔''
''میں تجھے کتنی واری بتاؤں، میں گھر سے نہیں بھاگی۔ تو پاگل ہے کیا؟''
رمیز خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے پھر اس کی آواز نے ماحول پر چھائے سکوت کو توڑا۔
''ماں کیسے مری تھی؟'' الماس کو اس سوال کی توقع نہ تھی۔ وہ حیران سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔
''دیکھو الماس بی بی اگر تم واقعی سچ کہہ رہی ہو تو مجھے پوری بات بتاؤ، تب ہی میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں گا۔'' گو کہ وہ پہلے بھی چند ایک باتیں نرمی سے کر ہی رہا تھا مگر اب کی بار اس کے نرم لہجے میں ''اعتبار'' کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ الماس چند ثانیے اس کا چہرہ تکتی رہی، پھر سر جھکا لیا۔
رمیز کو اس خاموشی کی وجہ تب سمجھ میں آئی جب اس نے الماس کے ہاتھوں پر متواتر گرتے آنسو دیکھے۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے موبائل ایک سائیڈ پر کھڑی کر دی اور اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا ''مجھے تمام واقعات و حالات بتاؤ جو تمہارے ساتھ پیش آئے ہیں۔''
وہ اب سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ رندھی ہوئی آواز میں الماس نے اسے ایک ایک بات بتا دی۔ اپنی کتھا کے اختتام پر اس نے پانیوں سے بھری آنکھوں سے رمیز کی جانب دیکھا۔
''کیا اب بھی میں تجھے گھر سے بھاگی ہوئی لگتی ہوں؟'' اس کے لہجے میں کچھ تھا جو اس کی داستان کے سچے ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

''اچھا،تم میرے ساتھ تھانے چلو۔ میں تمہارے باپ کو وہیں بلواتا ہوں، سارا معاملہ حل کرا دیتا ہوں۔ وہ میرے درمیان میں آنے کے باعث تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

''وہ مجھے نقصان پہنچائے گا۔'' وہ اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔ ''اور میں نے کسی تھانے وانے نہیں جانا۔ اچھا!''

''پھر تمہیں کہاں جانا ہے؟ کس کو جانتی ہو تم اس شہر میں؟'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''کسی کو بھی نہیں۔'' اس نے سر جھکا لیا۔

''پھر بھی کوئی تو ہوگا نا، آئی مین تم کبھی گھر سے باہر تو نکلی ہوگی نا۔ کسی رشتہ دار کا گھر، کوئی جاننے والا کسی کا اتا، پتا تو ہوگا تمہارے پاس؟''

''وہی محلے والے ہیں جن کو میں جانتی ہوں۔'' اس کے چہرے پر مکمل طور پر مایوسی چھا گئی تھی۔ وہ ان محلے والوں سے مدد تو لینے سے رہی۔ وہ اس کی شادی کرانے میں فضلو سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں تب اسے رانیہ کا خیال آیا تھا۔

''میں رانیہ کو جانتی ہوں۔'' وہ خوشی سے چور لہجے میں بولی۔

''ملکہ رانیہ؟'' رمیز نے ابرو اٹھائی (اسے تو میں بھی جانتا ہوں۔)

''رانیہ..... ہاں میں اسے جانتی ہوں۔'' اس نے رمیز کی بات جیسے سنی ہی نہیں تھی۔ ''اس کی ایک بیٹی بھی تھی اینہ اور اس کے بڑے بیٹے کا نام علی تھا اور چھوٹے کا ریان۔''

''وہ کون ہے اور تمہاری کیا لگتی ہے؟'' رمیز نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میری اماں درزن تھی نا، تو اس نے اماں سے کپڑے سلوائے تھے۔ میں اس کے گھر گئی تھی'' وہ پرجوش لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''گھر کہاں ہے اس کا؟''

''یہ میرے پاس اس کا کارڈ ہے۔'' اس نے وہ کارڈ نکال کر رمیز کو دیا۔

''یہ تو رانیہ عظیم احمد کا کارڈ ہے۔ مشہور فیشن ڈیزائنر۔'' وہ کارڈ پڑھتے ہوئے بولا۔

''ہاں وہی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مگر تم ان کو نہیں جانتی ہوگی۔ وہ تمہاری ماں سے کیوں کپڑے سلوائیں گی؟ وہ تو خود فیشن ڈیزائنر ہیں۔'' رمیز کو یقین نہیں آرہا تھا۔

''کیا ہیں؟''

''اوہ خدایا......! وہ تو خود درزن ہیں۔'' وہ جل کر بولا۔

''اچھا'' اسے حیرانی ہوئی تھی۔ ''خیر مجھے وہیں لے جاؤ۔''

رمیز نے چند ثانیے اس کا چہرہ بغور دیکھا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔

اس سفید گیٹ کے باہر اتارنے سے پہلے اس نے الماس سے کہا تھا ''میں تمہیں آج بچا رہا ہوں، اگلی دفعہ

نہیں بچاؤں گا۔ اب کوئی غلط کام مت کرنا۔ یہ دنیا بھیڑیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اول تو یہ لوگ تمہیں رکھیں گے نہیں، بالفرض رکھ بھی لیں تو پلیز الماس! کسی پر بھی کبھی بھی اندھا اعتبار مت کرنا اور نہ ہی اس تھانے دار کو فون کرنا ہے۔''

وہ غلط سوچ رہی تھی۔ اس نے آگے جا کر یہ تمام کام کیے تھے۔

اپنی گٹھڑی سینے سے لگائے وہ اس گھر کی چاردیواری کے ساتھ موجود خالی احاطے کی جانب چلی گئی۔

رات کے دو پہر بیت چکے تھے، ہر سو گھپ اندھیرا اور سناٹا تھا۔ سوائے گھروں کی بتیوں کے، ہر طرف تاریکی پھیلی تھی۔ اسی اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ایک کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اردگرد موجود کانٹوں اور جھاڑیوں سے اس کے جسم پر چند ایک خراشیں بھی آئی تھیں مگر اسے اس وقت اس بات کی پرواہ نہ تھی۔ اسے صبح ہونے کا انتظار تھا۔ اس نے سر گھٹنوں پر رکھ لیا اور خاموشی سے انتظار کرنے لگی۔

☆☆☆

''فوراً سے پیشتر اپنا سامان سمیٹو اور.....'' وہ کہہ ہی رہے تھے کہ ہمیشہ کی طرح ریان نے ان کی بات کاٹ دی۔

''اور پاکستان آجاؤ؟ یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟ نو ڈیڈ!.....سوری میں بہت بزی ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ آپ اصرار کریں گے، بھئی میں ہوں جو خاص چیز مگر میں نہیں آسکتا۔ مجھے آپ کی فیلنگز کا احساس ہے مگر ڈیڈ میں واقعی بہت بزی ہوں۔ چھٹیوں کے بعد آنے کی کوشش کروں گا۔'' وہ مسلسل بولے چلا جا رہا تھا کہ زچ ہو کر عظیم نے مداخلت کی۔

''شٹ اپ۔'' وہ ڈپٹ کر بولے۔ ''بڑی خوش فہمیاں پال رہے ہیں جناب! میں نے گھر آنے کی آفر ہی نہیں دی اور خود ہی خود قیاس آرائیاں کر رہے ہو۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اپنا سامان پیک کرو اور بورڈنگ ہاؤس شفٹ ہو جاؤ۔ پورا ہفتہ تمہاری آنٹی نہیں ہوں گی اور یہ تمام عرصہ تم بورڈنگ میں رہو گے۔''

''ڈیڈ!'' وہ کچھ لاڈ سے بولا تھا ''میں اکیلا رہ لوں گا۔ آپ خود سوچیں، بندہ اکیلا رہے تو اس میں کانفیڈنس پیدا ہوتا ہے اور آزادی بھی ہوتی۔'' آخری فقرہ اس نے دانستہ طور پر آہستہ سے کہا تھا۔

''آزادی کے کچھ لگتے تم آج ہی بورڈنگ ہاؤس شفٹ ہو جاؤ۔ قسم سے بڑا کانفیڈنس پیدا ہوگا میرے بیٹے میں۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''آپ کو اپنے بیٹے پر ذرا بھی اعتماد نہیں ہے جو اکیلا نہیں رہنے دیتے؟'' اس نے اپنی آواز میں دنیا جہان کا دکھ سموتے ہوئے جذباتی بلیک میلنگ کی کوشش کی۔

''میرے لیے ایک اسپائلڈ چائلڈ بہت ہے، دوسرا نہیں چاہیے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا تھا۔ اس نے ریسیور کو تندی سے گھورا (یہ علی کا ہر نزلہ مجھ پر کیوں گرتا ہے؟)

''میں رہ لوں گا اکیلا۔'' وہ بضد تھا۔

''ریان! میں نے کہا ہے نا نہیں!'' اب وہ سخت لہجے میں بولے۔

''اچھا۔'' وہ زور سے بولا اور ریسیور کھٹ سے کریڈل پر پنخا۔

''ذرا اور زور سے مارو، ایسے نہیں ٹوٹے گا۔'' ہاتھ میں پکڑے کاغذ پر رنگ بھرتی میرین نے طنزیہ کہا تو اس

نے گھور کر اسے دیکھا۔
''میری خوشی کسی سے برداشت نہیں ہوتی۔'' اس نے زور سے صوفے پر مکا مارا اور پھر ہلکی سی ''آہ'' کے ساتھ ہاتھ ملنے لگا۔'' وہ عادتاً اپنا تکیہ کلام بڑبڑایا۔
''وجہ بتاؤ پہلے، پھر بے شک ناراض ہو جانا۔'' یہ میرین کا اسٹائل تھا۔ وہ ریان کو باتوں میں الجھا کر ہمیشہ اس کا غصہ ٹھنڈا کرتی تھی۔
''علی کو ہر آزادی ہے، اسے کچھ نہیں کہتے ڈیڈ مجھے تو ہفتہ بھی گھر میں اکیلے نہیں رہنے دے رہے۔''
''سیدھی سی بات ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے گھر میں ایک اور ''خراب'' اور ''کرپٹ'' بیٹا ہو۔'' میرین بے نیازی سے مسلسل ہاتھ چلاتے ہوئے بولی۔
''جو بھی ہے۔'' اس نے شانے اچکا دیے۔ دل کی بھڑاس نکال لیتا تھا تو پھر اسی طرح ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔
میرین کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے میرین کی جانب نگاہ کی اس کے ہاتھ میں موجود کاغذ کو دیکھ کر یکدم چونک کر بولا۔ ''یہ تم کس کاغذ کو پینٹ کر رہی ہو؟''
''دکھاؤ'' انسانوں کی طرح کاغذ اس کے ہاتھ سے لینے کے بجائے ریان نے جھپٹ کر کاغذ چھینا۔
''یہ کیا کر دیا ہے؟'' تقریباً دو گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد بننے والی میرین کے چھوٹے بھائی کے اسکیچ کو ''ڈریکولا'' بنا دیکھ کر وہ صدمے سے بولا۔
''ستیاناس ہو۔ میرین تمہارے فیشنز کا۔ تم نے کیا کر دیا ہے۔ میری تصویر کے ساتھ؟'' وہ جھنجلا کر بولا۔

☆☆☆

تھکے ٹوٹتے قدموں سے قریباً صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب چل کر وہ سفید گیٹ کے قریب پہنچی اور کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ گیٹ کھلنے کے انتظار میں وہاں کھڑی الماس کو یہاں آنے کا جذباتی فیصلہ اب حماقت لگ رہا تھا۔ اسے پچھتاوے نے آن گھیرا تھا۔ اگر انہوں نے اسے نہ رکھا تو وہ کہاں جائے گی؟ یہ سوچ کر ہی اسے ہول اٹھتے تھے۔
تقریباً سات منٹ بعد گیٹ کھلا اور اسی چوکیدار نے باہر جھانکا جو پچھلی دفعہ بھی وہاں موجود تھا۔
''کیا کام ہے بی بی؟'' وہ اپنے مخصوص کرخت لہجے میں پوچھنے لگا۔
''مجھے رانیہ بی بی سے ملنا ہے۔'' وہ بمشکل بول پائی تھی۔ بھوک، تھکاوٹ اور نیند سے اس کا برا حال تھا۔
''کس سلسلے میں؟'' وہ ہنوز اسی لہجے میں الماس سے مخاطب تھا۔
''مجھے ان سے کچھ کام ہے۔'' وہ اب منت کر رہی تھی۔
''خدا کے لیے مجھے ان کے پاس لے چلو۔'' چوکیدار کو غالباً اب اس پر ترس آ گیا تھا۔ اس نے راستہ چھوڑ دیا تو وہ اندر آ گئی۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔
چوکیدار نے اسے لان میں اسی جگہ پر بٹھا دیا جہاں دو برس پہلے بٹھایا تھا اور خود اندر رانیہ کو بلانے چلا گیا۔
الماس کو لگ رہا تھا جیسے ماضی خود کو دہرا رہا ہو۔ سب کچھ پہلے جیسا تھا حتیٰ کہ وہ لان اور چوکیدار بھی بس وہ بدل گئی تھی

اور اس کے ہمراہ آج اماں بھی نہیں تھی۔

''کون ہو تم؟''

الماس بری طرح چونک کر حقیقت حال میں واپس آئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے رانیہ کھڑی تھی۔

''میں...... میں الماس ہوں جی۔'' وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''صابرہ درزن کی بیٹی۔''

''کون صابرہ درزن؟'' رانیہ اچنبھے سے بولی۔

الماس کا تو سر چکرا کر رہ گیا۔ اس زاویے پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ رانیہ اس کو پہچاننے سے انکار کر دے گی۔

''بی بی جی! آپ نے میری ماں سے چادریں سلوائی تھیں یاد ہے آپ کو؟ آپ نے اماں کو چار ہزار روپیہ بھی دیا تھا۔''

رانیہ چند لمحے دماغ پر زور ڈالتی رہی پھر بولی۔ ''کب کی بات کر رہی ہو؟''

''دو ایک سال تو ہو گئے ہیں جی!''

''اوہ اچھا ہاں......'' رانیہ ہنس پڑی۔ ''یاد آ گیا۔''

''کہاں ہے تمہاری ماں؟''

''وہ مر گئی ہے جی......'' اگلے پندرہ منٹ میں الماس نے اپنی داستان (رمیز کے ذکر کے بغیر) اسے سنا ڈالی۔ اختتام یہ ہوا کہ فضل دین قاضی اور گواہان کو لے کر آ رہا تھا جب وہ گھر چھوڑ کر بھاگ آئی۔ یہ ان کئی غلط بیانیوں میں سے پہلی غلط بیانی تھی جو اس نے رانیہ کے ساتھ کی تھیں۔

''اوہ!'' رانیہ ہمدردی سے بولی۔ ''بہت افسوس ہوا جان کر۔''

''بی بی جی......! میرے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہیں ہے۔ مجھے اپنے گھر نوکرانی رکھ لو۔ میں کوئی تنخواہ نہیں لوں گی۔ بس مجھے رہنے کو جگہ دے دو۔ میں سارا کام کر لوں گی میں جھاڑو مار سکتی ہوں، کپڑے سی سکتی ہوں، کھانا بھا جی پکا سکتی ہوں۔''

''ارے ایک منٹ آرام سے بیٹا!'' رانیہ نے اسے چپ کرایا۔ ''کوئی بات نہیں۔ تم کوئی کام نہ کرو تب بھی بہت آرام سے ادھر رہ سکتی ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مشکل وقت کسی پر بھی آ سکتا ہے۔''

کچھ لوگ بولتے ہیں تو مخاطب کو لگتا ہے پھول جھڑ رہے ہیں۔ رانیہ کا انداز بھی ایسا ہی تھا۔

الماس کا وجود اس وقت ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ بے انتہا خوش تھی۔ ایک بھاری بوجھ کندھوں سے اتر کر اس کو ہلکا پھلکا کر گیا تھا۔

☆☆☆

محض ایک ہفتے کے لیے ہاسٹل میں رہنے کے بعد اس کی بے فکری زندگی میں کوئی خاص فرق تو نہ آیا مگر پچھلے دن پیش آنے والے ایک واقعہ نے اسے کم از کم یہ احساس دلا دیا کہ وہ کس قدر ''رحم دل'' ہے۔

ہوا کچھ یوں کہ اپنے کپڑے دھونے کے لیے وہ لانڈری روم میں لے گیا جہاں سٹوڈنٹس عموماً اپنے کپڑے دھلواتے تھے۔

باسکٹ سے تمام کپڑے اس نے تیسری قطار میں رکھی آخری واشنگ مشین میں الٹ دیے اور سرف وغیرہ ڈال کر بٹن گھما دیا اور خود کافی لینے کافی شاپ کی جانب چل دیا۔

کافی لے کر وہ لانڈری روم میں داخل ہوا تو کاؤنٹر پر بیٹھی مسز ڈیمن نے کچھ تلملا کر اسے دیکھا۔ لانڈری روم میں کھانا پینا منع تھا اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا مگر ''وائلیشن آف لاء اینڈ آرڈرز'' میں جتنا لطف ریان حیدر کو آتا تھا اس کا اندازہ مسز ڈیمن نہیں کر سکتی تھی۔ اس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ہاتھ میں کافی کا کپ پکڑے وہ لڑکا، اپنی کلاس کا سی آر ہونے کے ساتھ ساتھ فٹ بال ٹیم کا کیپٹن، ڈرامیٹک سوسائٹی کا ایڈمنسٹریٹر اور ایک Bully بھی ہے، جس کے باپ کی پرنسپل صاحبہ سے اچھی خاصی جان پہچان ہے۔ اب وہ اس کو کس منہ سے کافی نہ پینے کا کہتی۔

ریان نے اس کی نگاہوں کے جواب میں کچھ چڑ کر اسے دیکھا اور کفن پھاڑ لہجے میں پوچھا ''کیا ہے؟''

مسز ڈیمن بنا کچھ بولے جھک کر اپنا کام کرنے لگی۔

وہ لاپروائی سے آگے بڑھا اور تیسری قطار میں رکھی آخری واشنگ مشین کے پاس آ گیا مگر یہ دیکھ کر اسے جھٹکا لگا کہ اس کے گیلے کپڑے کسی نے مشین سے نکال کر بے دردی سے نیچے پھینکے ہوئے تھے۔

وہ ایک چھوٹے قد کا، دبلا پتلا، بلونڈ لڑکا تھا (اور غالباً دو تین سال جونیئر بھی تھا) جس نے تمام واشنگ مشینز مصروف دیکھ کر آخری والی میں سے کپڑے نکال کر باہر پھینک دیئے تھے اور اپنے کپڑے دھلنے کے لیے مشین میں ڈال دیے تھے۔ ریان کا پارہ چڑھانے کو یہی کافی تھا۔

''میرے کپڑے باہر کس نے پھینکے ہیں؟'' وہ غرایا۔

اپنے سامنے ایک لمبے چوڑے سینئر کو بیخ پا دیکھ کر اس کی تو گھگی بندھ گئی۔ وہ ریان کو ''بلی'' ہونے کے ناتے سے پہچان گیا تھا فوراً ہڑبڑا کر بولا۔ ''پتا نہیں۔''

''تم نے کسی کو میرے کپڑے نکالتے نہیں دیکھا؟''

''نن نو۔'' وہ گھبرا کر بولا۔ ریان کو اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ یہ حرکت اسی گدھے کی تھی، مگر وہ پھر بھی بولا۔

''چلو، ایسا کرو، یہ مشین بند کر کے کپڑے باہر نکالو، میرے کپڑے اندر ڈالو اور اس ڈگ ہیڈ کے کپڑے لے کر میرے پیچھے آؤ۔''

اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وہ لڑکا اپنے کپڑے باسکٹ میں ڈال کر ریان کے پیچھے باہر آ گیا۔

''یہ سارے کپڑے برف پر پھینک دو، سوائے اس شرٹ کے جو سب سے اچھی ہو۔''

اس نے ویسا ہی کیا اور ایک سفید رنگ کا پل اوور نکال کر ریان کو تھما دیا۔ ریان نے کپ میں بچی کافی اس پل اوور پر گرائی اور اسے بھی برف پر پھینک دیا۔

''تم اچھے لڑکے ہو۔ بات مانتے ہو۔ نیکسٹ فرائیڈے آڈیٹوریم میں مجھ سے ملنا، میں تمہیں اپنے نئے

پلے''دی ساؤنڈ آف میوزک'' میں کاسٹ کرلوں گا۔تمہیں بس اتنا کرنا ہوگا کہ دو تین گھنٹے تک یہاں پہرہ دو۔ میں نہیں چاہتا وہ ایڈیٹ اپنے کپڑے لے جائے۔ میں صبح آ کر دیکھوں گا، یہ کپڑے یہیں ہونے چاہئیں۔'' اس کو ضروری ہدایات دے کر وہ واپس ہاسٹل کی طرف چلا گیا۔

اگلے جمعہ وہ لڑکا اس سے ملنے آیا تھا اور ریان نے اسے پلے میں کاسٹ کرلیا تھا۔ اتنا بھی ''بے رحم'' نہیں تھا وہ کہ بچے پر ''ترس'' نہ کھاتا۔

☆☆☆

وہ گھر جس طرح عجیب تھا اسی طرح اس کے مکین بھی عجیب تھے۔

کبھی وہ سوچتی تھی یہ لوگ کتنے مزے سے رہ رہے ہیں، نہ کھانے کا غم، نہ روزی کی فکر، ہر آسائش گھر کی لونڈی اور ہر شے دستیاب، من پسند کھانا، من پسند لباس، ہر چیز خوب صورت و سجی سنوری اور کسی چیز کی کوئی کمی نہیں۔

چاروں طرف سے لان میں گھری محل نما کوٹھی سب سے خوبصورت و منفرد چیز بیک سائیڈ پر بنا سوئمنگ پول تھا، فرنٹ پر بنا فوارہ تھا، یا لاؤنج میں بنی سیڑھیاں تھیں۔

ہر کمرے میں قیمتی سے قیمتی پردے، پرتعیش فرنیچر و قالین، خوب صورت ڈیکوریشن، مہنگی پینٹنگز قد آور ...وں سے باہر کے دکھائی دینے والے دل فریب مناظر غرض اس پر آسائش ماحول میں الماس کو اپنا وجود نہایت ... حقیر اور کم تر محسوس ہوتا تھا۔

مگر ایک تصویر دیکھ کر ہونے والا احساس قدرے منفرد سا تھا وہ تھا ''ریان عظیم حیدر'' جس کی ایک فوٹو سے اسے انسیت ہو چکی تھی۔

اس گھر میں ہر قیمتی چیز موجود تھی مگر چند ہی دنوں میں اسے احساس ہو گیا کہ ایک کمی تھی۔ اس گھر میں ''تصویریں'' تھیں، جیتے جاگتے انسان نہیں۔

علی، ریان اور رانیہ باہر پڑھتے تھے، جبکہ ماں باپ کے ساتھ چھوٹے بچے ہوتے تھے۔ عظیم مہینہ کا آدھا حصہ باہر اور باقی نصف کا تین چوتھائی آفس میں گزارتے تھے۔ گھر کو دینے کے لیے ان کے پاس وقت بہت کم ہوتا تھا۔ وہ ایک بہت ہینڈسم اور باوقار شخص تھے۔ الماس سے ان کا سامنا اس گھر میں تقریباً چھ ماہ گزارنے کے بعد محض تین دفعہ ہوا تھا۔ وہ بہت اچھی طرح بات کرتے تھے، حال احوال پوچھتے، موسم پر ایک دو باتیں ہو جاتیں اور بس! وہ یا تو اپنے کمرے میں چلے جاتے، یا سٹڈی میں۔ ان چند لمحوں میں، جو اہمیت الماس کو ملتی، وہ اسی پر پھولے نہ سماتی۔

جو چیز اسے ان کے بارے میں بے حد متاثر کرتی تھی وہ ان کا ہر بات پر خدا کا شکر ادا کرنا، رحم دلی و نرم دلی، تحمل مزاجی، درگزر کرنا، اور مسکرا کر نرمی سے بات کرنا تھی۔ اس کو نہیں یاد کہ کبھی اس نے رانیہ کو کسی کی برائی کرتے دیکھا ہو یا عظیم کو کسی کا مذاق اڑاتے سنا ہو۔ جتنا ان کا گھر خوب صورت تھا، اتنے ہی خوب صورت وہ لوگ اندر باہر سے تھے۔

یہ رانیہ ہی تھی جس نے الماس سے پرائیویٹ میٹرک اردو میڈیم میں کروایا اور الماس نے بخوشی (گزارے

لائق نمبر لے کر) امتحان پاس کرلیا۔ وہ انگریزی اب بمشکل پڑھ لکھ تو لیتی تھی لیکن بولنے میں خاصی دشواری کا سامنا تھا۔ دوسرے اس کا حلیہ ویسا ہی تھا جیسے گنوار اور اجڈ الماس کا ہوتا تھا۔ وہی لٹھ مار انداز، میلا لباس، الجھے بال، دھوپ سے کملایا ہوا چہرہ اور قدرے فربہی مائل جسم۔ کچھ وہ پہلے بھاری تھی اور کچھ رانیہ عظیم کے گھر کی اچھی غذا نے کر دیا تھا۔ گال، کندھے اور بازو کچھ زیادہ ہی بھر گئے تھے اور چہرے پر چربی چڑھنے سے یہ ہوا کہ اس کے رہے سہے نقوش گم ہوگئے۔ اگر وہ پہلے ''کچھ'' خوب صورت تھی، تو اب تو بالکل بھی نہ رہی تھی۔

میٹرک کروانے کے ساتھ ساتھ رانیہ نے اسے بوتیک پر بھی لگا دیا جو اس کا دل پسند کام تھا۔

☆☆☆

جس روز رانیہ پہلے دفعہ اسے بوتیک پر لے کر گئی وہ اس کی زندگی کا ایک خوب صورت دن تھا۔ روشنیوں سے جگمگاتا بوتیک اسے بہت پسند آیا تھا۔ وہ اتنا بڑا تو نہیں تھا، مگر ڈیکوریشن میں اپنی مثال آپ تھا۔

گو کہ الماس کو صابرہ نے کپڑے سینے سکھائے تھے مگر رانیہ کے ہاں کام کرنے والی لڑکیوں نے ایک دفعہ پھر ٹریننگ دی۔ بمشکل تین ہفتے بعد وہ ہر قسم کا کپڑا مہارت سے سینے میں ماہر ہوگئی تھی۔ اسے پتہ چل گیا تھا دبکا، مڑوڑی اور زردوزی کا کام کیسے کرتے ہیں۔ ریشم کا کام، بیڈ ورک، دھاگوں کا کام، کڑھائیاں، موتی لگانا، شیشے اور پتھروں کو کپڑوں پر سجانا، غرض وہ ہر کام میں طاق ہوگئی تھی۔

الماس، رانیہ کے گھر سرونٹ کوارٹرز میں رہتی تھی۔ وہ ناشتے کے بعد صبح نو بجے کے قریب ڈرائیور کے ساتھ بوتیک جاتی اور عصر کی نماز کے بعد اس کی واپسی ہوتی۔ یہ رانیہ ہی تھی جس نے اس کو نماز اور قرآن کی تعلیم دی تھی۔ گھر آ کر وہ برتن دھوتی، کھانا پکانے میں کک کی مدد کرتی، لان میں پودوں کو پانی لگاتی اور اس کے علاوہ اگر کوئی اور کام ملتا تو وہ کر لیتی۔ صبح بوتیک جانے سے پہلے بھی وہ ڈسٹنگ اور جھاڑ پونچھ کر کے جاتی تھی۔ ان تمام کاموں کی اجرت کے طور پر رانیہ اسے ساڑھے تین ہزار ماہوار اور روٹی کپڑا دیتی تھی۔ پیسے خرچ کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ اسی لیے وہ تمام رقم اس کے پاس جوں کی توں محفوظ تھی۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ کچھ دیر تو وہ بیٹھی نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی رہی، رانیہ فون اٹینڈ کرنے کے لیے وہاں موجود نہ تھی تو چار و ناچار اسے اٹھنا ہی پڑا۔

''سلام علیکم جی۔'' وہ اپنے ازلی جاہلانہ انداز میں اونچی آواز سے ریسیور میں بولی جیسے مخاطب کو آواز تاروں کے ذریعے نہیں ہوا کے ذریعے جاتی ہے۔

''وعلیکم سلام جی۔'' کوئی اسی کے انداز میں بولا۔

''کس سے بات کرنی ہے جی؟''

''آپ اتنا اونچا بولیں گی تو میں بہرہ ہو جاؤں گا جی!'' وہ اردو، انگریزی لہجے میں اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔

''اوہ اچھا۔'' وہ کچھ والیوم کم کرتے ہوئے بولی۔ ''پر آپ کون ہیں اور کس سے بات کرنی ہے؟''

''پہلے آپ بتاؤ کہ آپ کون ہو۔ آئی مین میں نے آپ کی آواز اس نمبر پر پہلے کبھی نہیں سنی۔'' وہ جو بھی تھا اس کے برعکس انتہائی مہذب لب و لہجے میں بول رہا تھا۔

''میں الماس ہوں، پر آپ کون ہو؟'' وہ کچھ تنک کر بولی۔

''الماس کون؟'' وہ معاملے کی تہہ تک پہنچے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔

''میں جی وہ ادھر کام کرتی ہوں، رانیہ بی بی کے پاس۔ ان کے بوتیک پر۔'' وہ بتانے لگی۔

''اچھا، میں رانیہ بی بی کا بیٹا بول رہا ہوں نیو کاسل سے۔'' اس کی بات پر الماس نے فوراً کہا۔

''آپ علی صاب ہو؟''

''نہیں، میں ریان صاب ہوں'' وہ شریر لہجے میں بولا۔ سیریس ہونا تو اسے آتا نہیں تھا۔

''ر...... ریان صاب؟'' اس کا سانس اٹکنے لگا تھا۔

''جی جی جی۔'' وہ اس کی نقل کرتے ہوئے بولا تو الماس نے کچھ خفگی سے کہا ''میرا مذاق تو مت اڑائیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے نہیں اڑاتا آپ کا مذاق'' وہ تکیے پر سر رکھتے ہوئے بولا۔ فارغ ہی بیٹھا تھا، سوچا کہ مما کو فون کرلیا جائے مگر نجانے کیوں فون اٹھانے والی شخصیت میں کچھ کشش سی محسوس ہوئی تھی۔

''میری مما ہیں گھر پر؟'' اس کے پوچھنے پر الماس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

''وہ تو ڈھائی گھنٹے تک آئیں گی۔'' الماس کے بتانے پر اسے کچھ مایوسی سی ہوئی تھی۔

''اچھا۔'' وہ شاید کچھ سوچ رہا تھا۔

''پھر آپ کچھ دیر میں کر لیجیے گا فون۔'' وہ شاید سلسلہ منقطع کرنا چاہ رہی تھی۔

''نہیں نہیں۔'' وہ فوراً بولا۔ ''پلیز میں بہت بور ہو رہا ہوں، کچھ دیر بات کر لو۔'' الماس نے ہاتھ میں پکڑے ریسیور کو گھورا۔ ''میں کیا بات کروں جی؟''

''کچھ بھی اگر فارغ ہو تو۔'' اسے اب الماس سے بات کرنے میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

''جی فارغ ہوں۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ریان سے بات کر رہی ہے۔

''اچھا تمہیں انگلش آتی ہے تو انگلش میں بات کر لیتے ہیں، مجھ سے اردو نہیں بولی جاتی۔'' وہ معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

''پڑھنی آتی ہے، بولنی نہیں۔'' اسے پہلی دفعہ اپنی کم تعلیم پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

''اوکے، کچھ نہیں ہوتا۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

''یہ بتاؤ تمہاری عمر کیا ہے؟''

''ساڑھے پندرہ سال۔''

''اچھا؟'' اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ ''میں تم سے بڑا ہوں اس کا مطلب ہے۔ ویسے میں ایٹین کا ہونے والا ہوں۔''

"کیا ڈیٹ آف برتھ ہے آپ کی؟" اب اتنی انگریزی تو اسے آتی ہی تھی۔

"نو تمبر۔" وہ بتانے لگا "اور تمہاری؟"

"یکم اپریل۔" اسے اماں نے بتایا تھا کہ یہ اس کی تاریخ پیدائش ہے۔

"واٹ؟" وہ اچھل پڑا۔ "تم آل فولز ڈے کو پیدا ہوئی تھیں؟"

"جی؟" وہ مطلب سمجھ نہیں پائی تھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ بدستور ہنس رہا تھا۔

"آپ کو ہنسنا ہے تو میں فون رکھ رہی ہوں۔" وہ خفگی سے بولی۔

"اوہ نو...... پلیز نہیں میں صرف مذاق کر رہا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ پڑھتی ہو؟"

"میں میٹرک پاس ہوں۔" اس کے لہجے میں فخر تھا۔ "اور آپ؟"

"میں GSE کر رہا ہوں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"کیا؟"

"نہیں، میں بارہویں کلاس میں ہوں۔"

"میں نے آپ کی، میرا مطلب ہے آپ لوگوں کی تصویریں دیکھی ہیں۔" وہ ٹھیک سے اس کی باتیں نہیں سن رہی تھی۔ وہ اس کی شوخ اور چلبلی آواز کے سحر میں کھوئی تھی۔

"میری تصویر دیکھی ہے؟" وہ پر اشتیاق لہجے میں پوچھنے لگا تو الماس کا دل چاہا کہ کہہ دے "جی صاب آپ کی تصویر ہی تو دیکھی ہے۔"

"جی دیکھی ہے۔" وہ بات کرنے کے ساتھ ساتھ دروازے کی جانب بھی دیکھ رہی تھی کہ کہیں رانیہ یا عظیم میں سے کوئی نہ آ جائے۔

"کیسی لگی؟" وہ پوچھ رہا تھا اور وہ اس کے تخیل میں گم تھی۔

یہ وہ پہلی ٹیلی فونک گفتگو تھی جو ان دونوں کے درمیان ہوئی۔ اس پہلی ہی گفتگو میں وہ لوگ تقریباً آدھا گھنٹہ باتیں کرتے رہے۔ اس نے الماس کو اپنی پسند ناپسند کے متعلق آگاہ کیا، اپنے گھر والوں کے بارے میں تفصیلی بتایا، اپنے گھر، کزنز اور فرینڈز کی شرارتوں کے بارے میں مزے لے لے کر اسے سب کچھ بتایا۔ اس کی آواز اتنی خوب صورت تھی کہ وہ یہ بات اس سے کہے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ یہ سن کر بہت ہنسا تھا۔

فون بند کرنے سے پہلے اس نے الماس کو تاکید کی تھی کہ وہ کل اسی ٹائم اس کو فون کرے گا اسے فون کے آس پاس ہونا چاہیے۔

"مجھے تو تم نے دیکھا ہی ہوا ہے مگر میں نے تمہیں نہیں دیکھا اسی لیے بتاؤ کہ تم کیسی ہو؟" تیسری ٹیلی فونک گفتگو میں اس کے پوچھے گئے سوال پر الماس سوچ میں پڑ گئی۔

"میرا رنگ گورا ہے، بال کالے ہیں، چہرہ بیضوی ہے اور آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی ہیں۔" یہ اس کا خیال

تھا کیونکہ اس نے خود کو غور سے شیشے میں عرصہ ہوا نہیں دیکھا تھا۔

''اوہ...گریٹ؟'' اس نے بے اختیار سراہا تھا۔ اپنی تمام تر ''صفات'' کے باوجود وہ بلا کا خوب صورتی سے مرمٹنے والا لڑکا تھا۔

''آپ پاکستان کب آئیں گے؟'' وہ کئی دنوں سے اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔

''جب آپ کہیں۔'' وہ بہت جلدی اور انتہائی خوب صورت جواب دیتا تھا۔ الماس اس حاضر جوابی سے گھبرا جاتی۔

☆☆☆

''تمہارا پسندیدہ کلر کیا ہے؟'' ایک دن وہ یونہی اس سے پوچھنے لگا۔

''سبز'' اسے یاد آیا اسے ریان کا پسندیدہ رنگ نہیں معلوم تھا ''آپ کا؟''

''پنک اور لائٹ بلیو اگر لڑکی کی شکل سڑے ہوئے چوہے جیسی بھی ہو تب بھی پنک کے ہر شیڈ میں اچھی لگتی ہے اور لڑکے اسکائی بلیو میں۔''

''آپ کو آگے کیا کرنا ہے؟'' اس کا خیال تھا وہ عظیم کا بزنس میں ہاتھ بٹائے گا۔

''مجھے آرٹسٹ بننا ہے۔ مجھے پینٹنگ کرنا بہت پسند ہے۔'' اس کے جواب پر الماس کو مایوسی ہوئی تھی۔

''کیا پینٹ کرنا؟''

''انسان کو پینٹ کرنا۔'' نجانے کیوں الماس کو لگا وہ اس سوال پر تھوڑا سا گڑبڑا گیا ہے مگر اس نے زیادہ محسوس نہیں کیا۔

''آپ میری شکل بھی بنائیے گا۔'' اسے آرٹ میں کوئی دلچسپی نہ تھی مگر ریان کے ہاتھوں سے اپنی تصویر بنوانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا۔

''پہلے میں سیکھ تو لوں۔''

''کہاں سے؟'' الماس کے خیال میں وہ آرٹسٹ بن چکا تھا۔

''فرانس میں ایک انسٹی ٹیوٹ ہے، وہاں سے، ہے تو ایک شکاگو میں بھی مگر میں پیرس کو اس لیے ترجیح دیتا ہوں کیونکہ وہاں میرے کزنز رہتے ہیں۔''

''آپ نے اس دن بتایا تھا آپ کے کزنز عیسائی ہیں؟'' الماس کو یہ بات بہت عجیب لگتی تھی۔

''ہاں تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ وہ میرے مذہب کی ریسپیکٹ کرتے ہیں اور میں ان کے مذہب کی اور بائی داوے میں ساری نمازیں پڑھتا ہوں مگر وہ لوگ چرچ بہت کم جاتے ہیں بلکہ یہ تو بالکل بھی نہیں جاتے، کیونکہ ان کی فیملی اتنی مذہبی نہیں ہے البتہ کنزرویٹو ضرور ہے۔'' پھر وہ تفصیلاً اسے بتانے لگا۔

''میری مما ہیں نارانیہ، وہ اصل میں پہلے کرسچن تھیں۔ ڈیڈ سے شادی کرنے کے بعد وہ مسلمان ہوئی تھیں۔ مما لوگ چھ بہن بھائی ہیں۔ سب سے بڑے میرے ماموں ہیں جو پیرس میں ہوتے ہیں۔ میرین اور

چک ان کے بچے ہیں۔ پھر مما ہیں، اس کے بعد میری ایک خالہ ہیں وہ میلبورن میں ہوتی ہیں۔ وہ ان میرڈ ہیں۔ پھر میری دو خالہ ٹوئنز ہیں۔ ایک کی دو بیٹیاں ہیں، اینجلینا اور کرسٹینا۔ کرس کی شادی ہوگئی ہے وہ امریکہ میں ہوتی ہے جبکہ اینجلینا میرے ساتھ پڑھتی ہے۔ دوسری خالہ کا بس ایک بیٹا ہے، ڈینی۔ وہ لوگ بھی فرانس میں ہوتے ہیں۔ میرین کے ابو نے اسے ایک فلیٹ لے کر دیا ہوا ہے، ادھر ہی نیوکاسل میں۔ اینجلینا اور اس کے پیرنٹس کے ساتھ ڈینیئل رہتا ہے۔ میرین کا فلیٹ بھی اسی کاؤنٹی میں ہے۔''

''اسی کس میں ہے؟'' الماس نے مداخلت کی۔

''کاؤنٹی میں یعنی کہ یوں سمجھ لو کہ'' اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ اسے کس طرح سمجھائے۔ ''جیسے ایک شہر میں مختلف علاقے ہوتے ہیں، اسی طرح۔''

''جی اچھا۔'' سمجھ میں آیا یا نہیں، اس نے فوراً کہہ دیا۔ ''پھر آپ فرانس چلے جائیں گے؟''

''ہوں۔'' اس نے الماس کی تائید کی۔

''ایک بات تو بتائیں۔ یہ انیہ آپ کی کیا لگتی ہے؟'' تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''انیہ؟ وہ ہماری کزن ہے۔ میری بہن ہے مگر باقیوں کی کزن ہے۔'' اس مبہم جواب پر الماس کو حیرت ہوئی تھی۔ ''کیا مطلب؟''

''وہ میری فاسٹ سسٹر ہے۔ اصل میں اس کی مما اور میری مما فرسٹ کزنز تھیں۔ جن دنوں میں بہت چھوٹا تھا، میری مما کی خرابی طبیعت کے باعث مجھے انیہ کی مما نے فیڈ کرایا تھا اس طرح میں اور انیہ بہن بھائی ہیں۔''

''بہت پیاری ہے آپ کی بہن، بہت معصوم سی۔'' وہ کہنے لگی۔

''میرا خیال ہے تم اسے جانتی نہیں ہو۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا ''وہ ہم میں سب سے زیادہ چالاک، ہوشیار اور تیز ہے۔ اس سے بچ کر ہی رہنا۔''

''خیر، وہ تو یہاں ہے ہی نہیں۔'' اس نے قدرے لاپروائی سے کہا۔

☆☆☆

ان دنوں اگر اسے کسی چیز کا ہوش تھا تو وہ ریان اور بس ریان تھا۔ پہلی ہی گفتگو میں اس نے الماس کو بتا دیا تھا کہ وہ اسے ''دوست'' بنانے کا خواہش مند ہے، مگر الماس شاید اس کا مطلب نہیں سمجھی تھی۔

اسے یہ احساس بالکل بھی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جو کر رہی ہے، وہ سراسر غلط ہے۔ اس کے اور ایک سات سمندر پار رہنے والے شخص کے ذہن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ وہ بری طرح ایک انجان شخص کی محبت میں گرفتار ہوگئی ہے اور شاید اب سے نہیں، بہت پہلے سے ہے۔ ڈھائی برس پہلے سے۔

اس کا خیال تھا جس طرح وہ ریان کے فون کا انتظار کرتی ہے، اسی طرح وہ بھی اس سے بات کرنے کو بے چین رہتا ہوگا۔

☆☆☆

اس نے دھیرے سے دروازہ بجایا۔

''یس!'' عظیم صاحب کی بھاری، گمبھیر آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ آنچل سنبھالتی، کافی کا کپ مضبوطی سے تھامے دروازہ دھکیل کر اندر سٹڈی میں داخل ہوگئی۔

''سر! یہ آپ کی کافی۔'' وہ کافی کا کپ ان کے سامنے میز پر رکھ کر بولی۔

''یہ کس نے بنائی ہے؟'' وہ جانے ہی لگی تھی کہ ان کی آواز اپنے عقب پر سنائی دی تو وہ چونک کر پلٹی۔

''آ......وہ میں نے بنائی ہے۔'' اس نے شرمندگی سے سر جھکا کر کہا۔

''بہت اچھی ہے یہ تو۔'' اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ تعریف کر رہے تھے۔

''رانیہ بتا رہی تھی کہ آپ بہت اچھی اسٹچنگ (سلائی) کرتی ہو۔'' وہ فائل پر سے سر اٹھا کر شفیق انداز میں کہنے لگے تو اس کے پورے وجود میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

''وہ......سر! بس کر لیتی ہوں۔'' وہ اسی عاجزی سے بولی جو ہر بندہ تعریف سننے پر کہتا ہے، چاہے اندر سے دل بلیوں اچھل رہا ہو۔

''کوئی پرابلم تو نہیں ہے نا یہاں؟'' یہ سوال رانیہ بھی کئی دفعہ کرتی تھی اور وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتی، جو حقیقت پر مبنی ہوتا تھا۔

''نہیں سر! میں تو یہاں بہت خوش ہوں۔''

''میں نوٹ کر رہا ہوں، تھوڑی تھوڑی موٹی ہوتی جا رہی ہو۔'' وہ بے اختیار ہنس دی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مذاق کر رہے ہیں۔

''ویسے سر! آپ سے ایک بات پوچھوں؟'' یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ ان سے یوں براہ راست اتنی زیادہ باتیں کر رہی تھی۔

''ہاں شیور، پوچھو۔''

''سر! آپ اپنے بچوں کو مس نہیں کرتے؟'' یہ نیا لفظ تھا جو اس نے دو روز پہلے سنا تھا۔

''ہاں کرتا تو ہوں، لیکن ان کے اچھے مستقبل کے لیے قربانی دینا پڑتی ہے۔''

''سب سے زیادہ کس کو یاد کرتے ہیں؟'' وہ لہجے میں اشتیاق بھرے پوچھنے لگی۔

''سب سے زیادہ؟'' وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ''انیہ کو۔''

''انیہ کو؟'' اسے حیرت ہوئی کیونکہ وہ ان کی اپنی بیٹی نہیں تھی۔

''مجھے سب سے زیادہ محبت اسی سے ہے، شاید اسی لیے کہ وہ مجھ پر گئی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''اچھا!'' اسے حیرت ہوئی تھی۔

''اس نے تمام عادتیں مجھ سے لی ہیں۔ ذہانت، سوجھ بوجھ، معاملہ فہمی، یہ سب اس نے مجھ سے لیا ہے اور میرے بچوں میں واحد وہی ہے جو مجھ پر گئی ہے۔''

''اور باقی بچے؟'' یونہی پوچھتے ہوئے اس کے دل میں ایک احساس ندامت جاگا تھا کہ وہ ان کے اعتماد کو دھوکہ دیتے ہوئے فون پر ان کے بیٹے سے باتیں کرتی رہی ہے۔

انہوں نے گہرا سانس لیا۔''علی تھوڑا بہت مجھ پر گیا ہے ویسے وہ کافی ذہین ہے لیکن زیادہ چیزیں اس نے اپنے چچا زلفی سے لی ہیں۔ شکل تو بالکل ہی زلفی والی ہے اور عقل بھی، ویسے میرا سب سے زیادہ سمجھ دار بیٹا علی ہے۔''

''اور ریان؟'' اس کے لبوں سے بے اختیار ہی پھسل پڑا۔

''ریان زیادہ سمجھ دار تو نہیں ہے، اسے بس باتیں بنانا آتی ہیں۔ ریان کے پاس ہر بات کا جواب ہوتا ہے اور ایک فرنچ دانشور نے کہا تھا ''جس شخص کے پاس ہر بات کا جواب ہو اس سے بڑا احمق اور نرا جاہل کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' ریان جو دیکھتا ہے اسی کو سچ سمجھ لیتا ہے۔ وہ گہرائی میں نہیں جاتا۔ خیر چھوڑو۔ میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ اتنا سارا کام کرنا ہے، تمہارے بھی کام کا حرج ہو رہا ہوگا۔''

''آ......جی۔'' وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، مگر ریان کے لیے یہ کمنٹس سن کر اسے پتا نہیں کیوں اچھا نہیں لگا تھا۔

☆☆☆

رانیہ کے کسی دوست کے ایجنسی میں تیار ہونے والے دو ڈریسز کی وجہ سے وہ دن بھر بے حد مصروف رہی۔ شام کو جب معمول سے کافی لیٹ گھر پہنچی تو خوب ڈھیر سارا کھانا کھا کر آرام سے اپنے کوارٹر میں جا لیٹی اور پھر تھکاوٹ سے چور ایسی سوئی کہ صبح نو بجے کے قریب بمشکل آنکھ کھلی۔ وہ یونہی بغیر ہاتھ منہ دھوئے کوٹھی کی طرف چل پڑی۔

کچن میں رانیہ سے سامنا ہوا تو حال احوال پوچھنے کے بعد رانیہ نے اسے چائے کا کپ تھما کر جب یہ کہا'' کہ جاؤ، کارنر والے کمرے میں جا کر ریان کو بیڈ ٹی دے آؤ اور اس سے کہو کہ جلدی ناشتے پر پہنچے۔''

الماس نجانے کتنی ہی دیر ہکا بکا رانیہ کا چہرہ دیکھتی رہی، پھر اپنے دل کی بے قابو ہوتی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے چائے لے کر اس کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

ایک دفعہ ہلکے اور دوسری دفعہ قدرے زور سے دروازہ بجایا تو اندر سے اس کی خمار آلود آواز سنائی دی۔''میں سو رہا ہوں، اس لیے مجھے اٹھانے کی غلطی مت کرو۔''

اس کے لبوں پر ایک مسکان بکھر گئی۔ وہ دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور چائے کا کپ اس کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''چائے سر!'' وہ عظیم کو سر کہتی تھی اسی مناسبت سے اس کو بھی سر ہی کہا۔

''میں سو رہا ہوں۔'' کمبل کے اندر سے آواز آئی۔ اس کا ایک بازو باہر تھا اور براؤنش بلیک بال تھوڑے بہت نظر آ رہے تھے۔ وہ غالباً اوندھے منہ پر سویا پڑا تھا۔

''میڈم کہہ رہی ہیں، جلدی سے ناشتے پر آ جائیں۔''

ریان نے ایک جھٹکے سے کمبل اتارا اور سیدھا ہو کر اس کی طرف نیند سے بھری آنکھوں سے دیکھا۔''کیا ہے؟''

''آپ کو میڈم ناشتے پر بلا رہی ہیں۔'' اس نے اپنی بات دہرائی۔

''کون سی میڈم؟ اچھا مما کہو آ رہا ہوں۔'' اس کی بات سن کر وہ پلٹ کر جانے ہی لگی تھی ریان نے پکارا۔

''ایکسکیوز می مس۔''

وہ مڑی۔ ''جی؟''

''آپ کی تعریف؟'' وہ آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

''جی میں الماس ہوں۔'' اس کے یوں دیکھنے پر وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

''الماس!'' اس کی آنکھوں سے نیند ایک دم غائب ہوگئی اور اس نے بڑے غور اور اشتیاق سے الماس کا جائزہ لیا۔ الماس کچھ شپٹا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی اور اسی لیے ریان کے چہرے پر پھیلنے والی مایوسی نہ دیکھ سکی۔

''مما سے کہو میں آ رہا ہوں۔'' نارمل لہجے میں کہتے ہوئے وہ بستر سے نکل کھڑا ہوا۔ خود کو سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں بھی نارمل کر لینے کا فن اس نے اپنی ماں سے سیکھا تھا۔ اس کی بات سن کر اس نے سر ہلا دیا اور کمرے سے نکل گئی۔

جب رانیہ اور عظیم ہوتے تھے تو وہ عموماً ڈائننگ ہال میں ناشتہ یا کھانا وغیرہ کھاتے تھے مگر آج وہ لوگ امریکن اسٹائل کچن میں موجود سینٹرل ٹیبل کے گرد جمع تھے۔

جس وقت وہ کچن میں داخل ہوئی، عظیم اور رانیہ وہیں موجود تھے۔ انیہ بھی غالباً کل ہی آئی تھی وہ ناشتہ بنانے لگ گئی کیونکہ ان دونوں کی گفتگو انگلش میں ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کچن میں کوئی داخل ہوا تو وہ ریان سمجھ کر پلٹی، مگر وہ ریان نہیں علی تھا۔ الماس کچھ دیر تو سانس لینا ہی بھول گئی۔

اتنا وجیہہ شخص اس نے پوری زندگی میں پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ سیاہ بال، سیاہ آنکھیں، مغرور نقوش اور بے حد ہینڈسم، وہ آتے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

ریان ذہین تھا، مگر کسی غیر معمولی اکیڈمک ریکارڈ کا حامل تھا نہ ہی جینیس تھا۔ اس کا فن فٹ بال کھیلنے کا کوئی ڈراما ڈائریکٹ کرنے میں یا سکول میں bullying کرنے میں نظر آتا تھا۔ اگر کسی اور چیز میں ریان کو ملکہ حاصل تھا تو وہ حاضر جوابی اور حسِ مزاح تھی۔

ریان کی ایک اور خوبی بھی تھی جو اس نے اپنی ماں سے لی تھی۔ ''مسکرانا۔''

رانیہ کہتی تھی ''اگر انسان کسی کو دیکھ کر مسکرا دے تو کلفت دور ہو جاتی ہے۔ دکھی سے دکھی انسان بھی مسکرائے تو اس کی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔''

علی، عظیم سے باتوں میں مگن تھا جب سویا سویا چہرہ لیے ریان اندر داخل ہوا۔

''صبح ہوگئی میرے بیٹے کی؟'' عظیم کے کہنے پر اس نے قدرے منہ بسور کر فریج میں کچھ کہا جو الماس کے پلے نہ پڑا۔

''علی! تم آفس چل رہے ہو، میرے ساتھ؟''

''جی بالکل۔'' علی صرف باپ کی مانتا تھا۔

عظیم نے اب ریان کی جانب دیکھا ''اینڈ یو؟''

ریان کچھ کھسیانا سا ہو کر مسکرا دیا۔ ''میں چلا گیا تو مما اکیلی ہو جائیں گی۔''

''مما کو اکیلے میں بالکل ڈر نہیں لگے گا۔'' انیہ نے منہ چڑا کر کہا۔

ریان کچھ جھینپ کر ''فرفر'' انگریزی میں بقول الماس کے گٹ پٹ کرنے لگا اور وہ کوئی ایک لفظ بھی سمجھنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔

کچھ دیر تو علی مٹھیاں بھینچے برداشت کرتا رہا، پھر ناگواری سے بولا ''چپ کرو۔''

''وائے؟'' ریان حیرت سے پوچھنے لگا۔

''مجھے تمہاری انگلش نہیں سننا۔''

''تمہیں کیوں میرے ایکسنٹ سے چڑ ہے؟''

''یہ کوئی ایکسنٹ ہے؟ ہونہہ، پاگل ہے پورا برٹن یہ fink اور fank you والی زبان میرے کانوں میں تیر کی طرح چبھتی ہے۔'' علی ریان کے think اور Thank you بولنے کے انداز کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔

''ڈیڈ!'' ریان نے احتجاجاً عظیم کی طرف دیکھا۔

''علی!'' عظیم نے اسے ٹوکا۔

''الماس! یہ برتن دھو دو۔'' رانیہ نے چند ڈشز اٹھا کر اس کے آگے سنک میں رکھ دیں اور خود خاموشی سے ناشتہ لگانے لگی۔

الماس کو اس لمحے اپنی حیثیت کا اندازہ ہوا تھا۔ وہ ایک نوکرانی تھی اور شاید یوں ہی ساری زندگی لوگوں کے برتن دھوتی رہے گی۔

البتہ شام کو جب ریان نے اسے کچھ دیا تو وہ حیران رہ گئی۔ بہت عام سے انداز میں ریان نے اسے بتایا تھا کہ یہ وہ اس کے لیے لایا ہے۔

وہ ایک سادہ سی سلور انگوٹھی تھی۔ اس کے اوپر کسی اور زبان میں لکھا تھا Teamo۔ الماس نے پڑھا۔

''یہ اسپینش ہے۔'' وہ بتانے لگا۔ ''مجھے اس کا مطلب نہیں پتا۔'' حالانکہ وہ جانتا تھا۔ ''یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیسے اس کا شکریہ ادا کرے۔

☆☆☆

یہ سچ تھا کہ اسے الماس کو دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی جس کا اس نے تصور کیا تھا فون پر...... باتیں کرتے ہوئے اس کے ذہن میں ویسی ہی لڑکی تھی جیسے الماس نے خود کو بتایا تھا۔

اس نے الماس کو بہت غور سے دیکھا تھا کہاں تھیں وہ بڑی بڑی کالی آنکھیں، کہاں تھا وہ گورا رنگ؟ وہ سیاہ بال؟ کچھ بھی تو نہ تھا اس میں۔ اس کا چہرہ بیضوی تھا، مگر کافی بھرا ہوا، رنگت بھی کوئی اتنی خاص نہ تھی، بال تیل سے چپڑے ہوئے تھے اور کوئی اتنے خوبصورت بھی نہ تھے۔

فربہی مائل بلکہ اچھی خاصی موٹی تھی اوپر سے اس کا حلیہ انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ سفید چادر سے خود کو لپیٹا ہوا گندے میلے کپڑے بغیر دھلا چہرہ۔ اس لڑکی میں کچھ بھی نہ تھا۔

اس نے ذہن میں ان لڑکیوں کا تصور کیا جو اس کے ہمراہ پڑھتی تھیں۔ یا پھر اس کی کزنز، میرین کتنی اچھی تھی۔ صاف ستھری، خوب صورت سی لڑکی۔ کرسٹینا بھی بہت پیاری اور مہذب تھی۔

اس لڑکی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو میں اس کے متعلق سوچوں۔ اگر یہ لڑکی میرے ساتھ سیریس ہو رہی ہے تو بہتر ہے کہ میں اسے دوٹوک لفظوں میں بتا دوں کہ میں صرف ٹائم پاس کر رہا تھا۔ اس نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ کچن میں سبزی کاٹ رہی تھی جب وہ اندر داخل ہوا۔

ریان چند ساعتیں یوں ہی کھڑا رہا، پھر گلاس اٹھا کر پانی بھرا اور بغیر پیاس کے پورا گلاس پی لیا۔

ریان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے الماس کو بتائے اور یہ کہ وہ انگوٹھی اس نے اسے ''کیوں'' دی ہے۔

اس انگوٹھی پر کندہ الفاظ کا مطلب وہ اچھی طرح جانتا تھا اور اگر وہ جان گئی تو شاید وہ ریان کو ''غلط'' سمجھنے لگے۔

وہ کچھ دیر تک اسے سبزی کاٹتے دیکھتا رہا وہ اتنی بری بھی نہ تھی (اگر اپنا خیال رکھے تو اچھی خاصی شکل نکل آئے گی) اس نے سوچا۔

وہ جیسا بھی تھا، کسی کا دل توڑنا اس کے لیے مشکل تھا اس نے الماس سے کچھ نہیں کہا۔ اس سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔

☆☆☆

کسی نشتر کی طرح فون کی گھنٹی اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے رات کے دو بجاتی گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے فون ریسیو کیا۔

''ہیلو؟'' وہ نیند بھرے لہجے میں بولی۔

''میرین!'' وہ ریان تھا ''جاگ رہی ہو؟''

''ریان؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔ ''خیریت ہے؟ تم ٹھیک ہو؟''

''شاید نہیں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ میرین اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ یکدم پریشان سی ہو گئی تھی۔

''رونی؟ کیا ہوا؟''

''مجھے تمہاری مدد چاہیے۔'' وہ تھکاوٹ سے چور لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''کیسی مدد؟'' وہ بستر سے نکل آئی اور پاؤں میں سلیپرز ڈال لیے۔

''تم مجھ سے مل سکتی ہو؟ ابھی اور اسی وقت؟'' ریان کی بات پر میرین کو جھٹکا لگا تھا۔

''ریان!'' وہ کچھ کہنے لگی، مگر پھر ارادہ بدل دیا ''اچھا آتی ہوں۔''

پندرہ منٹ بعد وہ ریان کے گھر پر تھی۔

''کیا ہوا ہے؟ مجھے تو تم نے ڈرا ہی دیا تھا۔ یہاں آتے ہوئے جان سولی پر اٹکی ہوئی تھی میری، خیریت تو ہے؟'' وہ ...یں درست کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''ہاں ہاں ٹھیک ہوں میں۔'' ایک دفعہ پھر جگمگاتی سٹریٹ لائٹس کو دیکھنے لگا۔

''کوئی پرابلم ہے تو بتاؤ۔'' وہ عادتاً پاس ہی پڑی میز پر بیٹھ گئی۔ قریب ہی ریان کا موبائیل دھرا تھا۔

''میرین ایک بات پوچھنا ہے۔'' وہ کچھ ہچکچا رہا تھا۔

''پوچھو۔''

''ایک لڑکی ہے۔'' اس نے اتنا کہہ کر کچھ خفت آمیز نظروں سے میرین کے چہرے کو جانچا۔

''یہ لڑکی فون پر بات کرتی ہے کسی سے۔'' وہ ایک دفعہ پھر خاموش ہو گیا تھا۔

''اچھا پھر؟'' میرین کو یوں لگا جیسے وہ ''کسی'' وہ خود ہے، مگر اس نے یہ بات ظاہر نہ ہونے دی۔

''وہ لڑکی اور لڑکا جس سے وہ بات کرتی ہے اپنے والدین سے بغیر پوچھے یہ کام کر رہے ہیں۔ اگر یہ بات ان کے بلکہ لڑکے کے مما ڈیڈ کو پتا چلے تو لڑکے سے زیادہ لڑکی متاثر ہوگی۔ وہ بے گھر بھی ہو سکتی ہے مجھے بتاؤ کہ اس ٹیلی فونک فرینڈ شپ کو نبھانے میں قصور کس کا ہے؟'' وہ نپے تلے انداز میں بولا۔

''دونوں کا۔'' میرین کو کچھ کچھ بات سمجھ میں آ رہی تھی۔

''زیادہ قصور کس کا ہے؟'' وہ کچھ ضد، کچھ اصرار کرتے ہوئے بولا۔

''لڑکی کا۔''

''مگر کیوں؟''

''وہ لڑکی انگلینڈ میں رہتی ہے؟'' میرین نے الٹا سوال کیا۔

''نہیں کراچی میں۔'' وہ بے اختیار بولا۔

''تو وہ لڑکی ایشین ہوئی یعنی کہ ایک conservative (قدامت پسند) فیملی سے تعلق ہوگا اس کا تو ریان اگر ایک ٹیپکل ایشیائی لڑکی ایک لڑکے سے فون پر اپنے پیرنٹس کی اجازت کے بغیر گپیں لڑائے گی تو اس میں اس لڑکی کا زیادہ قصور ہے۔''

''مگر دوستی کرنے کو تو لڑکے نے کہا تھا۔''

''تو وہ نہ کرتی۔ ایک لڑکی کو چاہے وہ پاکستانی ہو یا فرنچ، اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ وہ ''دوستی'' کی آفر رد کر سکے۔ مجھے بھی کئی دفعہ کئی لڑکوں نے دوستی کو کہا، مگر میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ نہیں کی، کیونکہ میں جانتی ہوں ہرا ایرا غیرا میرا مسٹر رائٹ نہیں ہو سکتا۔ وہ لڑکی صرف ایک دفعہ فون پر کسی سے بات کر کے بغیر اسے دیکھے اس سے دوستی کیوں کر لیتی ہے؟ وہ اس لڑکے کو اپنا مسٹر رائٹ سمجھتی ہے کیا؟''

''مجھے نہیں پتا، مگر وہ اس سے مل چکی ہے۔'' ریان نے بتایا۔

''اور کیا پوچھنا ہے تمہیں؟''

''میرین......! اگر وہ لڑکا اسے چھوڑنا چاہے تو کیا کہے؟ میرا مطلب ہے اسے کیسے چھوڑے؟'' وہ میرین کے قریب آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اسے کال نہ کرے۔ وہ اسے بھول جائے گا۔''

''نہیں وہ اسے پورے طریقے سے چھوڑنا چاہتا ہے۔''

''وہ لڑکی اس لڑکے سے متاثر ہے؟'' میرین نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد پوچھا تو وہ بری طرح چونک پڑا۔

''پتا نہیں۔'' وہ کچھ سوچ کر بولا۔

''اور لڑکا؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' وہ میکانکی انداز میں بولا۔

''پھر وہ اس سے صاف کہہ دے کہ وہ اس سے مزید بات نہیں کرنا چاہتا۔ اگر اس لڑکے کی اس لڑکی کے ساتھ کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہے تو پھر کسی کا دل نہیں ٹوٹے گا۔'' میرین نے حتمی لہجے میں کہا تو ریان نے سر ہلا دیا۔

''اس لڑکی کا نام کیا ہے؟'' میرین نے دھیرے سے پوچھا۔

''الماس۔'' وہ کچھ غائب دماغی سے بولا۔

''اور اس لڑکے کا؟''

''وہ......'' وہ گڑبڑا کر رک گیا۔ ''ایڈم۔'' اس کو یہی نام اس لیے سوجھا، کیونکہ ایڈم یعنی آدم کا مطلب ''آدمی'' ہوتا ہے۔ وہ میرین سے جھوٹ تو نہیں بول سکتا تھا۔

''شیور؟'' اس نے بغور ریان کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ نگاہیں چرا گیا۔

''میں ایڈم کو بتا دوں گا کہ وہ اس لڑکی کو یہ سب کہہ دے۔'' وہ اس سے نگاہیں ملائے بغیر کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

''خیریت؟ آج آپ بہت چپ چپ لگ رہے ہیں؟'' ٹھنڈے فرش سے کمر ٹکائے وہ سادگی سے پوچھ رہی تھی۔

''نہیں تو۔'' وہ کچھ چباتے ہوئے بولا۔

''کیا کھا رہے ہیں؟'' اس نے آواز کو حتی المقدور آہستہ رکھنے کی کوشش کی۔ شام کا وقت تھا، اور رانیہ کسی پارٹی پر گئی ہوئی تھی اسی لیے وہ تھوڑی آزادی سے فون استعمال کر رہی تھی۔

''کوکیز۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''وہ کیا ہوتے ہیں؟'' وہ معصومیت سے پوچھنے لگی تو وہ جھنجھلا گیا۔

''بسکٹ کو کہتے ہیں۔ تمہیں کسی چیز کا پتا بھی ہے کیا؟''

''ریان کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' وہ اس کے بدلتے تیور پر حیران رہ گئی۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے بمشکل خود کو نارمل رکھا تھا۔

''اچھا اور سناؤ کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہوں آپ کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''

''نیکسٹ فال میں کالج میں چلا جاؤں گا۔ Fall آئی تھنک نومبر، اکتوبر کو کہتے ہیں، خزاں کے مہینے کو۔'' اس نے جلدی سے وضاحت بھی کر دی۔

''اچھا۔'' الماس نے سر ہلا دیا۔

''وہ تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں بینڈ دیا تھا؟'' وہ کچھ سوچ کر بولا۔

''جی کیا؟ ربر بینڈ؟'' وہ سمجھ نہ پائی تھی۔

''او مائی گڈنیس، سلور بینڈ یعنی انگوٹھی، میں نے وہ خرید کر تمہیں دی تھی۔'' وہ اکتا کر بولا۔

''جی وہ میرے پاس ہے۔'' اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیوں پوچھ رہا ہے۔

''اسے پھینک دو۔''

''کیوں؟''

''جب میرا تم سے کوئی تعلق ہی نہیں رہنا تو پھر کیوں تم میرے نام کی انگوٹھی پہنے رکھو۔'' وہ سنگ دلی سے کہہ رہا تھا۔

''تعلق کیوں نہیں رہنا؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''جب میں تمہیں آج کے بعد کال ہی نہیں کروں گا تعلق کیسے رہے گا؟'' اس کے لہجے میں دکھ کی رمق بھی نہیں تھی۔

''مگر آپ کیوں کال نہیں کریں گے۔''

''کیونکہ میں تنگ آ چکا ہوں۔'' وہ ایک دم بھڑک اٹھا تھا۔ ''ہاں، میں تم سے تنگ آ چکا ہوں تم سے، تمہاری باتوں سے، تمہاری شکل سے، تمہارے وجود سے چڑ ہو گئی ہے مجھے۔ تم مجھے بالکل اچھی نہیں لگیں۔''

''تم نے تو اپنے بارے میں مجھے بہت کچھ بتایا تھا۔ مگر تم تو بالکل بھی ویسی نہیں ہو۔ تم تو، تم تو بالکل بھی خوب صورت نہیں ہو اور حسن میری کمزوری ہے۔ نہیں الماس بی بی! تم محض ایک میلی کچیلی، نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکی ہو، جسے نہ بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہے، نہ پہننے اوڑھنے کا تم میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو مجھ اٹریکٹ کر سکے۔ انسان کے بارے میں دو چیزوں سے پتہ چلتا ہے، ایک dress اور ایک address اور تمہارا لباس اور بات کرنے کا انداز، کچھ بھی میرے طبقے کے لوگوں جیسا نہیں ہے۔ تم ایک غریب، فضول اور خوابوں خیالوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی ہو، مجھے نفرت ہے تم سے، الماس آئی ہیٹ یو۔
میں تم جیسی لڑکی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔''

الماس کتنی ہی دیر سکتے کے عالم میں اس کی باتیں سنتی رہی۔ وہ اسے اس کی اوقات یاد دلا رہا تھا اس کی ساری باتیں سچ تھیں لیکن سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔

''یہ آپ کا فیصلہ ہے صاب! ٹھیک ہے۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں پستی میں ہوں، آپ بلندی پر، مگر خدا نے بلندی والوں کو پستی والوں کا ہاتھ تھام لینے کو کہا ہے۔ ان کو ذلیل کرنے کا نہیں۔ میں جاہل ہوں، ٹھیک ہے مگر آپ کو شاید یہ یاد نہیں کہ کراچی کا خدا اور انگلینڈ کا خدا ایک ہی ہے اور ہم دونوں کو اسی نے بنایا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے کھٹ سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے کوارٹر میں جا کر وہ اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔

اسے پہلے اس حقیقت پہ یقین کرنا تھا کہ ریان نے اس سے یہ سب کہا ہے۔

☆☆☆

وہ آنکھیں موندے ستون سے ٹیک لگائے اس وقت ''الماس نامی بے وقوف لڑکی'' کے متعلق ہی سوچ رہا تھا جب انجلینا نے اس کا شانہ ہلایا۔

''ریان انھو بیل ہوگئی ہے۔ بائیولوجی کی کلاس میں نہیں چلنا؟'' اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں اور خالی خالی نظروں سے اس کو دیکھا۔

''میں نہیں آرہا۔'' وہ اس وقت خاموشی سے کچھ سوچنا چاہتا تھا، اسی لیے کلاس اٹینڈ کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔

ریان نے اپنا بیگ اٹھایا اور کامن روم کی طرف جانے کے لیے کاریڈور کی جانب بڑھا، جہاں لڑکوں کا گروپ کھڑا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر اینڈریو نے ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہتے ہوئے آرگس کو خاموش کرا دیا اور آنکھوں میں کسی شرارت کی چمک لیے ریان کو متوجہ کیا۔

''ہائے حیدر! ایک تازہ خبر، میں نے کے پی کا کیچ سلی پوائنٹ پر پکڑا۔''

وہ رکا اور قدرے توقف سے بولا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ سلی پوائنٹ کیا ہے؟''

ریان نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی اور اپنی طرف سے ''سلی پوائنٹ'' کا مطلب اخذ کرتے ہوئے بتایا۔

''وہ جگہ جہاں بے وقوف اکٹھے ہوتے ہیں۔''

انہوں نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ ریان سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ فوراً وہاں سے نکل آیا۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ دل ہی دل میں اینڈریو کو فریچ، انگلش اور اردو میں گالیاں دیتے ہوئے وہ کامن روم میں پہنچا تھا۔

اس وقت وہ کامن روم میں کاؤچ پر نیم دراز تھا، جب میرین اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''میرین، سلی پوائنٹ کیا ہوتا ہے؟'' وہ اچھنبے سے پوچھنے لگا۔

''سلی پوائنٹ؟'' میرین حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ہاں۔'' اس نے جھٹ ساری بات کہہ ڈالی۔

''اوگاڈ!'' میرین نے ماتمی انداز میں سر پر ہاتھ مارا۔

''سلی پوائنٹ کرکٹ میں ایک خاص فیلڈ پوزیشن کو کہتے ہیں جس وقت اسپنرز باؤلنگ کرار ہے ہوتے ہیں تو جو بیٹسمین کے اردگرد فیلڈرز کیچنگ پوزیشن میں کھڑے ہوتے ہیں ان کو سلی پوائنٹ، سلی مڈ آف اور سلی مڈ آن وغیرہ کہا جاتا ہے۔''

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی ''اینڈریو کو پتا تھا کہ تمہیں کرکٹ کے متعلق کچھ نہیں معلوم۔ اسی لیے اس نے جان بوجھ کر......''

''آئی نو۔'' ریان نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یہ K.P کون ہے؟'' اس نے میرین سے استفسار کیا۔

''کیون پیٹرسن دراصل K.P اور اینڈریو ایک ہی کاؤنٹی کے لیے لاسٹ ستمبر ہالینڈ میں کھیلتے تھے۔ اور اب تمہیں تو پتا ہے کہ اینڈریو ''ہیٹن مینز'' کی طرف سے کھیلتا ہے۔''

''سنو...... نیکسٹ انٹر سکولز کرکٹ ٹورنامنٹ کب ہے؟'' وہ پانی کی بوتل کو منہ سے لگاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''ایسٹر سنڈے سے دو سنڈیز بعد اپریل میں ہی ہے گا۔'' میرین نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔ ''لیکن خیریت؟ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''تم ایسٹر ہالیڈیز کہاں گزارو گی؟'' وہ اس کا سوال یکسر نظر انداز کر گیا تھا۔

''ادھر ہی۔''

''کیا خیال ہے اس دفعہ میلبورن نہ چلیں؟'' اس نے دوسرا گھونٹ بھرا۔

''مگر کیوں؟''

''تمہیں اسٹیو یاد ہے؟ وہ آسٹریلین کرکٹر؟'' وہ الٹا اس سے پوچھنے لگا۔

''جس نے تمہیں کرکٹ سکھانے کی آفر کی تھی؟''

''ہاں میرا خیال ہے اب میرے پاس ٹائم ہے کہ میں اسٹیو کی آفر قبول کر لوں۔'' ریان نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''مطلب؟''

''میں اسٹیو سے کرکٹ سیکھوں گا، ایچ، ایم اینگلز کے لیے کھیلوں گا، اور Tyneside cup جیت کر اینڈریو سے اپنی بے عزتی کا بدلہ اتاروں گا۔'' وہ کھولتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

''اٹس بیوٹی فل!'' میرین نے ستائشی انداز میں میلبورن کرکٹ سٹیڈیم کا بیرونی حصہ دیکھ کر کہا۔

''آر یو شیور اسٹیو اندر ہوگا؟'' ریان نے جینز کی پاکٹس میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، میں نے نیوز میں دیکھا تھا یہاں آج کل کیمپ لگا ہوا ہے۔ سارے کھلاڑی یہیں ہوں گے۔''
ایسٹر ہالیڈیز میں وہ چاروں اس ایڈونچر کو سر کرنے میلبورن آئے تھے۔ ریان کرکٹ سیکھنا چاہتا تھا اور اسٹیو سے رسائی کا واحد ذریعہ سٹیڈیم تھا۔
''ہمیں اسٹیو فشر سے ملنا ہے۔ اسے پلیز بتا دیجئے کہ ریان حیدر اس سے ملنا چاہتا ہے۔''
گارڈ نے پوری بات اطمینان سے سنی اور پھر کرخت لہجے میں بولا ''آؤٹ۔''
''واٹ؟'' میرین نے حیرانی سے اسے دیکھا۔
''نو کریزی فینز الاؤڈ ہیئر No crazy fans allowed here'' (اس نے اسی انداز میں کہا۔)
''تم اس کو بتاؤ کہ ریان حیدر ملنا چاہتا ہے اس سے، بتاؤ تو سہی۔'' میرین بضد تھی۔
''جاؤ یہاں سے ٹائم ضائع مت کرو۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے جانے کے لیے کہا تو میرین نے پریشانی سے ریان کو دیکھا۔
''چلو۔'' ریان کے کہنے پر وہ چل پڑی۔
''اب کیا کریں، رونی؟'' وہ مضطرب سی ہو کر پوچھ رہی تھی۔
''برینی سے پوچھتے ہیں۔'' وہ کار میں بیٹھتے ہوئے بولا۔
''آخر کو Fablous four کا برین کب کام آئے گا؟''

☆☆☆

اس کا دماغ شل ہو رہا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے جو رنگ اس کی آنکھوں میں اترے تھے وہ اس طرح یکا یک ختم ہو جائیں گے اس نے تو یہ سوچا بھی نہ تھا۔ وہ اس کو اتنے آرام سے بے وقعت کر دے گا۔ اپنی ہی نظروں میں گرا دے گا، اسے ریان حیدر سے شکوہ تھا۔
''تم میرے ساتھ بات نہیں کرنا چاہتے تھے، نہ کرتے۔ تعلق توڑنا چاہتے تھے توڑ دیتے۔ دوستی ختم کرنا چاہتے تھے کر دیتے مجھ سے کہتے ''میں تم سے آئندہ بات نہیں کروں گا وجہ مت پوچھنا۔'' میں کوئی وجہ نہ پوچھتی۔ تمہاری کمزوری حسن تھی؟ تمہیں ایک لمبے سیاہ بالوں والی لڑکی چاہیے تھی جس کی سیاہ آنکھوں سے تم محبت کر سکو؟ جس کے گورے رنگ اور خوب صورت جسم پر تم فدا ہو سکو؟ جو میلی کچیلی اور نچلے طبقے کی ایسی لڑکی نہ ہو جسے بات کرنے اور پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ نہ آتا ہو۔
''ریان حیدر! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔''
اپنے انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے الماس کو محض اتنا بھول گیا تھا کہ کچھ نہ کچھ غلطی اس کی بھی ہے۔
''ظالم سنگدل انسان! تم نے مجھے بہت بری طرح توڑا ہے۔ خدا کرے تم بھی اسی طرح ٹوٹ جاؤ۔ بلندی سے ایسے گرو کہ کبھی اٹھ نہ سکو۔ ایسے ہی تڑپو جیسے میں تڑپ رہی ہوں۔'' وہ اب ہاتھ اٹھا کر بددعائیں دے رہی تھی۔ وہ شدید نفرت سے کہہ رہی تھی۔

''خدا کرے تم، تم جیتی جاگتی لاش بن جاؤ، تم زندہ سلامت قبر میں اتر جاؤ۔''

''خدا تو دعائیں قبول کرتا ہے، پھر بددعا......؟ یقیناً انسان ظالم بھی ہے اور جاہل بھی۔''

☆☆☆

''اف کتنا عرصہ ہوگیا میرے تو دماغ نے کام کرنا ہی بند کر دیا ہے۔'' ساری بات سننے کے بعد اینجلینا نے سر جھٹک کر مصنوعی بے چارگی سے کہا۔

''تقریباً کتنا عرصہ ہوگیا؟'' ٹرے ہاتھ میں پکڑے لونگ روم میں داخل ہوتی میرین کے لہجے میں طنز کی واضح جھلک تھی۔

''جب سے میں نے وینڈیز کی ہاٹ چاکلیٹ نہیں کھائی۔'' اینجلینا معصومیت سے بولی۔

میرین نے ٹرے میز پر رکھ دی اور بولی۔ ''یہ وینڈیز کس ڈش کا نام ہے؟''

''ڈش نہیں ریسٹورنٹ کا نام ہے۔'' اینجلینا نے تاسف سے سر پر ہاتھ مارا۔ ''یہاں سے تقریباً دو اسٹریٹس چھوڑ کر نیا کھلا ہے۔ میں نے پرسوں ہی ان کی ہاٹ چاکلیٹ ٹرائی کی ہے۔''

''گویا جناب کا دماغ پرسوں سے نہیں کام کر رہا۔'' ریان بھی اب سوپ سرو کرنے میں میرین کی مدد کر رہا تھا۔

''ہوں۔'' اینجلینا نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا اور آگے بڑھ کر ریان کے ہاتھ سے اپنا پیالہ تھام لیا۔

''پھر بتاؤ یار! کیا کرنا ہے؟'' اپنا سوپ ختم کر کے ریان نے خالی پیالہ میز پر واپس رکھ دیا اور سوالیہ نظروں سے دونوں کی جانب دیکھنے لگا۔

''کرنا کیا ہے، مجھ وینڈیز کی ہاٹ چاکلیٹ کھلاؤ اور کام بنواؤ۔''

''او کے۔'' اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ جیب سے جتنی رقم بھی جائے اسے اس بات کی پروا نہ تھی۔''

''دماغ ٹھیک ہے؟'' اینجلینا کا پلان سن کر میرین نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''کیوں میرین! تم ایکٹنگ نہیں کر سکتیں؟''

''میں کر سکتی ہوں، تم نہیں کر سکتیں۔'' میرین نے چیخ کر کہا تو اینجلینا نے کچھ گڑبڑا کر اسے دیکھا۔

''تم سے جھوٹ تو بولا جاتا نہیں ہے، تم ایکٹنگ کیسے کرو گی؟'' میرین باقاعدہ اسے لتاڑ رہی تھی۔

''جہنم میں جاؤ! اتنا اچھا حل بتایا تھا اور میں ایک دن ہالی وڈ کوئین بن جاؤں گی، تمہیں کیا پتا میرے ambitions کا!'' وہ جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی اور ایک دم گڑبڑا کر رک گئی۔

''ارے۔'' میرین کو حیرانی ہوئی تھی۔ ''تم نے تو کبھی نہیں بتایا تمہیں ایکٹنگ کا شوق ہے۔''

''اینجلینا! تمہیں ایکٹ کرنے کا شوق ہے تو مجھے بتانا تھا، میں تمہیں اپنے پلے میں لے لیتا۔'' ریان کو واقعی جھٹکا لگا تھا۔ اپنے ایک پلے کے لیے اس نے پچھلے دنوں بار ہا اینجلینا اور میرین سے لیڈ رول کرنے کے لیے

اصرار کیا تھا مگر دونوں نے ہامی نہیں بھری تھی۔

''وہ تھوڑا بہت ہے مگر میں تھوڑی موٹی ہوں، اس لیے......'' کچھ جھینپ کر اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تو کیا ہوا؟'' ریان نے سہولت سے کہا۔ ''کیٹ ونسلٹ بھی تو موٹی ہے مگر چل گئی نا......تم تھوڑا سا وزن کم کرلو تو فٹ رہو گی۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہاٹ چاکلیٹ سے مکمل پرہیز کرو۔''

انجلینا نے کچھ منہ بسور کر اسے دیکھا اور پھر مسکرا دی۔

☆☆☆

وہ پلان کے مطابق گھر کے گیٹ کے باہر لاپروائی سے چہل قدمی کر رہی تھی جب اسے سڑک پر دوسری جانب سے بلیو سوک آتی دکھائی دی۔ وہ اسے مکمل نظر انداز کیے یوں ہی چلتی رہی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے اپنے بے حد سیدھے بال ہاف رکھے تھے۔ بلیک ٹراؤزرز اور سفید بلاؤز میں وہ بہت کیوٹ لگ رہی تھی، البتہ سوک میں بیٹھا اسٹیو فشر اسے نوٹ نہ کرتا اگر ایک جھٹکے سے اس کی گاڑی کے ٹائرز چرچرا کر رک نہ جاتے۔

اس نے زور سے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا اور بڑبڑاتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ سڑک پر بکھرے کیلوں سے اگلے دو ٹائرز متاثر ہوئے تھے۔ اسے سمجھ میں نہ آیا کہ اتنی صاف شفاف سڑک پر کیلوں کی موجودگی کا کیا جواز بنتا ہے۔ اس کا گھر چند گز کے فاصلے پر موجود تھا، اسی لیے اس ''حادثے'' پر اس کا پارہ نہ چڑھا۔

''یہ کس نے گرائے ہیں؟'' اپنے اردگرد میرین کے سوا کسی اور ذی ہوش کو نہ پا کر وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

میرین نے ایک نگاہ غلط اس پر ڈالی اور بدستور واک کرتی رہی۔

''ایکسکیوزمی، مس......! میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔'' وہ سمجھا شاید اس نے سنا نہیں ہے، تب ہی کچھ قریب آ کر شائستگی سے پوچھا۔

اس نے ایک دفعہ پھر قہر و غضب کی ملی جلی نگاہوں سے آسٹریلین کپتان کو دیکھا اور نخوت سے سر جھٹک کر ٹہلنے لگی۔

اسٹیو فشر کو سمجھ میں نہ آیا کہ ہو کیا رہا ہے؟ وہ گونگی ہے یا بہری، وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ ''مس! آپ میری کار کو چند لمحوں کے لیے دیکھ سکتی ہیں، جب تک میں گھر جا کر کسی کو مدد کے لیے کال کرلوں۔''

''اچھا زیادہ پوزمت کریں۔ مجھے پتا ہے کہ نہ آپ کی گاڑی خراب ہوئی ہے نہ ہی آپ کو مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔ ''لگتا ہے جھوٹ بولنے کی عادت ہے آپ کو۔''

اس کا یہ شک کہ وہ گونگی بہری ہے، وہ تو دور ہی ہو گیا، مگر اس کی بات سن کر وہ ہکا بکا اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ''میری گاڑی آپ کے سامنے خراب ہوئی ہے۔'' وہ شاید صفائی دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرین نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میرے سامنے؟ کب؟ میں نے تو نہیں دیکھا۔'' وہ صاف مکر گئی۔

''لیکن آپ نے یہ کیوں کہا کہ مجھے جھوٹ بولنے کی عادت ہے؟''

''میری زبان ہے، میری مرضی جو کچھ کہوں میرا نہ پٹرول لگتا ہے نہ بل آتا ہے۔ آپ مجھے کچھ کہنے سے روک تو نہیں سکتے۔'' وہ تڑ سے بولی۔

''مگر آپ میری انسلٹ کر رہی ہیں۔'' وہ جلدی غصے میں نہیں آتا تھا، اسی لیے نرمی سے بات کر رہا تھا۔

''پہلے بڑی عزت ہے جو بے عزتی ہو جائے گی۔'' وہ سوچ کر رہ گئی۔

''آپ مجھ سے بات نہ کریں۔ آپ ایک جھوٹے اور وعدے سے پھرنے والے شخص ہیں۔ اگر آپ وعدہ ایفا نہیں کر سکتے تو کیا بھی مت کیجیے۔'' کہہ کر اسے یاد آیا کہ یہ تو انجلینا کا ڈائیلاگ تھا جو غالباً اس وقت کچن میں پائن ایپل جوس پینے میں مگن تھی۔ خیر، اب تو وہ بول چکی تھی۔

''اوہ گاڈ! آپ فینز بھی نا بس حد کرتے ہیں۔ آپ مجھ پر اسی لیے خفا ہیں کہ جب ہم نے ونڈر ایشنز پانچ صفر سے جیتنے کا کہا تھا تو تین ایک سے کیوں جیتے؟'' وہ اپنے طور پر قیاس آرائیاں کر رہا تھا۔

''جی نہیں۔'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ گیٹ کھول کر انجلینا باہر نکل آئی۔

''میرین......! تم کیوں یہاں کھڑی جھوٹے لوگوں سے باتیں کر رہی ہو؟'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

''گڈ لارڈ۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ قدرے جھلا کر بولا۔ ''میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے؟''

''آپ غالباً وائس کپتان تھے جب ہماری بال نے آپ کے گھر کا گملا توڑ دیا تھا اور آپ گیند لے کر یہاں آئے تھے۔ بڑی بڑی باتیں کی تھیں آپ نے میرے کزن سے......'' میرین تلخ لہجے میں ساری بات دھیرے دھیرے اس کے گوش گزار کر رہی تھی اور وہ مسکراہٹ دبائے اس جذباتی سی ٹین ایج لڑکی کی باتیں سن رہا تھا۔

''مجھے صرف اتنا بتائیے مس......!'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میرین کا چہرہ دیکھا۔

''میری اینے فیٹو نا کیلتھروپ۔'' اس نے فخر سے اپنا نام بتایا۔

''مجھے صرف اتنا بتائیے مس کیلتھروپ! کہ اپنے کزن کی ہیلپ کرنے کے لیے یہ بجری میرے راستے میں آپ نے گرائی ہے؟''

اس کے استفسار پر میرین نے قدرے گڑبڑا کر انجلینا کو دیکھا۔

''جی۔'' اس نے سر جھکا لیا۔ اسٹیو نے انجلینا پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جس کا رنگ اڑ گیا تھا۔

''اب میں چاہوں تو آپ دونوں کو پولیس کے حوالے کر دوں......کر دوں کیا؟'' دونوں نے فوراً پشیمانی سے سر نفی میں ہلایا۔

''اچھا آپ پرامس کرو کہ آئندہ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دو گی۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''پرامس!'' دونوں نے ہم آواز ہو کر کہا (آئندہ ہم پکڑے جانے کی غلطی کبھی نہیں کریں گے) اندر ہی اندر وہ دونوں ڈھٹائی سے یہی سوچ رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے اپنے کزن سے ملواؤ۔ میں کرکٹر ہوں اور کرکٹ از اے گیم آف جینٹلمین......کرکٹر سے

کوئی گیم سیکھنا چاہے تو وہ کبھی انکار نہیں کرتا۔"

☆☆☆

اور پھر کتنے ڈھیر سارے دن وہ یونہی بستر پر لیٹی بخار میں پھنکتی رہی۔ بستر پر پڑے رہنے کے پہلے چند روز تو دن رات اسے بس وہی آوازیں سنائی دیتیں جو کسی پھرکی کی طرح اس کے دل و دماغ میں گھوم رہی تھیں۔

"آپ اتنا اونچا بولیں گی تو میں بہرہ ہو جاؤں گا جی!"

"اچھا...... میں رانیہ بی بی کا بیٹا بول رہا ہوں نیو کاسل سے۔"

"نہیں، میں ریان صاب ہوں۔"

"پلیز۔ میں بہت بور ہو رہا ہوں کچھ دیر بات کرو۔"

"اچھا تمہیں انگلش آتی ہے تو انگلش میں بات کرتے ہیں مجھ سے اردو نہیں بولی جاتی۔"

"میری تصویر دیکھی ہے؟"

"کیسی لگی؟"

"مجھے تو تم نے دیکھا ہی ہوا ہے مگر میں نے تمہیں نہیں دیکھا اسی لیے بتاؤ کہ تم کیسی ہو؟"

"مجھے آرٹسٹ بننا ہے مجھے پینٹنگ کرنا بہت پسند ہے۔"

"انسان کو پینٹ کرنا۔"

"الماس......! یہ، یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔"

"یہ اسپیلش ہے۔ مجھے اس کا مطلب نہیں پتا، یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔"

"بسکٹ کو کہتے ہیں، تمہیں کسی چیز کا پتا بھی ہے؟"

"وہ تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں بینڈ دیا تھا؟"

"اسے پھینک دو۔"

"جب میرا تم سے تعلق ہی نہیں رہنا تو پھر کیوں تم میرے نام کی انگوٹھی پہنے رکھو؟"

"کیونکہ میں تنگ آ چکا ہوں۔"

"تم ہو کیا؟ ہاں؟ بتاؤ مجھے۔ ایک عام سی لڑکی!"

جب کسی لکھاری کا مسودہ رد کیا جاتا ہے، کسی شاعر کا کلام ناقابل اشاعت قرار دیا جاتا ہے کسی مصور کی تصویر ریجیکٹ کی جاتی ہے تب بھی، ہاں تب بھی اتنا دکھ محسوس نہیں ہوتا جتنا اپنی ذات، اپنے وجود کی ریجیکشن پر ہوتا ہے، کیونکہ پہلی صورت میں انسان کی "تخلیق" کو رد کر دیا جاتا ہے، دوسری صورت میں "انسان" کو دھتکارا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کو آئینہ دکھایا گیا تھا اور بہت بری طرح دکھایا گیا تھا۔ چند ہفتے پہلے جو رنگ اس کی آنکھوں میں اور جو روشنیاں اس کے چہرے پر بکھری تھیں وہ ایک دم ہی عنقا ہو گئے تھے۔

وہ بے بسی، بے چارگی کی تصویر بن کر رہ گئی تھی یوں کہ اس پر کسی بے ساکت وجود کا گمان ہوتا تھا۔

کچھ بھی تو نہیں بچا تھا۔ بس ایک سناٹا اندر باہر ہر طرف پھیلا تھا۔ صحراؤں کی سی ویرانی اور بیابانوں کی سی وحشت ان سیاہ آنکھوں میں اتری تو ٹھہر سی گئی۔

وہ تمام خواب اس کے اندر والی الماس، جو ابھی ٹھیک سے بچپنے کی حدود سے نکلی بھی نہ تھی، کے دل کے قبرستان میں اس کے ''وجود'' کے ساتھ ہی دفن ہو گئے تھے۔

اگر کچھ بچا تھا تو وہ انتقام کا ایک جذبہ تھا ایک سرد آگ تھی جو اس کے وجود کو جھلسا رہی تھی۔

☆☆☆

''پہلے کبھی کرکٹ کھیلی ہے؟''

''اسٹیو نے اسے صبح چھ بجے اپنے گھر کے قریب واقع ایک پلے گراؤنڈ میں آنے کو کہا تھا اور وعدے کے مطابق وہ مقررہ وقت پر اپنی نیند کی قربانی دے کر برے برے منہ بناتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا اور اب بمشکل جمائیاں روکتے ہوئے اپنے سامنے کھڑے کرکٹر کو دیکھ رہا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے لب بھینچ کر جمائی روکی۔

''اٹس اوکے۔ اب تم بتاؤ، تم کس بال سے اسٹارٹ لینا چاہتے ہو؟ کرکٹ بال سے یا ٹینس بال سے؟'' اس نے ریان کے آگے ایک سرخ اور ایک سبز گیند کی۔

''فٹ بال سے بہتر نہیں رہے گا۔'' اس کے لبوں سے پھسلا۔

''اوہ کم آن۔'' اسٹیو کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ''دونوں گیندوں کو پکڑ کر دیکھو، کون سی ایزی لگتی ہے۔''

اس نے نیند سے بند ہوتی آنکھوں سے دونوں گیندوں کو دیکھا اور سبز والی ٹینس بال اٹھالی۔ اس ہلکی اور نرم گیند کو اس نے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چیک کرنے والے انداز میں منتقل کیا اور اسے اسٹیو کے ہاتھ میں واپس تھماتے ہوئے سرخ گیند کو اٹھایا۔ وہ پتھر کی طرح سخت ہونے کے ساتھ ساتھ کافی بھاری بھی تھی۔

''کرکٹ بال۔'' اس کے جواب پر اسٹیو کو حیرت ہوئی تھی۔ چاہے ظہیر خان ہو یا بریٹ لی تقریباً ہر باؤلر اپنے کھیل کا آغاز ٹینس بال سے ہی کرتا ہے لیکن یہ تمام عموماً بچپن سے ہی کھیلنا شروع کر چکے ہوتے ہیں اور سترہ اٹھارہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے کرکٹ بال کی طرف آ چکے ہوتے ہیں۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' اس نے سرخ بال کو ریان کے سامنے کرتے ہوئے مخصوص سٹائل سے پکڑا، یوں کہ شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی نے ایک طرف سے گیند کو ڈھانپا جبکہ باقی دونوں انگلیاں دائیں جبکہ انگوٹھا بائیں جانب سے لگ گیا۔

''اب ایسے گیند کو پکڑ کر دکھاؤ۔'' اسٹیو نے گیند ریان کو تھما دی۔

ریان نے فوراً ویسے ہی گیند کو پکڑا مگر اس نے چھوٹی انگلی غلط طریقے سے رکھی ہوئی تھی۔ اگلے دس منٹ کی مشق سے اسٹیو نے اسے گیند پکڑنا سکھایا۔

''اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم نے باؤلنگ کس طرح کرنی ہے۔ جو بنیادی بات تمہیں سیکھنے کی ضرورت

ہے وہ ہاتھ کا خم درست طریقے سے لاتا ہے۔

ہاتھ کے گھمانے کے عمل کے دوران جب ہاتھ کندھے کے قریب پہنچ جاتا ہے تو ہاتھ کا خم تقریباً 165 ڈگری تک چلا جاتا ہے اور بہت کم باؤلر اس کو 180 ڈگری تک لانے میں کامیاب ہو پاتے ہیں جس کی خالص وجہ کندھے اور ہاتھ کا جوڑ ہے جو اس کو زیادہ خم لانے کی اجازت نہیں دیتا۔

بولنگ کے عمل کے دوران اگر باؤلنگ والا ہاتھ کندھے کی سیدھ میں آجائے اور کہنی سے لے کر گیند کے چھوٹنے تک اس میں مکمل طور پر خم نہ ہو، بلکہ ضروری طور پر مائل بہ خم ہو، اس طریقے سے اگر گیند کرائی جائے تو وہ درست قرار دی جائے گی۔ بات سمجھ رہے ہونا؟'' اس نے بات روک کر پوچھا تو ریان نے جھٹ سر اثبات میں ہلا دیا۔

''اللہ کی قسم! ایک لفظ سمجھ میں نہیں آیا۔'' ریان نے سوچا (یہ تھوڑا بہت پاگل تو ضرور ہے۔)

''تمہیں معلوم ہے کہ تھرو کیا ہوتی ہے؟'' اسٹیو اس وقت ایک مکمل کوچ لگ رہا تھا۔

''میرا سر ہوتی ہے۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''کرکٹ کی عمومی اصلاح میں اس کو چلنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گیند کو پھینکنے کے عمل میں جب کہنی کا کردار ضرورت سے زیادہ نمایاں اور عیاں ہو تو اس کو چلنگ کہا جاتا ہے۔ ہاتھ کی سیدھ میں کہنی کے درست استعمال سے بسا اوقات باؤلر کو اضافی رفتار مہیا ہوتی ہے۔ اگر گیند کو ہاتھ کی سیدھ سے کرانے کا عمل کیا جائے حالانکہ اکثر باؤلر کا ہاتھ باؤلنگ کے عمل کے دوران جسم کی حرکت اور گیند کے ہاتھ سے نکلنے کے وقت سیدھا رہتا ہے۔ اس تناظر میں آئی سی سی نے باؤلنگ کے عمل کے دوران 15 ڈگری تک کے خم کو روا قرار دیا ہے اس سے زیادہ نہیں۔''

ایک تو اتنے مشکل الفاظ، پھر اسٹیو کا آسٹریلین لب ولہجہ وہ بھی ایسا کہ منہ میں روڑے رکھ کر بول رہا ہو۔ ریان کی سمجھ میں کیا خاک آنا تھا؟ (یار! یہ آدمی پورا پاگل ہے)

''چلو۔ اب تم اس اسپاٹ پر باؤلنگ کراؤ جیسے میں نے بتایا ہے۔'' ریان نے گیند اس کے ہاتھ سے لے لی اور فوراً ہی پھینکنے لگا تھا کہ وہ بول اٹھا ''ایسے نہیں، پہلے اپنا رن اپ تو مکمل کرو۔''

''رن اپ کیا ہوتا ہے؟'' وہ اچنبھے سے پوچھنے لگا۔

''جس جگہ سے گیند پھینکی ہوتی ہے اس سے چند قدم دور سے بھاگ کر آنے کو رن اپ کرنا کہتے ہیں۔ مطلب اس چند قدم کے فاصلے کو رن اپ کہا جاتا ہے۔ اسپنرز کا رن اپ بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ سیمرز اور میڈیم پیسرز کا زیادہ ہوتا ہے اور فاسٹ باؤلرز کا سب سے زیادہ ہوتا ہے۔''

ریان نے اس کی ہدایت کے مطابق رن اپ مکمل کیا اور گیند اس اسپاٹ پر پھینکی جہاں اسٹیو نے سفید دائرہ کھینچا ہوا تھا۔ گیند اس سے ڈیڑھ فٹ آگے گری۔ اس نے قدرے خجالت سے اپنے کوچ کو دیکھا اور گیند اٹھا کر دوسری بلو کوشش کی اس دفعہ گیند چھ انچ پیچھے گری۔

اس نے صبح ورزش وغیرہ نہیں کی تھی اس لیے بازو کے پٹھے تھوڑے بہت کھنچے کھنچے محسوس ہو رہے تھے مگر اس کی پروا کیے بغیر ہی اس نے بائیسویں دفعہ میں گیند اس دائرے سے ایک انچ کے فاصلے پر بالآخر پھینک ہی دی اور

کامیابی کے جذبے سے سرشار ہو کر اسٹیو کی جانب دیکھا جو اسے عجیب سی نظروں سے تک رہا تھا۔
اسٹیو نے اب سفید دائرے سے چند گز آگے سٹینڈ میں تین اسٹمپ اور ان کے اوپر بیلز سیٹ کر دیں اور اسے اشارہ کیا۔ اس نے اسی طرح درست لائن اور لینتھ پر گیند کرائی جو وکٹ کے بائیں جانب سے تقریباً ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے سے نکل گئی۔ اسٹیو اسے مسلسل عجیب طریقے سے دیکھ رہا تھا۔
''دوبارہ کرواؤ۔'' اب کی بار گیند سفید دائرے سے دس انچ سائیڈ پر گری اور ٹپہ کھا کر سیدھی مڈل اسٹمپ کو ڈھے گئی۔
''تمہیں کس نے بال سوئنگ کرنا سکھائی ہے؟'' اسٹیو کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔
''کسی نے نہیں۔'' اس نے سوئنگ کا مفہوم جانے بغیر ہی کہہ دیا۔
''واقعی۔'' اس نے ستائشی انداز میں سر ہلا دیا۔ ''یہ نیچرل ٹیلنٹ ہے۔ تم میں قدرتی طور پر گیند کو ان سوئنگ اور آؤٹ سوئنگ کرنے کی خصوصیت ہے۔''
''یہ کیا ہوتا ہے؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔
''بال کا باہر کی طرف گھومنا آؤٹ سوئنگ جبکہ اندر کی طرف گھومنا ان سوئنگ کہلاتا ہے۔ یہ آرٹ آصف اور گلین کا ہے۔'' اس نے توصیفی انداز میں بتایا۔
''یہ آپ کے بچوں کے نام ہیں؟'' جس طرح بے تکلفی سے وہ ان کا نام لے رہا تھا ریان نے تو یہی سمجھا کہ شاید اس کے بچے ہیں۔
''میرے بچے؟ ارے نہیں محمد آصف اور گلین میگرا جیسے نامور باؤلرز سے ناواقف ہو تم؟ محمد آصف پاکستانی جبکہ گیلن میگرا آسٹریلوی ہے۔'' اسٹیو نے ہنستے ہوئے بتایا۔
''اوہ۔ اچھا۔'' اس نے جھینپ کر اسے دیکھا۔
چونکہ اسٹیو کو پریکٹس سیشن میں حصہ لینے کے لیے سٹیڈیم میں لگے کیمپ میں شرکت کرنا تھی اسی لیے پہلے روز کے سیشن کا اختتام ہو گیا۔
اگلی صبح تقریباً آدھا گھنٹہ باؤلنگ پریکٹس کے بعد اسٹیو نے اسے بیٹنگ سکھانی شروع کی۔
''میں دیکھنا چاہتا ہوں تم کس چیز میں زیادہ اچھے ہو؟'' وہ وضاحت کرتے ہوئے سمجھانے لگا ''بیٹ کو تم جس طرح سے پکڑو۔ یہ تمہاری مرضی ہے۔ آڑا، ترچھا، سیدھا الٹا، جیسے بھی پکڑو، مگر بیٹ پکڑ کر جھکتے ہوئے وقت اپنا وزن دونوں پاؤں پر ڈالو یوں کہ پیچھے یا آگے ہونے میں آسانی رہے۔ صرف ایک پاؤں پر دباؤ ڈالو گے تو دوسری سمت تمہارا جسم آسانی سے موو نہیں کر سکے گا۔
اگر آسٹریلین پچیز پر کھیل رہے ہو تو ہمیشہ بیک فٹ پر کھیلو، ایشیائی پچز پر فرنٹ فٹ پر کامیاب رہو گے۔ گیند جب باؤلر کے ہاتھ سے نکلے تو اسی وقت اسے read کرو۔ اگر گیند کے ٹپہ کھانے کے بعد اسے سمجھو گے تو یہ غلط ہو گا۔ باہر جانے والی گیندوں کو مت کھیلو، فل ڈلیوریز پر اونچی شارٹ مت لگانا۔ رن لیتے وقت ہمیشہ سیدھا بھاگو۔

ترچھا بھاگنے پر تمہیں زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑے گا اور رن آؤٹ کرنے کا خدشہ بڑھ جائے گا۔ رن مکمل کرتے وقت بیٹ ہمیشہ زمین پر رکھو۔''

یہ اور اسی طرح کے دیگر لیکچرز تقریباً تمام چھٹیوں تک جاری رہے۔ اس کے انگلینڈ جانے سے دو روز پہلے اسٹیو اس کو لے کر اسٹیڈیم چلا گیا۔

لش گرین آؤٹ فیلڈ پر کھلاڑی نیٹ پریکٹس کر رہے تھے۔ بلکہ ابھی صرف وارم اپ ہو رہے تھے۔ ریان بھی ان کے ساتھ رگبی، فٹ بال اور ہینڈ بال کھیل کر وارم اپ ہوا۔

ان کی ٹیم کا ایک فاسٹ باؤلر جب باؤلنگ پریکٹس کرنے لگا تو اسٹیو نے ریان کو وکٹ کے آگے بیٹ تھما کر کھڑا کر دیا۔ (گلوز، پیڈز اور ہیلمٹ اس نے تین روز پہلے خریدی تھی) پہلے پہل تو وہ دفاعی حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گیندوں کو روکتا رہا مگر جب اس نے تیز باؤلنگ کرانا شروع کی تو ریان نے بھی انہیں کھیلنا شروع کر دیا اس کو ایک دم کرکٹ میں مزہ آنے لگا تھا۔

اس نے ریان کو پندرہ بیس منٹ تک باؤلنگ کروائی اور ریان ایک دفعہ بھی آؤٹ نہ ہوا۔ پھر ریان نے اسٹیو کو باؤلنگ کروانا شروع کی تو چوتھی گیند پر کلین بولڈ کر دیا۔

ایڈم کو اس نے پہلی گیند پر آؤٹ کر دیا تھا۔

بعد میں کھلاڑی سیڑھیوں کے راستے پویلین کی جانب لوٹ گئے۔ ڈریسنگ روم میں کوچ نے انہیں مختلف کھلاڑیوں کی ویڈیوز دکھانا شروع کر دیں چونکہ آسٹریلین ٹیم ٹرائی اینگولر سیریز میں ساؤتھ افریقہ اور انگلینڈ سے مدمقابل ہونے جا رہی تھی اسی لیے سلائیڈز انہی دو ٹیموں کے نامور کھلاڑیوں کی خامیوں کی تھیں۔ شان پولاک کی ایک ویڈیو چلی تو ریان خود پر قابو نہ پاسکا۔

''یہ بندر ہے؟'' جواب میں پورے ڈریسنگ روم میں قہقہے ابل پڑے۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے چوزے کی شکل والے انگلش کھلاڑی کی بابت استفسار کیا۔

''اینڈریو اسٹراؤس۔''

''اور یہ؟''

''گریم اسمتھ۔'' جواب ملا۔

''یہ دونوں بھائی ہیں یا پھر ایک ہی مرغی کے انڈے سے نکلے ہیں؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

☆☆☆

Tyneside cup جیتنے کے لیے اس کی محنت رنگ لائی اور وہ ٹرائلز میں سلیکٹ ہونے کے بعد ایچ ایم اینگلو میں بطور میڈیم پیسر شامل کر لیا گیا مگر اس عہدے کے حصول کے لیے اسے فٹ بال ٹیم کی کپتانی سے استعفیٰ دینا پڑا۔ یہاں ایک عقل مندی اس نے یہ کی کہ ڈینئیل، کو فٹ بال ٹیم چھوڑنے، سے پہلے فٹ بال ٹیم میں بطور اسٹرائیکر منتخب کر لیا۔ ڈینئیل کو حالانکہ فٹ بال کی الف بے بھی نہیں آتی تھی مگر ریان نے سب چلتا ہے اور تم سیکھ جاؤ گے کہہ

کرا سے مطمئن و راضی کر لیا۔

اپریل کے دوسرے ہفتے ٹورنامنٹ کا آغاز ہوا۔ ریان کی ایچ ایم ایلگز نے سیکرڈار کی ''گولڈ ٹیم'' کو ہرا کر فائنل کے لیے کوالیفائی کر لیا۔

فائنل میچ میں بھی سیکرڈار کی Bronze ٹیم ایچ ایم ایلگز کے مدمقابل تھی۔ بقول ریان کے اس ٹیم میں سارے ہی گدھے تھے جو فائنل میں غالباً نقل مار کر پہنچے تھے۔ وہ میچ ریان کی ٹیم نے 189 رنز سے جیتا تھا۔

Tyneside cup جیتنے کے بعد ریان نے کرکٹ کو خیر باد کہہ دیا۔ کرکٹ تک اس کی دلچسپی محض اپنے بے عزتی کا بدلہ چکانے کی حد تک محدود تھی۔ جیسے ہی مقصد پورا ہوا اس نے اس کھیل سے توبہ کر لی۔

پڑھائی میں وہ پہلے ہی ''گزارے لائق'' تھا کرکٹ کی وجہ سے اس کی رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہوگئی۔ اسے میچ پریکٹس سے فرصت نہ تھی کہ پڑھائی کے لیے ٹائم نکالتا یوں ریان نے مرمرکر GSE کر لیا۔

جس روز رزلٹ آنا تھا وہ نیو کاسل سے برمنگھم چلا گیا۔ برمنگھم میں اس کے ڈیڈ کی سیکنڈ کزن رہتی تھی وہ وہیں چلا گیا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ آنٹی کوثر کی تین بیٹیاں تھیں (اور تینوں اس پر فدا تھیں) اسے اب ان لڑکیوں یعنی کشمالے، زرمالے، پلوشے (جنہیں وہ دل ہی دل میں تین پیالے کہا کرتا تھا) سے پیچھا چھڑانا مشکل لگ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ جس نشست پر براجمان تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹوں پر پاکستانی نژاد برطانوی شہری بیٹھے تھے۔ پہلے پہل تو سب کچھ ٹھیک تھا مگر جیسے ہی ساجد محمود کو گیند تھمائی گئی ان برٹش پاکستانیوں نے کورس میں گانا شروع کر دیا۔

Go to hell the rejected

Go to hell the traitor

ریان نے حیرت کے ساتھ بیٹھی لڑکی سے پوچھا۔

''یہ اس کو ریجیکٹڈ کیوں کہہ رہے ہیں؟''

''یہ غدار ہے، اپنے ملک کے خلاف کھیل رہا ہے۔'' انتہائی تنفر سے کہا گیا۔

''لیکن ساجد محمود برٹش نیشنل ہے۔ وہ یوکے میں پیدا ہوا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف کھیل ہی رہا ہے کوئی جنگ تو نہیں کر رہا پھر اس کو اس طرح کہنا غلط ہے۔''

''کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔''

وہ لڑکی اس بات پر چند لمحے ریان کی جانب بغور دیکھتی رہی پھر بولی ''اس کے باپ کا ملک کیا ہے؟''

''پاکستان۔'' ریان نے جھٹ سے جواب دیا۔

''اور ماں کا؟''

''پاکستان!'' اس نے فوراً کہا۔

''تو اس کا ملک کون سا ہے؟''

''یو کے۔'' وہ ایک دم گڑبڑا گیا۔

''کیسے؟'' وہ مسکرا کر پوچھنے لگی۔

''کیوں کہ اس کے پاس نیشنلٹی ہے۔'' وہ کچھ تذبذب سے بولا۔

''وہ تو اس کے پیرنٹس کے پاس بھی ہے۔ پھر اس کے پیرنٹس کا ملک پاکستان کیوں ہے؟''

وہ اب ابرو اچکا کر پوچھ رہی تھی۔

''کیونکہ ساجد محمود برٹن میں پیدا ہوا ہے جبکہ اس کا باپ شاہد محمود پاکستان میں پیدا ہوا تھا۔'' ریان کو اپنی دلیل کچھ ہلکی لگی۔

''تو کیا قومیت صرف پیدائش سے تبدیل ہو جاتی ہے؟'' اگر ایک بنگالی عورت صرف اپنے بچے کو جنم دینے کے لیے امریکہ لے آتی ہے اور دو روز بعد اپنے امریکہ میں پیدا ہونے والے بچے کو لے کر واپس ڈھاکہ چلی جاتی ہے اور تمام عمر ڈھاکہ میں گزارتی ہے تو اس کا بیٹا کیا ہوا؟ امریکن یا بنگالی؟''

''امریکن بورن بنگالی۔'' ریان نے ڈپلومیٹک جواب دیا۔

''کوئی ایک بتاؤ۔''

''اوکے۔ بنگالی۔'' اس نے ہار مان لی۔

''تو گویا یہ طے ہے کہ قومیت پیدائش کے ملک سے تعین نہیں کی جاسکتی؟'' اس نے پوچھا۔

''آل رائٹ۔ ساجد محمود کا ملک برطانیہ ہے، اور اسی طرح ساجد محمود بھی برٹش ہے۔ اب ٹھیک ہے؟'' وہ شاید اسے قائل کرنا چاہ رہا تھا۔

''ساجد محمود برٹش کیسے بن گیا؟ ابھی تو آپ نے کہا تھا وہ پاکستانی ہے؟'' وہ مسکرائی۔

''وہ برٹش نیشنل ہے، اسکاٹ لینڈ یارڈ میں ہے، اسی لیے وہ برٹش ہے۔'' اس کے جوابات اسے خود بھی الجھا رہے تھے۔ ''کیوں کہ وہ...... وہ یہاں رہتا ہے۔''

''اوکے! تو قومیت کا تعین رہائش سے ہوتا ہے۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایک سابقہ ایرانی ملکہ امریکہ میں رہتی ہے وہ کیا امریکن ہوگی؟ جارج کلونی اگر اٹلی میں چھٹیاں گزارنے لگ جائے تو وہ اطالوی بن گیا؟ بریڈ پٹ اور انجلینا جولی نے لندن میں گھر خرید لیا اور اس میں شفٹ ہوگئے تو وہ برٹش بن جائیں گے؟'' وہ رکی اور قدرے توقف سے بولی۔ ''کیا قومیت کا تعین رہائش سے ہوتا ہے؟''

''نو۔'' وہ ہولے سے بولا۔

''پھر ساجد محمود پاکستانی ہوا۔ ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ ساجد محمود نے اپنے ایک انٹرویو میں پاکستان کو اپنے ماں باپ کا ملک کہا تھا۔'' وہ نہایت مدبرانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قومیت کا تعین پیدائش اور رہائش سے نہیں ماں باپ کے ملک سے ہوتا ہے تو ساجد محمود کس طرح برٹش ہے؟''

''اوکے۔ وہ پاکستانی ہے۔'' اس نے تسلیم کرلیا۔

''اس انٹرویو کوڈی کوڈ کرو۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا وہ بے غیرت ہوتا گیا اور اس کو علم ہوگیا کہ اگر یہاں رہنا ہے تو گوروں کے تلوے چاٹنے پڑیں گے۔'' وہ سٹیڈیم پر نگاہیں جمائے کہہ رہی تھی۔

ریان بے اختیار ہنس پڑا'' آپ کا ملک کون سا ہے؟''

''پاکستان، پاکستان اور صرف پاکستان۔'' وہ جھٹ سے بولی۔''ہم برمنگھم میں صرف رہتے ہیں مگر احساس کمتری کا شکار لوگوں کی طرح خود کو برٹش نہیں بناتے پھرتے۔''

''آپ کا ملک کیا ہے؟''اس نے پوچھا۔

''یو۔کے۔'' وہ رکا،اور قدرے توقف سے بولا۔

''میری دادی! سکاٹش تھی۔ دادا پاکستانی اور میری ماں فرنچ۔''

''تو آپ برٹش کیسے ہوئے؟'' اچھنبے سے پوچھنے لگی۔

ریان نے رخ پھیر کر اسے دیکھا''اگر وطنیت یا قومیت کا تعین ثقافت اور آباؤ اجداد کے ملک سے ہی ہوتا ہے تو میری دادی کے برٹش ہونے کی وجہ سے میں بھی برٹش ہوا۔''

''پھر تو آپ فرنچ بھی ہوئے؟'' وہ بے ساختہ بولی۔

''مما کی وجہ سے؟''اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور سر ہلا دیا۔''بالکل۔''

''اور پھر پاکستانی فادر کے باعث آپ تھوڑے بہت پاکستانی بھی بن گئے تھے؟'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''مگر میں انگلش ہوں۔'' وہ متذبذب تھا۔

''کیسے؟'' وہ مسکرا کر پوچھنے لگی۔

''دادی اسکاٹش تھیں، میں برٹش ہوں۔ دیٹس آل۔'' وہ کچھ اکتا کر بولا۔

''پہچان باپ اور دادا سے بنتی ہے یا دادی اور ماں سے؟''

ریان خاموشی سے اسے دیکھنے لگ گیا۔

''اگر آپ کو کبھی بین الاقوامی لیول پر کرکٹ کھیلنے کا موقع ملے تو انگلینڈ کی نمائندگی کریں گے یا پاکستان کی؟'' وہ واقعی بہت تیز اور چالاک تھی۔

''انگلینڈ کی، کیونکہ میں یہاں رہتا ہوں۔'' وہ جھلا کر بولا۔

''اور ساجد محمود کی طرح غداری کا طوق گلے میں پہن لیں گے؟''

''اچھا......چلو میں پاکستانی ہوں۔ اب ٹھیک؟ میرا کرکٹر بننے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اسی لیے اس بحث و چھوڑو۔'' وہ لاجواب ہونا نہیں چاہتا تھا۔

''نام کیا ہے آپ کا؟'' وہ بھی سب کچھ بھول کر پوچھنے لگی۔

''ریان حیدر۔''

"نام تو پاکستانی ہے، ریحان حیدر۔" اس نے اس کا نام دہرایا۔

"ریحان نہیں ریان۔" اس نے فوراً تصحیح کی۔

"اچھا! وہ نعمان اعجاز کے بیٹے کا نام بھی ریان ہے۔ نعمان اعجاز پتا ہے؟ وہ "دشت" والا بالاج۔"

"تو پھر یہ طے ہے ریان کہ آپ پاکستانی ہو؟"

"جی۔" عائشہ کے پوچھنے پر اس نے اردو میں یوں اعتراف کیا، جیسے کوئی اعتراف جرم کرتا ہے۔

☆☆☆

"تم نے آگے کیا سوچا ہے؟" اس نے اینجلینا کے مقابل صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اینجلینا کچھ دیر پہلے ہی اس کی طرف آئی تھی۔

"میں نے لورپول کے لیے اپلائی کیا ہے۔ اب دیکھو۔" پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔ "ویسے ڈینی اور میرین بھی لورپول جا رہے ہیں۔"

"ہوں۔" وہ گہری سوچ میں تھا۔

"تم نے کیا سوچا ہے رونی؟" اینجلینا کے پوچھنے پر اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں بھی پھر ظاہر ہے وہیں جاؤں گا جہاں تم لوگ جاؤ گے۔ ویسے میں نے پیرس میں بھی اپلائی کیا ہے لیکن اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ میرے ڈیڈ چاہتے ہیں کہ میں واپس آ جاؤں۔"

"واپس پاکستان؟" اس نے حیرت سے کہتے ہوئے کپ واپس رکھ دیا۔ "تمہارا ابھی تک دماغ خراب نہیں ہوا۔ اسی لیے مجھے یقین ہے کہ تم واپس نہیں جاؤ گے۔"

"اس میں دماغ خراب ہونے والی بات کہاں سے آ گئی؟" اس نے کچھ بےزاری سے پوچھا۔

"ظاہر ہے، جس کا دماغ خراب ہوگا، وہی ایک پس ماندہ، غیر ترقی یافتہ اور غیر مہذب ملک جائے گا۔ تم خود سوچو، کیا ویلیو ہے پاکستان کی یہاں پر؟ یہاں لوگ پاکستان کو فقیر کہتے ہیں، دہشت گرد کہتے ہیں۔ صرف برطانوی شہریوں کی بات نہ کرو۔ مصری، افغانی، ترکی اور عراقی مسلمانوں کو دیکھ لو، وہ تھوکتے ہیں پاکستانیوں پر نفرت کرتے ہیں پاکستان سے۔ اس لیے فار گاڈ سیک۔ تم وہاں کبھی مت جانا۔" اینجلینا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

ریان خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"کیا سوچنے لگے ہو؟" اس کو خاموش پا کر اینجلینا نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"سوچ رہا ہوں کہ پاکستان تمہاری نظر میں ایسا ہے تو پھر میں بھی پاکستانی ہونے کے ناطے ایسا ہی ہوں گا۔" وہ اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے نہایت سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"تم؟ نہیں تو۔ تم کون سا پاکستانی ہو۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"کیوں؟ میں پاکستانی نہیں ہوں کیا؟"

"نہیں، تم تو فرنچ ہو۔"

''کیوں نہیں ہوں؟'' اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ عائشہ کے کہے گئے جملے اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔

''تم کیا بیک ورڈ مسلمانوں کی طرح لڑنے لگ گئے ہو، ہاں؟'' وہ خفگی سے بولی۔ زندگی میں پہلی بار وہ دونوں اس طرح ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے۔

''مسلمان بیک ورڈ نہیں ہوتے انجلینا'' وہ ایک دم ہی کھول اٹھا تھا۔

''ہوتے ہیں۔'' وہ جواباً چیخ کو بولی۔ ''یہ جس طرح تم بات کر رہے ہو نا، یہی ظاہر کرتا ہے کہ تم اتنا پڑھ لکھ کر بھی کتنی بدلحاظی سے بی ہیو کر رہے ہو۔''

''میں بدلحاظ ہوں، اور تم کیا ہو؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''فار گاڈ سیک ریان! میرا دماغ مت کھاؤ۔'' وہ چڑ کر بولی۔ ''ڈیڈی صحیح کہتے تھے، مسلمانوں سے دوستی نہیں رکھنی چاہیے۔''

''اچھا یعنی کہ میں کزن اور دوست نہیں، صرف مسلمان ہوں تمہاری نظر میں؟ باقی سب رشتے ختم؟ مجھے اپنے مذہب پر فخر ہے اور تم کیا ہو، اور تمہارا مذہب کیا ہے، ہاں؟ تم لوگوں کے پاس جو کتاب ہے، وہ بھی خود لکھی گئی ہے، نہ کہ اللہ کا کلام ہے، جاؤ، جا کر ''ڈونچی کوڈ'' پڑھ لو، سمجھ میں آجائے گی۔ تم ایک جھوٹے مذہب کی پیروکار ہو، اور میرا مذہب سچا ہے۔''

وہ غصے سے اونچا اونچا بول رہا تھا۔ ''اگر ڈیڈی اتنا منع کرتے تھے مسلمانوں سے دوستی کرنے سے تو تم نے کیوں کی مجھ سے دوستی؟ یا شاید......'' اس نے لہجے کو طنزیہ کر دیا۔

''یا شاید تمہیں کھانے پینے کی عادت کے باعث کوئی ایسا بندہ چاہیے تھا جو تمہیں کھلا سکے۔''

''مائی فٹ۔'' وہ غصے سے کھڑی ہوئی۔ ''یو باسٹرڈ!''

''یو سن آف اے بچ یو۔''

وہ پیر پٹخ کر وہاں سے چلی گئی۔ وہ نڈھال سا ہو کر صوفے پر گر گیا۔

زندگی میں پہلی بار وہ اتنا ہرٹ ہوا تھا۔

اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔ سلسلہ ملنے پر وہ کہنے لگا ''ڈیڈ! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''ہاں کہو...... پیسے چاہئیں؟'' وہ مصروف لہجے میں بولے۔

کوئی وزنی پتھر تھا جو ریان کے سر پر گرا تھا۔ وہ فون کو دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

ایڈمیشن اسے آسانی سے مل گیا تھا، اور اپنے تئیں اس نے پوری دلجمعی سے پڑھائی کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر دل اتنا بے زار تھا کہ کسی کام میں نہ لگتا تھا۔

پیرس اس کا پسندیدہ شہر تھا۔اس کا پورا بچپن یہاں گزرا تھا، اسے ان گلیوں اور سڑکوں پر چلتے ہوئے اپنا گزرا ہوا دور بہت یاد آتا تھا۔

اس نے خود کو کافی چیزوں میں الجھا رکھا تھا۔ وہ روز راؤن میوزم میں جا کر پکاسو، اینجلو، میکس ارنسٹ اور دیگر مشہور آرٹسٹوں کی پینٹنگز کی کاپیز تیار کرتا تھا، اور بعد میں ان کے سائن بھی نقل مار کر ان پر کر دیتا یوں وہ مکمل طور پر ''Fake'' بن جاتیں اور آرٹ کی دنیا میں Fake تیار کرنا بھی ایک بڑا کام ہوتا ہے۔

اس کی زندگی ایک عجیب دوراہے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ جس آرٹ کے لیے اس نے پیرس میں ایڈمیشن لیا تھا، اس آرٹ کو اس نے ایک سال بعد ہی چھوڑ دیا۔

جانے کیوں وہ پڑھائی سے بے زار ہو گیا تھا، سارا سارا دن باہر گھومتا رہتا، پینٹنگز بناتا رہتا مگر نہ تو اس نے نمائش کرائی نہ ہی ان کو بیچنے کی کوشش کی۔

وہ ذہنی خلفشار سے بچنے کے لیے پیرس کی ٹورسٹ ایٹریکشنز پر چلا جاتا اور اپنا پورا دن وہیں لگا کر واپس جب رات کو گھر لوٹتا تو ایک دفعہ پھر ناسٹیلجیا کا شکار ہو جاتا۔

☆☆☆

زیر لب فرنچ نیشنل اینتھم کی خوب صورت دھن کو گنگناتا ہوا وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

لونگ روم میں ہی وہ ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ ایک پنک اسٹریپ والی نازک جوتی کسی نے صوفے پر رکھی بلکہ پھینکی ہوئی تھی۔ اسی طرح کی ایک اور جوتی، کارپٹ پر الٹی پڑی تھی۔

پچھلے ایک سال اور دو ماہ تک تنہا رہنے والے کنوارے اور نیک طبیعت اور اچھے خاصے شریف لڑکے کے گھر میں زنانہ سینڈل؟

''یہ جو بھی ہے، لاکڈ اپارٹمنٹ میں داخل کیسے ہوئی؟'' اس نے حیرت سے ان جوتوں کو دیکھتے ہوئے سوچا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''اوہ۔ مر گیا۔'' اپنے بیڈ پر اس کو دراز دیکھ کر ریان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کا پورا وجود کمبل کے اندر پوشیدہ تھا، البتہ بھورے بال دکھائی دے رہے تھے۔ موزیل!'' اس نے بے ساختہ پکارا۔

''اوں ہوں۔'' اس نے کھنکار کر اسے متوجہ کرنا چاہا مگر نتیجہ بے سود۔

جھلا کر ریان آگے بڑھا اور اس کے کندھے کو زور سے ہلایا۔ وہ تب بھی نہ اٹھی تو اس نے کمبل ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

''اوہ!'' ہونٹوں کو سکیڑ کر سینے میں دبی سانس آزاد کیا۔

''اٹھو۔'' وہ تحکمانہ لہجے میں خواب خرگوش کے مزے لیتی انیہ سے بولا۔

''اوہ؟'' انیہ نے ناگواری سے اس کی جانب ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔

''کب آئیں؟'' وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''صبح۔تم نہیں تھے۔'' وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

''اکیلی ہو؟'' وہ سمجھ گیا کہ وہ اپنے ماموں کی طرف آئی ہوگی۔

''تم سکول سے آگئے؟'' انیہ نے اس سے پوچھا۔

''آں۔ہاں۔'' وہ گڑبڑا کر بولا کہ دنیا کا سب سے مشکل کام انیہ سے جھوٹ بولنا تھا۔

''اچھا؟'' ریان کو لگا اس کے انداز میں طنز ہے۔

''ہاں۔بھئی۔وہیں تھا؟''

''مگر جب میں صبح تمہارے انسٹیٹیوٹ گئی تو پتا چلا کہ تم نے پچھلے دو ماہ سے وہاں آنے کی زحمت ہی نہیں کی۔'' ایک لمحے کو رکی اور پھر کہنے لگی۔''مجھ سے جھوٹ بولو گے ریان؟''

'میں نے سکول چھوڑ دیا ہے۔'' اس نے سر جھکا لیا۔

''گڈ۔'' انیہ کے لہجے کی بشاشت لوٹ آئی تھی۔''تم کنسلٹنٹ کیوں نہیں بن جاتے؟ مجھے وہ بات بتا رہے ہو، جو مجھے پتا ہے۔''

''میں اس ماحول میں مس فٹ ہوں۔'' اس نے گویا اعتراف کیا۔

''وجہ؟'' ٹھوڑی تلے ہتھیلی جمائے وہ پوچھنے لگی۔

''مجھے اپنا آپ وہاں ٹھیک نہیں لگتا۔'' اس کے لہجے میں شکستگی تھی۔

''تم نے کبھی سوچا ریان! کہ تم کون ہو؟'' آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے وہ پوچھ رہی تھی۔

''میں؟ میں ریان ہوں۔ریان عظیم حیدر!'' ریان نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔''اور مسلمان ہوں۔''

''اور.....؟''

''اور...... برٹش نیشنل ہوں۔''

''اور......؟'' اسی انداز میں پوچھا۔

''پیدائشی فرنچ ہوں۔''

''اور......؟''

''ایک آرٹسٹ ہوں۔''

''اور......؟''

''اور کیا......؟'' وہ زچ ہو گیا۔

''برٹش ہو یا فرنچ ہو؟'' انیہ پہلے اور چوتھے لفظ پر زور دے کر بولی۔

''مکس ہوں۔'' ریان نے شانے اچکائے۔

''مکس کچھ نہیں ہوتا۔انسان کوئی ایک چیز ہوتا ہے، یا کچھ نہیں ہوتا۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''تمہیں تمہاری پہچان کرانا چاہتی ہوں، کیوں کہ ہماری فیملی میں ایک تم ہی ہو جس کی اپنی پہچان نہیں ہے۔''

''مطلب؟'' اس نے ابرو اٹھائی۔

''مطلب یہ ریان! کہ تم کنفیوژن کا شکار ہو۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔

''کس چیز کی کنفیوژن ہے؟'' وہ الجھ کر بولا۔

''اپنی شناخت کی۔''

''مجھے پتا ہے میں برٹش ہوں۔''

''لیکن اگر تم فرنچ نیشنیلٹی کے لیے اپلائی کرو، تو فرانس میں پیدا ہونے کے ناتے، تم فرنچ نیشنل بھی بن سکتے ہو۔'' وہ استہزائیہ مسکرائی۔

''ہاں، پھر؟''

''اگر تمہارے پاس دونوں نیشنلٹی ہوں تو کیا ہو گے؟''

''میں...... '' وہ تذبذب کے عالم میں کچھ بولنے لگا، مگر رک گیا۔

''کنفیوز ہو گئے نا؟''

''تم مجھے کنفیوز کر رہی ہو۔'' وہ الجھا تھا، اسی لیے الزام بہن کے سر پر ڈال دیا۔

انیہ کے استفسار پر ریان کو ایک ڈیڑھ برس پہلے ملنے والی عائشہ یاد آ گئی۔ وہ بھی ایسی ہی باتیں کرتی تھی۔

''مجھے نہیں پتا۔'' اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہتے ہوئے گردن نفی میں ہلا دی۔ انیہ نے ترحم آمیز نگاہوں سے اس کو دیکھا۔ ''تم کنفیوزڈ ہو۔''

''پھر کیا کروں؟''

''اپنا محاسبہ کرو۔''

''تمہیں پاکستان کا قومی ترانہ آتا ہے؟''

''نہیں۔'' اس کے جواب پر انیہ چند ثانیے اس کا چہرہ دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''انگلش اور اسپینش بھی آتی ہیں۔''

''ہاں۔'' اس نے مثبت جواب دیا۔

''اسپینش لکھنا آتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اردو لکھنا آتی ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے سر نفی میں ہلایا۔

''کیوں؟''

''کبھی سیکھی نہیں۔''

''کیوں نہیں سیکھی؟''

''دل نہیں چاہا۔'' اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

''تمہیں وہ زبان نہیں آتی جو تمہاری ہے، تمہارے باپ کی ہے۔ تمہارا شہر کراچی ہے، نیو کاسل یا پیرس نہیں۔ تم اس وقت اپنے نہیں غیروں کے ملک میں بیٹھے ہو۔ ریان پلیز! خود کو پہچانو، تم جتنے ''فرنگی'' بن جاؤ، رہو گے تم پاکستانی ہی کیونکہ تمہارے خون میں پاک مٹی کی خوشبو ہے۔ خود کو پہچانو۔''

''رائٹ......'' اس نے سر ہلا دیا۔ ''میں پاکستانی ہوں۔ پھر کیا کروں؟''

''تمہارے ملک کو تمہاری ضرورت ہے۔ تم......''

''میری ضرورت؟ میں الحمرا ہال میں اپنے آرٹ کی نمائش کروں؟ کیا کروں میں پاکستان کے لیے؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''تمہیں اللہ نے سب کچھ دیا ہے۔ تمہارا تعلق ان مشہور بائیس خاندانوں میں سے ایک ہے جنہوں نے پاکستان کی دولت بانٹ رکھی ہے۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔

''اوکے۔ تم چاہتی ہو کہ میں سٹاک ایکسچینج کا انڈکس بڑھاؤں، پاکستان میں پیسہ بھیج کر؟'' وہ کچھ سمجھ کر بولا۔ ''میں بھجواؤں گا۔''

''نہیں......سٹاک ایکسچینج کو تمہاری بیساکھی کی ضرورت نہیں ہے۔ پاکستان میں کئی بڑے سرمایہ دار ہیں۔ اللہ نے ہمارے ملک کو بہت دیا ہے۔'' وہ لٹھ مار انداز میں بولی۔

''پھر کیا کروں؟''

''پاکستان واپس آ جاؤ اور اسے بہتر بناؤ۔ اپنے ملک کے لیے کچھ کرو۔'' وہ پرعزم لہجے میں بولی۔

''انیہ......! صرف تم اکیلی محب وطن نہیں ہو، میں بھی اپنے ملک سے بہت محبت کرتا ہوں۔ آئی ریئلی لو پاکستان!''

''شٹ اپ ریان! جسٹ شٹ اپ۔'' انیہ نے اسے ٹوکا۔ ''یہ ملک ہے، تمہاری محبوبہ نہیں جسے تم آئی لو یو کی لوری سنا کر بہلانا چاہ رہے ہو، یہ تمہارا ملک ہے، اسے نام نہاد عشقیہ ڈائیلاگز کی نہیں، کام کی ضرورت ہے۔ اسے اپنے اس کھوئے ہوئے دماغ کی تلاش ہے جو دوسرے ملکوں میں کام کر رہا ہے۔

یاد رکھو! خواص ہمیشہ عوام میں سے نکلتے ہیں اور وہ ویسے ہی ہوتے ہیں جیسی عوام ہوتی ہے۔ اگر حکمران کرپٹ ہے تو قوم بھی کرپٹ ہے اور اگر قوم بے ایمان اور جھوٹی، سست اور کاہل ہے تو یہ تمام وصف حکمران میں بھی موجود ہوں گے۔ ایک قوم پر ہمیشہ ویسا ہی سردار مسلط کیا جاتا ہے جیسی وہ ہوتی ہے۔ تم گورنمنٹ کو الزام نہیں دے سکتے، ریان!''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''مگر انیہ میں کیا کروں؟ اپنے آرٹ کو انٹرنیشنل سطح پر متعارف کروا کے اپنے ملک کا نام روشن کروں؟''

''تم پاکستان آجاؤ، انڈس ویلی میں ایڈمیشن لے لو اور بے شک پینٹنگ کرتے رہو، مگر اس کو بطور کیریر مت لو کیونکہ اس سے ملک کو اتنا فائدہ نہیں ہوگا۔'' وہ خاموش ہوگئی۔

''پھر کیریر کس چیز کو لوں، بزنس کو؟ ڈیڈ کا ہاتھ بٹاؤں؟ ٹھیک ہے۔'' وہ فوراً مان گیا۔

''تم بزنس میں مت آؤ۔''

''پھر؟''

''کرکٹ......''

''کیا؟'' وہ سمجھا نہیں۔

''تم کرکٹر بن جاؤ۔'' انیہ آہستگی سے بولی۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟'' وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں نا! تم بہت اچھی کرکٹ کھیلتے ہو، اور دیکھنا، ایک روز تم کرکٹ اسٹار بنو گے۔'' وہ اگلے پندرہ منٹ تک اس موضوع پر بات کرتے رہے اور ریان نے ہار مان لی۔

انیہ کو امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے مان جائے گا، خود ریان کو بھی یہ امید نہ تھی۔

☆☆☆

''بیٹا! کیا بات ہے تم کافی کمزور ہوتی جا رہی ہو؟'' رانیہ نے فکرمندی سے پیاز کاٹتی الماس کو دیکھ کر پوچھا۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ''نہیں تو۔'' وہ فوراً بولی۔ انیہ خاموش نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں وہ ایک دفعہ پھر پیاز کاٹنے میں مگن ہو چکی تھی۔

رانیہ کو ٹوہ لینے کی عادت کبھی نہیں رہی تھی مگر اس کے باوجود بھی الماس کے رویے میں چند ماہ سے آئی تبدیلی وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔

الماس کچھ عرصہ قبل تین روز تک اپنے کوارٹر میں بیمار پڑی رہی تھی۔ اس کو بخار ہو گیا تھا اور سر میں بے تحاشا درد تھا۔ وہ اسے لے کر ہاسپٹل گئی تھیں، ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ اس لڑکی کو کوئی ڈپریشن ہے، رانیہ کی سمجھ میں اس ڈپریشن کی وجہ نہیں آئی تھی۔

ہسپتال سے آنے کے بعد الماس کا رویہ یکسر تبدیل تھا۔ وہ اب غیر ضروری گفتگو نہیں کرتی تھی جواب ہوں ہاں۔ میں دینے لگی اور اس نے رغبت سے کھانا ترک کر دیا تھا۔

اس کے اندر صرف یہی تبدیلی نہیں آئی تھی، رانیہ نے نوٹ کیا تھا، وہ جب بھی کچھ کہہ رہی ہوتیں تو الماس نہایت غور سے انہیں دیکھ رہی ہوتی پھر وہ ان کی طرح بولنے کی کوشش کرتی، ایک طرح سے ان کا نرم اور صاف اردو والا لب و لہجہ نقل کرنے کی کوشش کرتی اس چیز نے اس کے بولنے کے انداز میں بے حد فرق ڈالا تھا وہ پہلے سے صاف اور اچھا بولنے لگی تھی۔

کئی ایک دفعہ انیہ نے اسے آئینے کے پاس کھڑے، اپنا عکس دیکھتے دیکھا تھا۔ اسے بلاوجہ ٹوکنے کی عادت

نہیں تھی، اسی لیے اس کو کچھ نہ کہا، مگر بہر حال اتنا تو وہ سمجھ چکی تھیں کہ الماس پہلے سے زیادہ اپنے بارے میں کانشس ہوگئی تھی۔

خوب صورت تو وہ تھی مگر میلے اور گندے لباس اور چہرے کے قدرے فربہی مائل ہونے کے باعث وہ حسن چھپ سا گیا تھا مگر جب سے اس نے اپنا خیال رکھنا شروع کیا تو اس کی رنگت ایک دفعہ پھر سے نکھر آئی تھی۔ اب وہ اچھے کپڑے پہنتی تھی اور اپنی تنخواہ کپڑوں جوتوں پر خرچ کرنے لگی تھی۔ کم خوراک لینے کے باعث وہ پہلے سے آدھی رہ گئی تھی اور چہرے کے نقش اور بھی واضح ہوگئے تھے۔

فون کی گھنٹی پر رانیہ جیسے کسی سوچ سے باہر نکلی تھیں۔ انہوں نے سوچا کہ الماس کو فون اٹھانے کا کہہ دیں مگر اب وہ فون نہیں ریسیو کرتی تھی۔ اس نے چند ماہ پہلے رانیہ سے کہا تھا کہ ''مجھے فون اٹھانے کا نہ کہا کریں۔ مجھے فون سے ڈر لگتا ہے۔'' سو اسی لیے رانیہ نے پھر کبھی اسے فون اٹھانے کو نہیں کہا۔

''ہیلو۔'' انہوں نے ریسیور اٹھا کر کہا تو الماس نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی جانب متوجہ ہوگئی۔

''ہاں کیسی ہو؟...... اچھا تم ملیں رونی سے؟'' ان کے لبوں پر ایک مسکراہٹ بکھر گئی۔ ''اچھا پھر کیا کہتا ہے؟...... ہوں...... رئیلی، کر لیا تم نے اسے راضی؟...... اوہ ویٹس گریٹ......'' وہ دوسری طرف سے کچھ سننے لگیں جبکہ الماس مضطرب سی ہو کر انہیں دیکھے گئی۔

''پھر کب آرہا ہے ریان کراچی؟''

وہ اور بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر الماس سے سنا ہی نہیں گیا۔ وہ شل سی ہو کر جہاں تھی وہیں بیٹھی رہی۔

وہ کراچی آرہا ہے، شاید چھٹیاں گزارنے، مگر...... مگر وہ اس کی موجودگی میں وہاں کس طرح رہ سکتی ہے؟ اس شخص نے اس کی عزت نفس کو کچلا تھا اس کے ساتھ ٹائم پاس کیا تھا، اور اب، اب وہ کس طرح اس کا سامنا کرے گی؟ نہیں، اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ کہیں بھی لیکن یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ مگر وہ جائے تو جائے کہاں؟ اس کا تو اس پوری دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ کوئی عزیز رشتہ دار وہ تو کسی کو بھی نہیں جانتی تھی۔ پھر وہ کیا کرے؟

''میرا بیٹا، ریان، اس ہفتے کراچی آرہا ہے۔'' رانیہ فون بند کرنے کے بعد خوشی خوشی اسے بتانے لگی تھیں۔

''اتنا عرصہ ہوگیا ہے نا اسے دیکھے ہوئے۔'' وہ اپنی دھن میں مگن بولے جارہی تھی جبکہ اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان سا برپا تھا۔

اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ وہ کس کو جانتی تھی۔ نہ ہی کوئی دوست احباب صرف رانیہ ہی تھیں اور...... اور ایک جھماکے سے اسے وہ یاد آیا تھا۔

''رمیز۔''

''ہاں، اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی مدد کرے گا۔ پھر اسے ضرور اس سے رابطہ کرنا چاہیے۔ اسے یاد آیا رمیز نے اسے اپنا ایک کارڈ دیا تھا۔ وہ کارڈ ابھی تک اس کے پاس موجود تھا۔

''میم!'' کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ ''مجھے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔''

''ہاں کہو۔'' وہ اس کی جانب فوراً متوجہ ہوئی۔

''وہ میم......! میں اپنی ایک خالہ کے پاس لاہور جانا چاہتی ہوں۔ مجھے کل بازار میں وہ ملی تھیں، انہوں نے مجھے اپنا پتہ دیا تھا۔''

''کیوں؟ کوئی مسئلہ ہے یہاں؟'' رانیہ کو حیرت ہوئی۔

''نہیں میم......! وہ بس وہ میں اپنی خالہ کے پاس جانا چاہتی ہوں۔''

''چلو، جیسے تمہاری مرضی۔'' رانیہ بھی خاموش ہو گئیں۔

چار دن بعد الماس وہاں سے نکل گئی۔

پانچویں روز ریان کراچی آ گیا اور اس کے آتے ہی گھر میں ہنگامے اور رونق جاگ اٹھی۔

☆☆☆

ریان جسے کرکٹ سے نفرت تھی، اب اسی کھیل نے اپنی جانب متوجہ کرنا شروع کر دیا۔ اپنی حسِ مزاح کے علاوہ اس کے خیال میں وہ اپنی تمام عادتیں بدل چکا تھا، مگر وہ کہتے ہیں نا کہ فطرت نہیں بدلتی۔ بچپن سے اسے انتقام لینے کی جو عادت تھی، اس کے خیال میں وہ اسے بھی چھوڑ چکا تھا، لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی کیونکہ وہ اس کی عادت نہیں تھی، وہ اس کی فطرت تھی۔

کچھ انیہ کی باتوں کا اثر تھا، کچھ عائشہ کی گفتگو ذہن پر نقش ہو گئی تھی اور کچھ ٹاکینی سائیڈ کپ جیتنے کے بعد ملنے والی فتح اور سرشاری کا احساس تھا جو اسے محسوس ہوا تھا، اس کو کرکٹ میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ تعریفوں اور داد کا بھوکا تھا، نہ ہی شہرت کا لالچی، بس اپنے ملک کی گرین کیپ سر پر رکھنے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا تھا۔

وہ جلدی جلدی ناشتہ کر رہا تھا ایک کے بعد ایک نوالہ منہ میں رکھتا اور تقریباً بغیر چبائے ہی نگل جاتا، بالآخر علی کو اسے ٹوکنا ہی پڑا۔ ''رونی! آرام سے، آرام سے تیری کون سی فلائٹ نکلی جا رہی ہے؟''

اس نے غٹاغٹ اورنج جوس کا گلاس پیتے ہوئے علی کی بات سنی اور جوس ختم کر کے بولا ''امریکہ کی فلائٹ نکلی جا رہی ہے۔ وہ کل امریکی صدر کا فون آیا تھا، کہہ رہا تھا مجھ سے مشرقِ وسطیٰ کی صورت حال کنٹرول نہیں ہو رہی، تم آ جاؤ، یہاں ایک ذہین آدمی کی ضرورت ہے۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ کر کھانے میں دوبارہ مگن ہو گیا۔

''فار گاڈ سیک۔'' علی بے اختیار ہنس پڑا۔

ریان ناشتہ ختم ہی کرنے والا تھا جب اسے محسوس ہوا کہ بیہ مسلسل اسے دیکھ رہی ہے جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ اس نے سر اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے بیہ کو دیکھا۔

''وہ...... بھائی! آپ رات کو کھانے پر کیا کریں گے؟'' وہ اس کو متوجہ پا کر جلدی جلدی کہنے لگی۔

''میرا مطلب تھا کہ...... آپ فارغ ہیں نا؟''

''آ...... ہاں پتا نہیں کس ٹائم؟'' وہ عجلت میں بولا۔

''رات کو آٹھ بجے۔'' وہ کہہ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''یار! آج ہمارا بڑا اہم میچ ہے، شاید اس وقت فارغ ہو جاؤں۔ مگر یوں خیریت؟'' وہ متجسس سا ہو کر پوچھنے لگا۔

''وہ......اصل میں، میں آج ڈنر دے رہی ہوں سب کو۔'' دبے دبے جوش کے ساتھ اس نے بتایا۔

''ہوں۔'' ریان نے آخری نوالہ حلق میں اتارا۔

''بڑی سخی ہوگئی ہو۔'' وہ ازراہ مذاق کہنے لگا یہ پوچھے بغیر کہ وہ ڈنر کیوں دے رہی ہے۔

میچ نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا وہ اتنا مگن ہو کر میچ کھیلتا رہا کہ صبح ناشتے کی ٹیبل پر ہیہ سے کیا وعدہ بھول گیا۔ اس نے کوشش کرنے کا کہا تھا مگر کوشش بھی نہ کی۔

رات تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ گھر لوٹا۔ وہاں سے اپنے کمرے کی جانب جانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظر صوفے پر بیٹھے لیپ ٹاپ پر کسی کام میں مصروف علی پر پڑی۔ خلاف معمول وہ گھر پر تھا۔

اس نے سلام کیا جس کا علی نے مبہم سا جواب دیا، وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھا ہی تھا کہ علی کی آواز پر پلٹا، وہ کہہ رہا تھا۔

''کام اہمیت رکھتا ہے لیکن فیملی زیادہ اہم ہے۔'' ریان دروازے سے ہی پلٹ آیا اور اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''صبح ہیہ نے تم سے کچھ کہا تھا۔'' علی ابھی بھی سکرین کو دیکھ رہا تھا۔

''اوہ۔'' اسے یاد آگیا تھا۔ ''بس کیا کرتا، بزی تھا بہت امپورٹنٹ میچ تھا۔''

''علی! ایک ڈنر ہی تھا، کیا ہوگیا ہے؟'' وہ اس تفتیش سے قدرے بے زار ہو کر بولا۔

''تمہیں اتنا بھی یاد نہیں کہ آج ہیہ کی برتھ ڈے تھی، جس کی خوشی میں وہ ڈنر دے رہی تھی۔''

''اوہ گاڈ!'' ریان ایک دم شاکڈ رہ گیا۔ اس نے ہیہ کو برتھ ڈے وش تک نہیں کیا۔ اب اسے علی کے غصے کی وجہ سمجھ میں آئی۔

''میں، میں یار! بھول گیا تھا۔'' اس نے بے اختیار سر پر ہاتھ مارا۔

''بھولتے وہ بات ہیں جو یاد رکھی جائے، تمہیں تو شاید یہ بات یاد ہی نہیں تھی۔''

''گڈ نائٹ۔'' ریان کو اتنا کڑوا سچ اچھا نہیں لگا، وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

گریجویشن کرنے کے بعد ریان نے پی آئی اے کی ٹیم کو چھوڑ کر حبیب بینک کو جوائن کر لیا۔

اس کا شیڈول ایک دم ٹف ہوگیا تھا۔ صبح نماز کے بعد اس نے سونا چھوڑ کر مسلسل چار گھنٹے ورزش کرنا شروع کر دی۔ وہ ناشتہ جم سے آکر ہی کرتا تھا اور پھر سیدھا سٹیڈیم چلا جاتا۔ وہ لوگ ابھی ایک ڈومیسٹک لیول کے سٹیڈیم میں پریکٹس اور میچ کھیلتے تھے، وہ ٹیم میں بطور لیفٹ آرمر کے شامل ہوا اور اس نے اپنی ٹیم کو کئی فتوحات سے ہمکنار کیا تھا۔

باؤلنگ کرتے ہوئے اس کی ذہانت بہت کام آتی تھی۔ وہ سوچ سمجھ کر، جانچ پرکھ کر باؤلنگ کراتا تھا اور حبیب بینک کی ٹیم کے لڑکے شکر ادا کرتے تھے کہ ریان حیدر ان کے مخالف نہیں کھیلتا۔

ایک اور چیز بھی اس کے ساتھی کرکٹرز کو اس کی بے حد پسند تھی اور وہ تھا اس کا مسکرانا۔ نرم شگفتہ لہجے میں بات کرنا، کسی کی دل آزاری نہ کرنا، ہر ایک کا خیال رکھنا اور ماحول کو خوشگوار بنائے رکھنا۔

ان ہی دنوں یہ بات اس کے علم میں آئی کہ انجلینا نے تھیٹر میں کام کرنا شروع کر دیا۔ ڈینئیل نے کسی چھوٹے سے فٹ بال کلب کو جوائن کر لیا تھا اور ریان کو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ فٹ بال سے بے زاری کے باوجود ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میرین کو میڈیکل میں ایڈمیشن نہیں ملا، اسی لیے وہ فرانس آ گئی اور اب عام مضامین میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ ریان کو اس کے یوں پیرس چلے آنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی نہ ہی اس کے پاس سمجھنے کو وقت تھا۔ وہ اپنی دنیا میں بے حد مگن تھا۔

ان ہی دنوں اس کو کراچی ڈولفنز کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ وہ اگلے اے بی این ایمرونوٹکی ٹوئنٹی کپ کے لیے منعقد کیے جانے والے ٹورنامنٹ میں حصہ لے گا، اس کے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کوئی نہ تھی۔

وہ پورا ٹورنامنٹ نیشنل سٹیڈیم، کراچی میں منعقد کیا گیا تھا اور ایک دن میں دو میچز کھیلے جانے تھے۔

وہ ریان کی زندگی کا ایک یادگار لمحہ تھا، جب اس نے آخری وکٹ لے کر اپنی ٹیم کو تین رنز سے فتح دلائی۔ وہ مین آف دی میچ اور مین آف دی ٹورنامنٹ بنا اور اس کو یقین تھا کہ وہ چیئرمین پی سی بی ڈاکٹر احسن، جو کہ گراؤنڈ میں تشریف فرما تھے کی نظر میں آ جائے گا۔

جو بات ریان حیدر کو معلوم نہ تھی، وہ یہ تھی کہ پاکستان کرکٹ بورڈ میں اگر کوئی چیز چلتی ہے تو وہ سیاست یا اقربا پروری ہے، اور اگر کچھ نہیں چلتا، تو وہ میرٹ کی بنیادوں پر کھلاڑیوں کا انتخاب ہے۔

☆☆☆

وہ چیئرمین پی سی بی کی نظروں میں آیا تھا یا نہیں، البتہ پاکستان کرکٹ ٹیم کے کپتان کی نگاہوں میں ضرور آیا تھا، اور ٹیم کی اصل تشکیل کپتان دیتا ہے۔ ریان کو تین دن بعد ہی پچیس روزہ کیمپ میں بلا لیا گیا۔

جن چالیس لڑکوں کو کیمپ میں بلایا گیا تھا، ان میں سے بیس تو بین الاقوامی سطح پر ملک کی نمائندگی کر چکے تھے اور ان کو نیشنل اکیڈمی میں ٹھہرایا گیا تھا مگر جو نئے لڑکے تھے، ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ''اپنی رہائش کا انتظام خود کرو'' کے تحت تمام نئے لڑکے اپنے رشتہ داروں دوستوں کے گھر، یا پھر ہوٹلز میں ٹھہرنے تھے۔

اس کو رہائش کا تو کوئی مسئلہ نہ تھا البتہ اتنے غیر پیشہ وارانہ انداز پر اس کا دل کھٹا ضرور تھا۔ وہ P.C میں ٹھہر گیا اور قذافی سٹیڈیم میں اپنے پہلے دن کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

قذافی سٹیڈیم جسے لیبیا کے معمر قذافی کے نام سے منسوب کیا گیا ہے، پاکستان کرکٹ کا ہیڈکوارٹر ہے۔ تمام ''پاور'' اسی عمارت اور اس کے آس پاس ہے۔ یہاں چیئرمین پی سی بی، اور تمام بڑی مچھلیوں یعنی آفیشلز کے دفاتر

موجود ہیں۔ڈاکٹر احسن ہفتے میں بمشکل دو روز ہی آفس میں بیٹھتے تھے۔

پچیس روزہ کیمپ میں ریان کو سیکھنے کو بہت کچھ ملا۔ڈینس للی اور عاقب سے اس نے باؤلنگ سیکھ کر اپنے ایکشن کو مزید نکھارا۔نیٹ پریکٹس کے دوران اس نے محسوس کیا کہ سینئر کرکٹرز ''چھوٹوں'' کو منہ تک نہیں لگاتے، اس نے بھی خوامخواہ کسی سے فری ہونے کی کوشش نہ کی۔

ان کو صرف پریکٹس کٹ ملی تھی، باقاعدہ پاکستانی ٹیم کی شرٹس اور کیپ ان کھلاڑیوں کو ملنا تھی جن کا سکواڈ میں نام آئے سکواڈ کا اعلان ہونے سے پچھلے روز اس نے اپنا نام ان چند خوش نصیبوں میں آنے کے لیے بہت دعا کی تھی۔کیمپ ختم ہوا تو وہ واپس کراچی آ گیا۔سولہ کو سکواڈ کا اعلان ہوا، اور ریان کا حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

اس کا نام ان اٹھارہ کھلاڑیوں میں شامل تھا۔

☆☆☆

اس کے پاس موجود رمیز کے کارڈز نے کوئی مسئلہ نہیں ہونے دیا تھا۔وہ بہت آرام سے اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔اب نہ دنیا کا خوف تھا، نہ لوگوں کا۔

رمیز کی ان دنوں کراچی میں پوسٹنگ تھی، سو وہ اس سے کراچی میں ہی ملی۔وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''ال.....الماس؟'' اسے اپنے آفس میں اپنی نگاہوں کے سامنے پا کر ایک بے یقینی سی کیفیت اس پر طاری تھی۔وہ بہت بدل گئی تھی۔

وہ آرام سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔اس کے چہرے پر بہر حال ایک شے ایسی تھی جو اے ایس پی رمیز نے پہلے.....نہیں دیکھی تھی۔وہ تھی سرد مہری اور سنجیدگی۔

''کیسی ہو تم؟ کہاں رہیں اتنا عرصہ؟'' وہ چھوٹتے ہی پوچھنے لگا۔

''مجھے کام چاہیے، کوئی جاب دلا دیں مجھے۔'' اسکی آواز اور لب و لہجہ سن کر رمیز کو بے اختیار جھٹکا لگا۔اس کے انداز میں اب وہ اجڈ اور گنوار پن کہیں بھی نہ تھا۔

''کیا کرنا چاہتی ہو تم؟'' اس کا سوال نظر انداز کیے جانا اسے اچھا نہیں لگا تھا مگر معلوم نہیں اس لڑکی میں ایسا کیا تھا کہ وہ برا مان ہی نہیں سکتا تھا۔

''مجھے بوتیک کا کام آتا ہے۔'' وہ مختصراً کہہ کر اپنے ناخن پر سے کیوٹکس کھرچنے لگی، جیسے وہ زیادہ اہم کام ہو۔

''میری ایک آنٹی ہیں، لاہور میں۔'' کافی دیر سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد اس کی آواز کمرے میں گونجی

''وہ ڈیزائنر ہیں۔ان کا ڈیفنس میں بوتیک ہے۔وہ دراصل ہماری پڑوسی ہوا کرتی تھیں بعد میں لاہور شفٹ ہو گئیں، تب بھی ہم لوگ ان کے گھر بہت آیا جایا کرتے تھے۔اب امی کی وفات کے بعد بھی میں ان کے ہاں کبھی کبھار چکر لگا لیا کرتا ہوں۔ان سے ذکر کرتا ہوں، ویسے بھی ان کا کوئی نہیں ہے۔ٹھیک ہے الماس!''

الماس خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی، پھر اس کے خاموش ہونے پر اس نے سر اٹھایا۔''مجھے الماس مت کہو میں نے اپنا نام بدل لیا ہے۔''

''کیوں؟'' وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

''کیونکہ میں خود بدل گئی ہوں۔'' وہ میز کی سطح انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔ ''اب میرا نام امل ہے۔ مجھے یہ نام بہت اچھا لگا کرتا تھا اسی لیے رکھ لیا۔''

اس کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

☆☆☆

''آنٹی! یہ الماس ہے اور امل کے نام سے پکاری جاتی ہے۔''

وہ رمیز کے ہمراہ لاہور آگئی تھی اور وہ اسے سیدھا اپنی آنٹی عفت کے گھر لے گیا تھا اور اب اس کا تعارف کرا رہا تھا۔

''میں نے آپ کو فون پر بتایا تھا۔''

رمیز نے جانے فون پر کیا کہانی سُنائی تھی کہ عفت بیگم نے اس سے ماضی کے بارے میں ایک سوال نہیں کیا بلکہ اسے نہایت خوش دلی سے اپنے گھر میں ویلکم کیا اور بوتیک پر کام دینے پر فوراً رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔ جب اس نے ویمن ہاسٹل میں رہنے کی بات کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ اب وہ ان کے گھر میں ان کی بیٹی بن کر رہے گی۔

''میں اکیلی ہوتی ہوں، نہ شوہر نہ بچے کبھی سوچتی تھی کہ ایک بچہ ایڈاپٹ کر لوں مگر پالنا مشکل تھا لیکن اب تو اللہ نے مجھے ایک پلی پلائی بیٹی دے دی ہے۔ مجھے اب اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

وہ نہایت شفقت سے کہہ رہی تھیں اور امل سوچ رہی تھی کہ اگر اس کا یہ خیال تھا کہ رانیہ کے علاوہ دنیا میں اچھے لوگ موجود نہیں تو وہ بے حد غلط تھا۔ ابھی دنیا میں عفت بیگم جیسے لوگ بھی موجود تھے جو ضرورت مندوں کے لیے بانہیں وا رکھے ہوئے تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر احسن سے امل کی پہلی ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔

عفت بیگم خاصی اثر و رسوخ والی اور سوشل خاتون تھیں، اپنی حدود میں رہتے ہوئے کچھ ماڈرن بھی تھیں اور ان کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔

''امل! ان سے ملو، یہ میری بہت اچھی فرینڈ ہے، نائلہ۔'' عفت بیگم نے اسے ایک جدید تراش خراش کے ڈریس میں ملبوس مڈل ایجڈ خاتون سے ملوایا۔ جنہوں نے اپنے چہرے کو فیشلز اور پتا نہیں کن ٹوٹکوں سے جوان، جبکہ بالوں کو گہرے بھورے ڈائی سے رنگا ہوا تھا۔

''اور نائلہ! یہ میری فرینڈ کی بیٹی ہے، امل! اپنی ممی کی ڈیتھ کے بعد اب میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔'' وہ اس کا تعارف کرانے لگیں۔

امل نے نہایت شائستگی سے انہیں سلام کیا۔

''کیا کرتی ہو آپ بیٹا؟'' وہ اس سے پوچھنے لگیں۔

''میں سیکنڈ ائیر میں پڑھتی ہوں۔'' وہ کچھ جھجک کر بتانے لگی۔ لاہور آنے کے بعد اس نے لاہور کالج میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔

''یونو نائلہ! یہ جو ڈریس امل نے پہن رکھا ہے، یہ اس نے خود ڈیزائن کیا ہے۔'' وہ انہیں بتانے لگیں تو امل کچھ شرما گئی۔

''اوہ رئیلی۔ اتنی چھوٹی سی بچی نے واؤ!'' نائلہ بے حد امپریس ہوئی تھیں۔ ''فیشن میں کوئی ڈپلومہ کیا ہے کیا؟''

''نہیں، میں ممی کے بوتیک پر کام کرتی تھی، مطلب ویسے ہی ان کا کام دیکھ لیتی اور بس کچھ ہیلپ کر دیتی تھی۔''

''آپ کی ممی بھی ڈیزائنر تھیں؟ کیا نام تھا ان کے بوتیک کا؟''

''بھئی کیا باتیں ہو رہی ہیں اتنی پیاری سی بچی سے؟ آپ کی کوئی عزیز ہیں یہ چھوٹی سی پری، مسز عفت؟'' درمیان میں مداخلت کرنے والے ایک ادھیڑ عمر شخص تھے، شکل سے امل کو وہ بیوروکریٹ ہی لگے تھے۔ سیاہ ڈنر جیکٹ اور ٹائی میں ملبوس، نرم مسکراہٹ چہرے پر لیے ہلکے ہلکے سفید بالوں والے ڈیسنٹ سے مسز نائلہ کے شوہر۔

''ارے احسن!'' اس سے ملیے یہ مسز عفت کی فرینڈ کی بیٹی ہے اور یہ جو ڈریس ہے نا، یہ اس نے خود ڈیزائن کیا ہے اچھا ہے نا؟'' اپنے شوہر کو دیکھ کر نائلہ احسن پچھلی بات بھلا کر کہنے لگیں۔

ان کی تعریف پر امل شرما سی گئی ساتھ ہی دل میں ڈاکٹر احسن کی بروقت مداخلت پر مشکور بھی ہوئی۔

''کیا نام ہے آپ کا بیٹا؟'' انہوں نے مشفق انداز میں پوچھا۔

''امل!'' وہ قدرے خجالت سے بتانے لگی۔ وہ اپنی بیگم کی جانب متوجہ ہو کر انہیں چلنے کا کہنے لگے۔

اس سرسری سی ملاقات کو امل نے چند ہی دن میں بھلا دیا، وہ ہرگز نہ بھلاتی اگر اسے علم ہوتا کہ وہ شخص اس کے لیے کیا ہے اور کیوں ناگزیر ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر احسن سے......دوسری ملاقات جم خانہ میں تقریباً ساڑھے نو ماہ بعد ہوئی تھی۔

وہ وہاں عفت بیگم کے ہمراہ ایک غزل گائیکی کے پروگرام میں شرکت کرنے آئی تھی اور پروگرام کے اختتام پر جب اسے نائلہ احسن دکھائی دیں تو اس نے بے اختیار دعا کی تھی کہ وہ اس سے کوئی استفسار نہ کریں۔

''ارے یہ تو آپ کی وہ چھوٹی سی ڈیزائنر ہے نا؟ آپ کا نام شاید امل، ہے نا؟'' ڈاکٹر احسن اور نائلہ ان سے نہایت تپاک سے ملے اور اسے دیکھتے ہی ڈاکٹر صاحب کو وہ پرانی ملاقات یاد آ گئی۔

''جی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو آج کل ڈیزائننگ ہو رہی ہے کیا؟'' وہ شگفتگی سے پوچھنے لگے تو امل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''آج کل تو بس انکل! پڑھائی ہی ہو رہی ہے۔'' اس نے اپنے بارے میں بتا کر ان سے پوچھنے لگی۔

''ویسے آپ ڈاکٹر ہیں یا ایمبیسیڈر؟ وہ دراصل نائلہ آنٹی نے بتایا تھا کہ آپ سری لنکا میں ہائی کمیشن میں کام کرتے رہے ہیں۔''

''میں سول سرونٹ ہوں۔ ڈاکٹر بھی ہوں۔ فی الحال کرکٹ میری مریض بنی ہوئی ہے۔''

''وہ کیسے۔''

''ارے، آپ کو نہیں پتا؟'' وہ حیران ہوئے۔ ''میں پاکستان کرکٹ بورڈ کا چیئرمین ہوں''

''اوہ اچھا!'' وہ اشتیاق سے انہیں دیکھنے لگی۔ ''مجھے نہیں پتا تھا۔''

''آپ دیکھتی ہو کرکٹ؟'' وہ اس کے بچکانہ سے اشتیاق پر مسکرائے۔

''جی کبھی کبھی۔''

''کل ہمارا ایک ڈومیسٹک میچ ہے۔ قذافی سٹیڈیم میں، آنٹی کو لے کر آجاؤ۔ آپ کو کرکٹرز سے ملوائیں گے۔''

''رئیلی؟'' وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی۔ پھر عفت بیگم کی جانب مڑی ''آنٹی! انکل ہمیں کل میچ پر انوائٹ کر رہے ہیں۔''

عفت بیگم اس کے اس انداز پر بے اختیار مسکرائیں۔ ''چلیں پھر ہم ان شاء اللہ ضرور آئیں گے۔'' ان کی یقین دہانی پر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

''بس پھر ہم ضرور آئیں گے۔'' اس نے فوراً ڈاکٹر احسن کے ساتھ مل کر پروگرام ڈن کر لیا۔

☆☆☆

اگلے روز وہ دونوں مقررہ وقت پر قذافی سٹیڈیم پہنچ گئیں۔

پاس انہوں نے خود خریدے تھے اور چالیس فیصد تک بھرے ہوئے سٹیڈیم کے ''عمران خان'' انکلوژر میں جا کر بیٹھ گئیں۔

کہنیوں تک آتے گھنے سیاہ بال اور بالکل سیاہ ڈریس جس میں اس کی گوری رنگت بہت کھل کر نظر آرہی تھی، میں ملبوس وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ وہ کوئی خاص میک اپ نہیں کرتی تھی، بس کاجل اور کالا آئی لائنر آنکھوں پر ضرور لگاتی۔

توقع کے عین مطابق وہ واقعی کھیل ختم ہونے سے ٹھیک پون گھنٹہ پہلے تشریف لائے۔

نائلہ کو دیکھ کر اس نے بے ساختہ ہاتھ ہلایا تو انہوں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔

چند ایک خواتین سے ملنے کے بعد اس نے مدھم آواز میں نائلہ سے پوچھا۔

''ہے تو یہ عام سا میچ، مگر اس میں اتنی اہم شخصیات کیوں تشریف لائی ہیں؟''

''کوئی تقسیم انعامات کی تقریب خاص ہونی تھی۔ دوسرے آج کل کوئی اور آؤٹنگ تھی نہیں، اس لیے۔''

امل نے سمجھ کر سر ہلا دیا اور گراؤنڈ پر نظریں جما دیں۔

ایچ بی ایل فیلڈنگ کر رہی تھی، ان کو جیتنے کے لیے نیشنل بینک کی محض دو وکٹیں درکار تھیں۔ جو باؤلر باؤلنگ

کرا رہا تھا وہ یا تو نروس ہو کر یا دباؤ کا شکار ہو کر یا کسی اور وجہ کی بنیاد پر بے تحاشا نو بالز اور وائیڈ بالز دے رہا تھا۔ دوسرے اینڈ سے باؤلنگ کرا رہا تھا اسی لیے امل کی جانب اس کی کمر تھی۔ امل کو اس کی پشت پر حیدر تیرہ لکھا دکھائی دے رہا تھا مگر اس نے توجہ نہ دی۔

جب وہ اوور مکمل کر کے اپنی کیپ ایمپائر سے لے کر واپس باؤنڈری پر چلا گیا تو اس کو اس کا چہرہ نظر آیا۔ اگر اس کی شرٹ پر ''حیدر'' نہ بھی لکھا ہوتا تب بھی وہ اس کو پہچان لیتی کیونکہ وہ اس شخص کو کبھی بھول نہیں سکتی تھی۔

اور نجانے کتنی ہی دیر وہ یونہی بت بنی اس کو دیکھتی رہی پھر ایک سیٹ چھوڑ کر بیٹھے ڈاکٹر احسن سے پوچھا ''سر! یہ لڑکا کون ہے؟''

''کون؟''

''وہ تیرہ نمبر کی شرٹ والا؟''

انہوں نے اسے بغور دیکھا، اور بولے۔ ''نام تو مجھے یاد نہیں مگر یہ نیوزی لینڈ والے کیمپ میں شامل ہوا تھا۔''

''ٹیم میں سلیکٹ ہوا تھا؟''

''نہیں۔''

''ہونا بھی نہیں چاہیے۔'' وہ مدھم آواز میں بڑبڑائی۔

''کیا؟'' وہ شاید سن نہ پائے تھے۔

''وہ میں کہہ رہی تھی کہ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے میں چلتی ہوں۔'' وہ معذرت کر کے اٹھ گئی اور وی آئی پی انکلوژر سے نکل کر نشستوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی باہر کی جانب چل دی۔ عفت بیگم کو بھی اس کی وجہ سے جلد جانا پڑا۔

اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ اندر سے لاک کیا اور بستر پر گر گئی۔

اس کے تو خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ کرکٹ جوائن کر سکتا ہے۔ وہ تو آرٹسٹ بننا چاہتا تھا، رنگوں سے کھیلنا چاہتا تھا۔ وہ بیٹ اور بال کو تھام لے گا اس نے تو سوچا بھی نہ تھا۔ یہ کیسے اور کب ہوا؟ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔

اس کا پلان تو کچھ اور تھا جس کے مطابق اسے آرٹسٹ بننا تھا۔ یہ کیوں ہو گیا؟ اسے کرکٹر نہیں بننا چاہیے ہرگز نہیں۔

پھر ایک اور خیال نے اس کو آلیا۔ ہو سکتا ہے وہ ایک مشغلے کے طور پر کرکٹ کھیل رہا ہو، تھوڑے عرصے بعد چھوڑ دے مگر یہ بھی ناممکن تھا، کم از کم امل کو تو یہ مفروضہ غلط لگ رہا تھا۔

''اگر وہ کرکٹر بن گیا تو وہ تو بہت اونچا چلا جائے گا جبکہ میرا پلان......'' وہ وہیں رک گئی۔ گرتا تو وہی ہے جو بلندی پر ہوتا ہے، بہتر ہے کہ وہ بلندی پر چلا جائے، وہ جتنا اونچا جائے گا اسے زور سے نیچے پٹخنے میں اتنی ہی آسانی ہوگی۔

وہ اٹھی، جوتے پہنے، چابی اٹھائی اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اگر کوئی خراب ترین پرفارمنس کا ایوارڈ ہوتا تو وہ اس میچ کے بعد ریان حیدر کو بالترتیب تین اور آؤٹ ہونے پر ایک، پہلی اننگز میں پندرہ نو بالز، آٹھ وائیڈز، اور سات اشاریہ دو کی اوسط سے رنز دینے، دوسری اننگز میں سترہ نو بالز ایکس وائیڈز، چھ اشاریہ سات کا رن ریٹ اور مجموعی طور پر تین دفعہ سلپ میں کیچز چھوڑنے پر ملنا چاہیے تھا۔ سونے پر سہاگا، جناب نے صرف ایک وکٹ کے عوض یہ خوب صورت کارکردگی پیش کی تھی۔

میچ ختم ہونے کے بعد وہ سر جھکا کر جب قذافی سٹیڈیم سے نکل رہا تھا تو اس نے دل ہی دل میں مندرجہ ذیل کاموں کا تہیہ کر لیا تھا۔

دو ایک روز میں کراچی پہنچ کر حبیب بینک کی ٹیم سے استعفیٰ دینا ہے۔ اسے اچھے بچوں کی طرح یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے کر M.B.A کرنا ہے اور پھر ڈیڈ کا بزنس میں ہاتھ بٹانا ہے۔

اس رات ہوٹل کے کمرے میں ریان عظیم حیدر، خالص میمنوں کی طرح کاروبار کی طرف پلٹ آنے کا سوچ رہا تھا۔ وہ اب بزنس کو بطور پروفیشن اور آرٹ کو بطور مشغلہ لے گا۔

وہ بستر سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ مارکیٹ سے اس نے اپنے لیے ایزل، کینوس، مختلف برش، رنگ، اسکیچ پینسلز، غرض ڈھیر ساری چیزیں لیں اور واپس ہوٹل آ گیا۔

تمام رات وہ پینٹ کرتا رہا پہلے اس نے ایک اڑتا ہوا پرندہ بنایا۔ اسے پرندوں اور تتلیوں کے پر بہت خوب صورت لگتے تھے، اور وہ اپنی اکثر تصویروں میں ان ہی دونوں کو بناتا تھا۔ برش سے کینوس پر اسٹروکس لگاتے ہوئے اس نے سوچا تھا ''یہی میری اصل فیلڈ ہے۔''

صبح وہ سو گیا اور چونکہ دروازے پر Do not disturb کا کارڈ لگا کر اور موبائل کو آف کر کے سویا تھا اسی لیے پھر دوپہر تک سوتا ہی رہا۔

چار بجے کے قریب اٹھا، ''ناشتہ'' کیا ایک دفعہ پھر پینٹنگ میں لگ گیا۔ شاید اندر کی کوئی پیاس، کوئی آگ بجھا رہا تھا، وہ رات عشاء تک صرف مغرب کے وقت کے علاوہ بغیر رکے پینٹ کرتا رہا تھا۔ وہ تھک گیا تو اس نے ٹی وی آن کر دیا۔

وہ ہاتھ دھو رہا تھا جب نیوز کاسٹر کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ویسٹ انڈیز کے خلاف ہوم سیریز کے لیے سولہ رکنی اسکواڈ کا اعلان آج سہ پہر کر دیا گیا ہے۔''

''خیر! مجھے کیا میرا تو اب کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔'' وہ سوچ رہا تھا۔

''اسکواڈ کا اعلان پی سی بی کے ڈائریکٹر آپریشنز نے آج قذافی سٹیڈیم میں کیا ہے۔ کھلاڑیوں کی سلیکشن ان کی پرفارمنس کی بنا پر کی گئی ہے۔''

''سولہ کھلاڑیوں کے نام یہ ہیں، نعمان، امجد، سلیم احمد، فہد مرتضیٰ، شعیب واحد، نعیم اکرم......''

وہ تولیے سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔
''ثاقب حسن، راؤ انجم، ریان حیدر......''
اس کے ہاتھ سے تولیہ ایک دم وہیں باتھ روم کے فرش پر گر گیا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا کمرے میں آیا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر اس کا نام جگمگا رہا تھا۔ وہ ریان حیدر اسکواڈ میں شامل کر لیا گیا تھا جس کی حالیہ پرفارمنس بری بلکہ بے حد بری تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اپنا نام دیکھ رہا تھا۔
وہ سلیکٹ کر لیا گیا تھا، مگر کیوں؟ کس پرفارمنس کی بنیاد پر؟ کس وجہ سے؟ نہ بیٹنگ، نہ باؤلنگ، نہ فیلڈنگ، اسے شکل دیکھنے کے لیے اسکواڈ میں رکھا گیا تھا کیا؟
اور دفعتاً اسے خیال آیا۔ اس نے جلدی سے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا سیل فون آن کیا۔ پندرہ میسجز اکٹھے ریسیو ہوئے تھے۔
''او خدایا؟'' وہ سب اس کے ایچ بی ایل کے ساتھیوں کے تھے جس میں مبارک باد اور ''کہاں ہو؟'' جیسے کلمات تھے۔ اسے اندازہ ہوا کہ اسکواڈ کا اعلان سہ پہر میں ہی ہو گیا تھا اور وہ لوگ تب سے اب تک اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔
وہ فوراً فون کی جانب بڑھا، اور ریسپشن کی ایکسٹینشن ملا کر دریافت کیا۔
''میرے لیے کوئی کال تو نہیں آئی؟''
''سر آپ کا روم نمبر؟''
''509۔'' اس نے میز پر رکھی چابی اٹھا کر نمبر پڑھا۔
''سر! آپ کے لیے سترہ فون کالز آ چکی ہیں مگر چونکہ آپ نے ڈسٹرب کرنے سے منع کیا تھا اسی لیے ہم نے کالز تھرو نہیں کیں۔''
وہ فون کالز کی تفصیلات بتانے لگا۔ بارہ تو اس کے دوستوں کی تھیں جو سہ پہر کے بعد موصول ہوئی تھیں اور ان کے پیغامات، میسجز سے زیادہ مختلف نہ تھے، چار پی سی بی آفیشلز کی جانب سے تھیں جبکہ ایک کال جو کل رات آئی تھی اس کے متعلق ڈیسک کلرک نے قدرے تذبذب سے بتایا۔
''سر! یہ کوئی خاتون تھیں، جب میں نے ان سے میسج مانگا تو انہوں نے کہا مجھے ریان حیدر سے کوئی بات نہیں کرنی، میں تو صرف یہی چیک کر رہی تھی کہ وہ یہاں ہیں یا نہیں۔ پھر انہوں نے نام بتائے بغیر فون رکھ دیا۔''
''اوکے۔'' اس نے کہا۔
اسی پل اس کے سیل کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر گھر کا نمبر تھا۔
''ہیلو، السلام علیکم۔''
''وعلیکم السلام، کیسے ہو ریان؟ مبارک ہو یار! اسکواڈ میں پہنچ گئے ہو۔'' ڈیڈ تھے۔
''خیر مبارک۔'' وہ قدرے جھینپ کر کہتا ہوا بیڈ پر آن بیٹھا۔

''مجھے اتنی خوشی ہوئی یقین نہیں آرہا۔'' وہ واقعی بہت خوش لگ رہے تھے۔

''مجھے بھی یقین نہیں آرہا۔''

''کل میچ تھا تمہارا، کیسا رہا؟''

''ہار گئے۔''

''چلو کوئی بات نہیں تمہاری پرفارمنس کیا تھی؟''

''پہلی انگز میں ایک پر آؤٹ ہوا 109 رنز دے کر ایک وکٹ حاصل کی، ایک کیچ ڈراپ کیا، دوسری اننگ میں دو پر آؤٹ ہوا، بغیر وکٹ کے 111 رن دیے، دو کیچز ڈراپ کیے اور مجموعی طور پر 61 ایکسٹراز دیے۔''

''مذاق کر رہے ہو؟'' چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولے۔

''سیریس ہوں، ڈیڈ!'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''پھر سلیکٹ کیسے ہوئے؟''

''یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔''

''کب جوائن کرنا ہے؟'' وہ پوچھنے لگے۔

''ابھی پوچھتا ہوں کسی سے۔''

☆☆☆

ہوم سیریز کا آغاز ہوا، تو وہ جو ڈومیسٹک کرکٹ کی پتلی حالت اور این سی اے میں اپنی رہائش گاہ دیکھ کر پی سی بی کو ''غریب'' سمجھنے کی غلطی کر چکا تھا۔

پاکستان کرکٹ بورڈ واقعی اتنا غریب نہ تھا، مگر انڈیا، آسٹریلیا یا انگلینڈ سے بہت پیچھے تھا۔

جب اسے گہری سبز کٹ اور اسی رنگ کی کیپ ملی تو ایک عجیب سے احساس نے اس کو گھیر لیا۔ اپنے ملک کی نمائندگی کے احساسات اور فخر جو وہ محسوس کر رہا تھا، بیان سے باہر تھے۔

پہلا میچ قذافی سٹیڈیم لاہور میں کھیلا جانا تھا، کھلاڑیوں کو پی سی لاہور میں ٹھہرایا گیا۔ جو کھلاڑی اپنی بیگمات کے ساتھ نہیں تھے، ان کو ایک دوسرے کھلاڑی کے ہمراہ کمرہ شیئر کرنا تھا اور جو پہلی مصیبت کمرے میں تھی، وہ سخت اور اسٹف میٹریس کی تھی۔ یہ میٹرس کرکٹرز کو کمر کے ممکنہ درد، پٹھے کا کھینچ جانا، یا کسی ایسے مسئلے سے بچانے اور تمام دن فیلڈ میں کھڑا رہنے کے لیے تیار کرنے کے لیے خصوصی طور پر بچھوائے گئے تھے۔ میچ سے پچھلی رات اسے نیند نہیں آئی تھی۔ وجہ بستر نہیں، ایکسائٹمنٹ، خوشی اور خوف تھا۔

ایکسائٹمنٹ اپنا پہلا میچ کھیلنے کی، خوشی ٹیم میں سلیکٹ ہونے، اور ملک کی نمائندگی کرنے کی جبکہ خوف ممکنہ بری پرفارمنس کا تھا۔

اتنا تو اسے کپتان کی زبانی علم ہو ہی چکا تھا کہ چونکہ پچھلی دفعہ اسے اچھی پرفارمنس کے باوجود ٹیم میں شامل نہیں کیا گیا تھا اسی لیے اس کو اس دفعہ رکھا گیا تھا۔

اپنے سلیکٹرز کے بارے میں وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ تھا۔ اگر کوئی کھلاڑی ایک میچ میں نہ چلے تو اسے فوراً واپسی کا ٹکٹ تھما دیا جاتا ہے۔ اسے معلوم تھا اگر وہ ٹھیک طریقے سے پرفارم نہیں کرتا تو اسے دوسرا چانس نہیں مل سکے گا۔

قریباً گھنٹے بعد، ناشتہ کر کے وہ دیگر ٹیم کے ساتھ بس میں سوار ہو کر، جو اسی مقصد کے لیے بک تھی اسٹیڈیم پہنچ گیا۔ اسے وہ زمانہ یاد آ گیا جب وہ سکول میں پیپر سے پہلے کھڑے ہو کر جلدی جلدی پڑھ رہا ہوتا تھا اور میرین بڑے مزے سے کہتی تھی "نزع کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی۔"

اسے نہیں معلوم تھا کہ کچھ دیر کی فیلڈنگ پریکٹس کے بعد کیا فرق پڑے گا مگر اس نے سن رکھا تھا کہ یونس خان اپنے زمانے میں روز ایک گھنٹہ کیچنگ پریکٹس کرتا تھا اس نے سوچا شاید وہ بھی اس طرح مایہ ناز فیلڈر بن جائے۔

ویسٹ انڈیز نے ٹاس جیت کر پہلے فیلڈنگ کا فیصلہ کیا۔ پاکستانی ٹیم مقررہ پچاس اوورز بھی پورے نہ کھیل سکی اور 42.3 اوورز میں 183 رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی۔

بیس منٹ کی ٹی بریک ختم ہوئی تو نعیم نے ٹیرس پر کھڑے ریان کو آواز دی "حیدر! آ جاؤ۔"

ریان چند لمحے اس کی پشت کو دیکھتا رہا پھر فوراً کیپ اٹھا کر سر پر رکھی اور باؤلنگ اینڈ کی طرف بڑھا۔

رام نریش نے چند ثانیے مخالف 22 سالہ باؤلر کو دیکھا اور شارٹ کھیلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے بعد جو ہوا، وہ معمہ رام نریش اپنی پوری زندگی نہیں حل کر سکا۔

اس نے پاکستان باؤلر کو بھاگ کر اپنی جانب آتے دیکھا، باؤلر نے گیند پھینکنے کے لیے بازو کو گھمایا بھی صحیح مگر گیند پھینکنے کے بجائے وہ اسی طرح رک گیا جیسے باؤلرز گیند کرانے کے بعد کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رام نریش انتظار کرتا رہا کہ وہ مڑ کر دوبارہ اپنے باؤلنگ مارک پر جائے گا، یا ایمپائر گیند کو نو بال قرار دے گا مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اس نے باؤلر کے نوجوان اور خوب صورت چہرے کو دیکھا، وہ پہلے تو آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے رام نریش کو دیکھ رہا تھا پھر اس کی آنکھیں حیرت، بے یقینی اور خوشی سے پوری وا ہو گئیں۔ رام نریش نے نعیم کو بھاگتے اور نعمان کو شور مچاتے سنا۔ رام نریش کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لڑکے نے بال کیوں نہیں کروائی اور تمام کھلاڑی خوش کیوں ہو رہے ہیں۔ پھر دفعتاً اس نے پلٹ کر اپنی وکٹ کو دیکھا، جس کی آف اسٹمپ کی بیل وہاں موجود نہ تھی، قریب ہی سفید گیند پڑی تھی۔

ریان بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ نعیم، فرحان، اشتیاق، نعمان وغیرہ سے گلے ملتے ہوئے وہ اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، جو ابھی اور بالکل ابھی پیش آئی تھی۔ یہ سب کچھ اسے خواب لگ رہا تھا، ایک خوب صورت خواب وہ پہلی ہی گیند پر وکٹ لے سکتا ہے، اپنی زندگی کی پہلی، بالکل پہلی گیند پر، اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ گھبراہٹ جو اس پر کئی دنوں سے طاری تھی ایک دم رام نریش کی وکٹ کے ساتھ ہی آؤٹ ہو گئی تھی۔

انتہائی اعتماد سے اس نے دوسری گیند پھینکی جو سیدھی نرائن کے بیٹ سے ٹکرانے سے پہلے پیڈ پر لگی، وہ یک لخت مڑ کر ایمپائر کے سامنے چیخنے لگ گیا۔ ایمپائر نے سوچنے کے لیے وقت لیا اور پھر انگلی ہوا میں اٹھا دی۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔

اپنی زندگی کے پہلے ہی انٹرنیشنل اوور میں وہ ہیٹ ٹرک کر سکتا تھا۔

البتہ وہ نہ کر سکا۔ تیسری بال پر چھکا پڑ گیا تھا۔ اس لمحے اسے معلوم ہوا تھا کہ جب بیٹسمین چھکا مارتا ہے تو

باؤلر کیوں اتنے ملال سے گیند کو گراؤنڈ سے باہر گرتا ہوا دیکھتا ہے۔
اوور کی آخری گیند پر اس نے اپنے مارک پر کھڑے کھڑے بلے باز کو جانچا۔ اسے اب کس box میں باؤلنگ کرانی ہے وہ یہ سوچنے کے بجائے نان اسٹرائیکرز اینڈ پر کھڑے برائن کو دیکھ رہا تھا جسے رن لینے کی جلدی کریز سے تھوڑا آگے لے آئی تھی۔ ریان زیر لب مسکرا دیا اور بھاگتا ہوا اپنی لائن پر پہنچا، البتہ اس نے گیند اسٹرائیک پر کھڑے بلے باز کو پھینکنے کے بجائے برائن کی وکٹ کے قریب، بازو کو گھمانے کے عمل کے دوران ہی یک دم گیند والا ہاتھ وکٹ پر مار دیا اور فوراً اپیل کر دی۔ ایمپائر شیور نہیں تھا اس نے اسکرین دے دی مگر ریان شیور تھا۔ فیصلہ ریان حیدر اور اس کی ٹیم کے حق میں ہوا۔
ایمپائر سے اپنی کیپ لیتے ہوئے وہ مسکرا رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا اب فتح ان کی ٹیم کا مقدر ہوگی۔ سولہ رنز بنانا کوئی آسان بات نہ تھی۔
سولہ رنز باؤلرز بنالیا کرتے ہیں، اگر وہ ویسٹ انڈیز کے نہ ہوں۔
نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان وہ میچ سات رنز سے جیت گیا، ریان نے سات رنز کے عوض تین اوورز میں ایک میڈن دے کر تین وکٹیں لیں۔ اس طرح ایک ہی شام میں وہ یوں مشہور ہو جائے گا اس نے تو سوچا بھی نہ تھا۔ اس نے ہر چیز کے بارے میں پچھلے تین سال سے ڈومیسٹک کرکٹ کھیلتے ہوئے سوچا تھا جو کرکٹ اسے دے سکتی تھی اس نے صرف شہرت کے متعلق نہیں سوچا تھا۔
میچ کے اختتام پر جب وہ گراؤنڈ سے نکل رہا تھا، تو اس نے دو لڑکیوں کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں پین اور آٹوگراف بکس تھیں۔
''آٹوگراف پلیز۔'' اپنی آٹوگراف بک بڑھاتے ہوئے ایک لڑکی نے پر جوش لہجے میں کہا۔ یہ وہ صورت حال تھی جس کا سامنا کرنے کو وہ تیار نہ تھا۔
جھجکتے ہوئے ریان نے بک پکڑی اور لڑکیوں کے اسم گرامی دریافت کر کے لکھا۔
''ٹو نادیہ بیسٹ آف لک۔'' نیچے اس نے اپنے سائن کر دیے۔ اسی طرح ارم کو بھی لکھ دیا۔
''فون نمبر بھی دیں۔'' نادیہ بضد ہوئی۔
''فون نمبر؟ نہیں سوری۔'' وہ جان چھڑا کر فوراً کھسک لیا۔
اسے کرکٹ کی ''اہمیت'' کا اندازہ صحیح معنوں میں اب ہوا تھا۔ ''کرکٹ اتنی شہرت دے رہی ہے تو معلوم نہیں دولت کتنی دے گی۔''

☆☆☆

چار برس پہلے تک اگر وہ مریم اور اس کی والدہ محترمہ کو ٹالتا رہا تھا تو وہ محض اپنے کیرئیر اور مریم کی پڑھائی کے باعث مگر پچھلے چار برس سے وجہ صرف اور صرف امل تھی۔
چار برس پہلے اس نے سوچا تھا کہ شاید وہ امل کے دل میں جگہ بنا کر اس آئس برگ کو پگھلا سکے، جو اس کی

جھیل سی گہری آنکھوں میں جما تھا، مگر اب چار سال بعد اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اس سرد جذبات والی لڑکی کے دل تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا مگر وہ اس سے کچھ بھی نہیں کرتی تھی۔ نہ محبت، نہ نفرت۔

اگر نفرت کرتی تو بھی وہ خوش ہو جاتا کہ نفرت بھی ان سے کی جاتی ہے جن کو آپ اہمیت دیتے ہیں، کچھ سمجھتے ہیں پھر چار برس تک قدم قدم پر وہ کیوں اس کا ساتھ دے رہا تھا؟ وہ کیوں اسے استعمال کر رہی تھی؟

مگر وہ جانتا تھا وہ غلط سوچ رہا ہے۔ امل اسے استعمال نہیں کر رہی تھی، امل کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ رمیز کو اس کی ضرورت تھی۔ اسے نہیں یاد کہ امل نے آج تک اسے کوئی ایسا کام کہا ہو جس کو کہتے وقت اس کے لہجے میں منت سماجت، اصرار، التجا کا کوئی عنصر موجود ہو، وہ درخواست نہیں کرتی تھی بلکہ تحکمانہ لہجے میں ایک بات کہتی اور انداز ایسا ہوتا تھا کہ وہ کام کرنے یا نہ کرنے کا اختیار رمیز کے پاس ہے، وہ چاہے تو کر دے، نہ کرے تو بھی اس کا کچھ نہیں جاتا کیونکہ وہ اس کی ضرورت نہ تھا۔

لیکن دل میں ایک آس سی بندھی تھی کہ شاید اس کی شادی کی خبر سن کر وہ چونک کر اسے دیکھے گی۔ اس کا چہرہ کچھ کھو دینے کے احساس سے تاریک ہو جائے گا۔ وہ صرف اس لڑکی کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا، جس سے وہ بہت ڈرتا تھا، اور جس کا پورا ماضی جاننے کے باوجود بھی وہ اس کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔

اپنے ہاتھ میں موجود سلور رنگ کو گھماتی امل نے سر اٹھا کر رمیز کو دیکھا اور مسکرا دی البتہ اس کی آنکھیں مسکرانے کے بجائے ویسی ہی یخ بستہ تھیں۔ ''مبارک ہو۔''

''تھینکس۔'' اپنی شادی کی مبارکباد وصول کرتے وقت اے ایس پی رمیز مسکرا بھی نہ سکا۔ وہ اس امید پر عفت آنٹی کے گھر یہ خبر دینے آیا تھا کہ شاید امل اداس ہو جائے گی۔

''کب ہے شادی؟'' وہ مسلسل رنگ کو گھما رہی تھی۔

''ایک دو مہینے تک۔'' وہ اس رنگ کو اس روز سے امل کی انگلی میں دیکھتا آیا تھا جب سے وہ امل بنی تھی۔ کئی بار دل چاہا کہ وہ اس کی بابت اس سے کوئی سوال کرے مگر وہ خود میں اتنی ہمت نہ پاتا تھا۔

امل نے ٹی وی آن کر دیا جبکہ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے مریم سے شادی کر ہی لینی چاہیے۔ مریم اس کی پچھلے پانچ سال سے منگیتر تھی اور اب وہ کس منہ سے انکار کرتا۔

ٹی وی اسکرین کو دیکھتے ہوئے امل کے لبوں پر بے اختیار ہی ایک مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی اور رمیز بتا سکتا تھا کہ اس کی آنکھیں بھی اس زہر خند مسکراہٹ میں شامل تھیں۔ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں رمیز نے اسکرین کی جانب دیکھا جہاں تیسرے ٹیسٹ کے لیے کراچی پہنچنے والی ٹیم کو ائیر پورٹ پر آتے دکھایا جا رہا تھا۔ اس نے امل کی جانب دیکھا، جو بے تاثر چہرے کے ساتھ ٹی وی کو دیکھ رہی تھی۔

''امل! تم کیا کرنا چاہتی ہو؟'' اسے امل کی آنکھوں سے خوف آ رہا تھا۔

''تمہیں پتا ہے رمیز! یہ چیس بورڈ کیسا ہوتا ہے؟ دن اور رات کے خانوں سے بھرا، زندگی بھی بالکل ایسی ہی بساط ہوتی ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی تھی۔

''اور میں شطرنج کی ایک بساط پر چال چلنا چاہتی ہوں۔''
''کیسی چال؟''اس نے الجھ کر اسے دیکھا۔
وہ مسکرائی۔''جو ہر کھیل میں ہوتی ہے۔''
''کھیل شروع ہو گیا ہے کیا؟''
''بس شروع ہی سمجھو۔''وہ مسلسل ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔
رمیز نے قدرے ہراساں ہو کر امل کو دیکھا، جو ابھی تک اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

پانچ ایک روزہ میچز اور دو ٹیسٹ کھیلنے کے بعد دونوں ٹیمیں شدید تھکاوٹ کا شکار تھیں۔
اس روز بھی پاکستانی ٹیم تفریح کے لیے سمندر پر آ گئی۔
کراچی آنے کے بعد وہ ایک دفعہ بھی گھر نہ جا سکا تھا۔ کراچی میں مقیم کھلاڑی اپنے گھروں میں رہ تو سکتے ہیں مگر ڈسپلن پر برا اثر پڑتا ہے، دیر سویر کا خطرہ ہوتا ہے اور ویسے بھی ہوٹل سے باہر نکلنے سے پہلے ہمیشہ منیجر سے اجازت لینا ضروری ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ گھر نہ گیا حالانکہ اس نے گھر کو کافی مس کیا تھا۔ (اس ماں کو بھی مس کیا تھا جس کو ریان کے خیال میں اس سے زیادہ محبت نہ تھی۔)
ساحل سمندر پر آنے کے بعد طبیعت کافی خوشگوار سی ہو گئی۔ جوتے اتار کر، جینز نیچے سے کچھ اوپر موڑ کر، گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔
وہ اسی طرح دھیرے دھیرے نرم ساحلی ریت میں دھنستے ہوئے پاؤں کے ساتھ چل رہا تھا جب یونہی ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس کی نگاہ ایک منظر پر جیسے ٹھہر سی گئی اور پھر وہاں سے ہٹ نہ سکی۔
چند گز کے فاصلے پر ایک چھوٹی چٹان پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے سپید پاؤں سے بار بار لہریں ٹکرا رہی تھیں جبکہ سیاہ بالوں کی لٹیں اردگرد لہرا رہی تھیں جنہیں سمیٹنے کی وہ کوشش نہیں کر رہی تھی۔
اس کے لباس میں بلیو کے چار شیڈز تھے اور چاروں رنگ ایک دوسرے میں بلینڈ ہوئے یوں لگ رہے تھے جیسے اس کے لباس پر سمندر کی بے چین موجیں رقص کر رہی ہوں۔
اس کی سفید کلائیوں میں ریان کو سیپیوں کا بنا ہوا کڑا دکھائی دے رہا تھا جبکہ کپڑوں پر جا بجا سیپیاں لگی تھیں، جیسے سمندر کے پانیوں پر تیر رہی ہوں۔
ریان کو لگا وہ سمندر سے نکلی کوئی جل پری ہے۔
اس ''جل پری'' میں کوئی ایسی بات تھی جس نے ریان حیدر کو اس کی جانب دیکھنے اور مسلسل دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ چٹان سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بال ہلکے ہلکے گیلے تھے اور ہاتھ بھی نم آلود لگ رہے تھے۔
ریان ابھی تک اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا کیونکہ وہ کچھ اس طرح ترچھی ہو کر بیٹھی تھی کہ وہ اس کا سائیڈ پوز دیکھ سکا تھا اور یہ اس کا حسن نہیں تھا، جو ریان کو اس کی جانب متوجہ کر رہا، وہ کچھ اور تھا۔ کچھ عجیب سی بات تھی اس لڑکی میں۔

وہ بالکل ساکت بیٹھی تھی، جیسے ایک ماڈل فوٹو شوٹ کے لیے پوز بنا کر بیٹھتی ہے، یا جیسے کوئی مجسمہ ہو، جس کا پورا وجود ساکت ہو، جس کی دھڑکنیں ساکن ہوں، جس کا تنفس ساکن ہو۔

اس لڑکی نے یکا یک دائیں گھٹنے کے گرد رکھے اپنے ہاتھ ہٹا دیے اور ساتھ رکھے ایک پتھر کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی، ریان کو اس کا پورا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ اسے لگا وہ اس کو پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ وہ لڑکی دنیا و مافیہا سے بے خبر سیدھ میں چل رہی تھی، وہ سیدھی چلتی ہوئی اس کے قریب سے آ کر گزر گئی، اس کے بدن سے پرفیوم کی مہک اٹھ رہی تھی۔ ریان نے مڑ کر اس کی پشت کو دیکھا۔ وہ ایک جگہ کھڑی ہو کر اپنے پرس سے کچھ نکال رہی تھی۔ وہ شاید ایک سبز سا کپڑا اور ایک پین تھا، جسے لے کر وہ لڑکی اس طرف بڑھ گئی جہاں چند کرکٹرز کھڑے تھے۔

ریان نامحسوس انداز میں ان کے تھوڑا قریب چلا گیا۔ وہ اب ایک ایک کرکٹر سے پاکستان کے جھنڈے پر آٹوگراف لے رہی تھی۔ وہ جھنڈا کرکٹرز کے آگے کر دیتی، بغیر کچھ کہے اور وہ اس سے نام پوچھے بغیر ہی سائن کر دیتے۔ ریان مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ لاشعوری طور پر منتظر تھا کہ وہ اس کی طرف آئے گی۔ وہ پچھلے ایک مہینے میں سینکڑوں آٹوگراف دے چکا تھا، اسے تقریباً 71 لڑکیوں نے زبردستی اپنے فون نمبر دے دیے تھے۔ وہ ایک دم مشہور ہوا تھا اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ لڑکی اس سے نئے ابھرتے ہوئے باؤلر سے آٹوگراف نہ لے۔

اس کے سوا تمام کرکٹرز سے آٹوگراف لے کر وہ مخالف سمت میں چلتی ہوئی منظر سے ہٹ گئی۔ وہ اس کے پاس آئے بغیر ہی چلی گئی۔ اس نے اضافی کھلاڑیوں سے بھی جھنڈے پر سائن کرائے تھے، بس اسی سے نہ کرائے تھے، حالانکہ وہ قریب ہی کھڑا تھا۔

اسے لگا وہ جل پری اسے ٹھکرا کر چلی گئی ہے۔

سیریز ختم ہوئی تو وہ گھر آ گیا جہاں کچھ اور ہی اس کی منتظر تھا۔

اس کی واپسی کے تیسرے روز کی بات ہے، جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ایک مشہور آسٹریلین کرکٹر کی آٹو بائیوگرافی پڑھ رہا تھا اس کا دروازہ بجا۔

''یس۔'' وہ نگاہیں کتاب کے صفحات پر...... ہٹائے بغیر مصروف انداز میں بولا تو بیہ نے دروازہ کھول کر سر اندر کیا اور بولی۔

''بھائی آپ کا فون ہے لاؤنج میں ہے۔'' وہ اطلاع دے کر فوراً بھاگ گئی۔

ریان کتاب رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر لاؤنج میں آ گیا۔

''ہیلو۔'' اس نے ریسیور کان پر لگاتے ہوئے کہا۔

دوسری جانب سے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد آواز ابھری ''ہیلو۔'' ایک لمحے کے لیے وہ آواز پہچان نہ سکا۔

''میں شادی کر رہی ہوں۔''

''مم...... سیرین؟'' وہ اسے پہچان گیا تھا۔

میرین نے اس کو پیرس میں کئی کالز کی تھیں۔ کافی خط لکھے تھے، مگر اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ دراصل دوستوں سے اتنا متنفر ہوا تھا کہ ان تینوں کو ایک ہی کیٹیگری میں لا کھڑا کیا تھا۔

''ہاں میں ہوں۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

''کب؟'' وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

''تین ہفتے بعد۔'' اس کی آواز پہلے کے مقابلے میں کافی کمزور اور پژمردہ تھی۔ ریان کو یک دم انجلینا سے ہونے والے اختلافات اور لڑائی جھگڑے یاد آ گئے تھے۔ اس کا لہجہ خود بخود ہی اکھڑا سا ہو گیا۔

''اچھا مبارک ہو۔''

''تم آؤ گے نہیں؟'' اس کے لہجے کی سرد مہری...... میرین نے محسوس کر لی تھی، اسی لیے مایوسی سے بولی۔

''نہیں۔'' اس نے اپنا سابقہ انداز روا رکھا۔ ''میں بہت بزی ہوں۔''

''میں نے تمہارا میچ دیکھا تھا اور پتا ہے مجھے کیا یاد آ گیا تھا؟'' وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ ''وہ شب و روز جو ہم نے میلبورن میں گزارے تھے، جب تم اسٹیو فشر سے کرکٹ سیکھا کرتے تھے۔''

ریان خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا۔

کسی گہری سوچ میں گم اس نے فون رکھ دیا تھا۔

اس نے ڈیفنس میں بنگلہ لے لیا اور ایک طرح سے لاہور میں سیٹ ہو گیا۔ اگر کیمپ نہ لگا ہوتا یا کوئی میچ نہ ہوتا، تو وہ کراچی آ جاتا اور گھر والوں کے ساتھ وقت گزارنے کی بھرپور کوشش کرتا۔

میڈیا کو وہ پسند آیا تھا۔ پہلے ہی ٹورنامنٹ کے بعد دو چار اردو اخبارات، ایک سنڈے میگزین، دو انگریزی نیوز پیپرز، اور تین ٹی وی چینلز کو انٹرویو دے چکا تھا۔

شہرت اور گلیمرس دور سے ہی اچھے لگتے ہیں۔ اسے اب احساس ہوا تھا کہ شہرت کتنا بڑا عذاب ہے۔ اس کی پرائیویسی ننانوے فیصد ختم ہو گئی تھی۔ وہ آزادی سے بازاروں میں گھوم پھر نہیں سکتا تھا کیونکہ دس منٹ بعد ہی ایک جھمگٹا لگ جاتا تھا۔

ٹھیک ڈھائی ہفتے بعد، تین ہفتے ریسٹ کر کے ٹیم ساؤتھ افریقہ کے دورے پر روانہ ہو گئی۔

ٹیسٹ سیریز تو برابر چلی گئی۔ 1-1 سے، کیونکہ آخری ٹیسٹ میچ ڈرا ہو گیا تھا البتہ ون ڈے سیریز، اس وقت ایک سنسنی خیز موڑ اختیار کر گئی جب پہلے دو میچز پاکستان (ایک میچ بارش کے باعث ملتوی) جبکہ دو میچز ساؤتھ افریقہ جیت چکا تھا اور یہ آخری اور فیصلہ کن میچ پورٹ الزبتھ میں کھیلا جانا تھا اور اسی میچ میں 2-2 سے برابر چھ میچز کی سیریز کا حتمی نتیجہ ہونا تھا۔

پورٹ الزبتھ میں نعیم نے ٹاس ہارنے کے بعد فیلڈنگ کی، جو کہ ساؤتھ افریقن کپتان اسمتھ کا فیصلہ تھا۔ اسمتھ کی ان دنوں ریڈیو کی کسی اناؤنسر کے ساتھ افیئر کی خبریں اخبارات کی زینت بنی ہوئی تھیں جبکہ وہ مسلسل اسے اپنی بہن ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔

آریم اسمتھ، جو کہ دنیا کا نوجوان ترین کپتان تھا اور جب خود کو پچیس سالہ بتاتا تھا تو مخاطب دل میں ''جھوٹا'' ضرور کہتا تھا، نے سنچری اسکور کرکے پاکستان کی فتح کے خواب کی تعبیر کو مزید دھندلا دیا۔

پورٹ الزبتھ میں جب پاکستانی ٹیم 332 رنز کے ٹارگٹ کو عبور کرنے میدان میں آئی تو پہلے ہی اوور میں دو کھلاڑی بغیر کوئی رن بنائے۔ پویلین کی جانب واپس لوٹ گئے تو پاکستانی ٹیم مشکلات سے دوچار ہوگئی۔

ریان حیدر کوئی اچھا بلے باز نہ تھا، مشکل حالات کی وجہ سے اسے نویں نمبر پر بھیج دیا گیا۔

جب وہ وکٹ پر کھیلنے آیا۔ 92 گیندوں پر 170 رنز درکار تھے۔ جو بظاہر ناممکن لگ رہا تھا۔

اسپنر گیند کو زبردست طریقے سے اسپن کر رہا تھا۔ ریان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیسے کھیلے۔ جب وہ مسلسل گیندیں چھوڑتا گیا تو اسپنر نے جھنجھلا کر اسے دیکھا۔

''مار بھی سہی۔'' اس نے افریقی زبان میں ریان کو کہا، جو اس کے پلے نہیں پڑا۔

وکٹر اتنی زبردست باؤلنگ کرا رہا تھا کہ ریان کے لیے گیند کو ہٹ لگانا بے حد مشکل تھا۔

کرکٹ میں بلے بازوں کو ہمیشہ ایک بات سکھائی جاتی ہے۔ اگر باؤلر بہت اچھی گیندیں کرا رہا ہے تو اس کو گالیاں دو۔

ریان نے بھی وہی کیا اور کچھ غصے میں آکر وکٹر نے اگلی گیند اتنی short کرائی کہ اس کو موقع مل گیا۔ اس نے چوکا لگا دیا۔

ریان نے وکٹر کو کوئی گالی نہیں دی تھی، اس نے صرف اتنا کہا تھا۔ ''بیٹا گھر جاؤ، امی بلا رہی ہیں، کھانے کا ٹائم ہوگیا ہے، پھر تمہیں برتن بھی دھونے ہیں''

اس نے کچھ غصے سے ریان کو گھورا تھا۔ ''دھلائی تو ابھی میں تمہاری کروں گا پاکی!''

ریان کا خون کھول اٹھا مگر وہ مسکرا کر آگے بڑھا، وکٹر کا شانہ تھپتھپایا اور بولا ''اٹھ جاؤ، جاگ جاؤ، خواب دیکھنا اچھی بات ہے مگر اتنی اچھی بھی نہیں۔'' اور اس چیز نے وکٹر کو اتنا اشتعال دلایا کہ وہ اپنی لائن اور لینتھ کھو بیٹھا۔

وکٹر تو ریان کی دھلائی نہ کر سکا، البتہ ریان حیدر نے اگلے آدھے گھنٹے میں ساؤتھ افریقین باؤلرز کو بری طرح دھویا۔

اس وقت وہ 329 فار نائن تھے جب پانچ گیندوں پر چار رنز بنانے تھے۔ وہ سنچری کر چکا تھا اور اب مطمئن ہوکر شارٹ کھیلنے کی کوشش میں آؤٹ ہوگیا اور یوں پاکستان وہ میچ تین رنز سے ہار گیا۔ اس کو کہتے ہیں کرکٹ بائی چانس۔

☆☆☆

ریان حیدر بلے اور گیند کی دنیا میں اپنا جادو جگاتا رہا، پی سی بی کے گریڈ بی کے کھلاڑیوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ وہ لگاتار کھیلتا رہا، انجریز آتی رہیں، فٹ اور ان فٹ ہوتا رہا، اس کھیل میں ایک نشہ، سرور، پیسہ، شہرت، عزت، محبت ملتی رہی وہ کھیلتا رہا۔

میرین کی شادی ہوگئی۔

انجلینا نے دھڑا دھڑ موویز سائن کرنا شروع کر دیں اور ریان سے اس کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ مذہب، معاشرے اور رسوم و رواج کا فرق اور تفاوت کتنی حیثیت رکھتا تھا۔ ڈینئل نے ریئل میڈرڈ کے کوچ کی بیٹی سے شادی کر کے فٹبال میں اپنے لیے راہیں کھول لیں وہ جرمن ٹیم کے لیے منتخب ہونے کے ساتھ ساتھ ریئل میڈرڈ کے لیے کھیلنے لگا۔ اس کے لہجے میں فخر، تمکنت، غرور اور بڑائی جھلکنے لگی۔

ریان کو ڈینی اور انجلینا میں کوئی خاص فرق نہیں نظر آتا تھا۔ وہ دونوں پیسے کے پیچھے بھاگ رہے تھے، وہ جب بھی ان کے متعلق سوچتا تو اسے بے پناہ ڈپریشن محسوس ہوتا تھا۔

کرکٹ میں پہلا برس آپ کا ہوتا ہے اور کیریئر کے اگلے تمام برس ''کرکٹ'' کے ہوتے ہیں۔ اچھی کرکٹ کھیلو تو کامیاب ہو جاؤ۔ خراب کرکٹ ناکامی کے دہانے پر لے جائے گی۔

ریان نے اپنا ایک سال کامیابی سے اور کرکٹ کے اگلے تین برس کامیابی اور ناکامی کے درمیان گزارے تھے۔ انجریز کا شکار ہو کر متعدد بار وہ ٹیم سے باہر ہوا تھا، البتہ کبھی آؤٹ آف فارم ہو کر نہیں نکالا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی ان فارم رہا تھا۔

ریان عظیم حیدر کی فتوحات کا گراف اوپر اور بہت اوپر جا رہا تھا جب اچانک اوپر جاتی سوئی رک گئی۔ ایک میچ کے اختتام پر آئی سی سی کے میچ ریفری نے اس کے باؤلنگ ایکشن کو غیر قانونی قرار دے کر اسے کھیلنے سے روک دیا۔

☆☆☆

کرکٹ کے قانون 243 میں ذکر ہے کہ۔ ''بولنگ کے عمل کے دوران اگر بولنگ والا ہاتھ......''

''بھاڑ میں جائیں کرکٹ کے قانون۔'' وہ غصے سے بولا تو کوچ خاموش ہو گیا۔

ریان کو اکیس دنوں کے اندر اندر آئی سی سی کے ہیومن مومنٹ اسپیشلسٹ پینل کا سامنا کرنا تھا۔

وہ بے حد پریشان تھا اور اسی پریشانی کی کیفیت میں وہ آسٹریلیا گیا۔ آئی سی سی کا یہ پینل دنیا کے ماہر ترین زیرک طبی معالجوں کے چار رکنی افراد پر مشتمل تھا۔

بائیو میکینکس دراصل انسان کی حرکات اور سکنات کے مطالعے کے عمل کا نام ہے، جس کے باعث جدید تقاضوں سے روشناس کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی وساطت سے باؤلرز کے ایکشن کے الجھاؤ اور پیچیدگیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

اس نسل میں چاروں گورے تھے اور گورے ایشیائی ممالک کے باؤلرز کو ''پھلتے پھولتے'' نہیں دیکھ سکتے۔ ان گوروں کے عتاب کے زیر اثر صرف پسماندہ ممالک کے ایشیائی ہی آتے ہیں۔

بائیو میکینکل ٹیسٹ کروانے کے لیے ریان کو آلہ نما تاروں کے ذریعے ایک مرکزی کمپیوٹر سے منسلک کیا جاتا ہے۔ اس نے شرٹ اتار دی تو Reflectors کو اس کے سینے اور کندھوں پر لگا دیا گیا۔ پھر اس نے گیند کروائی۔

ایک خودکار عمل کے ذریعے ریان کے ایکشن کو ایک تھری ڈی تصویر میں تبدیل کر کے کمپیوٹر اسکرین پر دکھایا جانے لگا۔ ماہرین اس تصور کو متفرق ٹکڑوں میں الگ الگ کر کے ہاتھ سے گیند کے نکلتے وقت کے عمل کو دیکھنے لگے اور اس طرح ان کو دوران بولنگ ایکشن کا زاویہ سمجھ میں آیا۔

اس مہنگے ترین ٹیسٹ پر خرچ آنے والی تمام رقم اسی پینل کی جانب سے ادا کی گئی تھی۔
اس کی رپورٹس آنے میں کچھ وقت لگا اور پھر ٹھیک دو ہفتے بعد پینل کی رپورٹ آ گئی۔ پروفیسر ایلیٹ نے اس میں جو لکھا تھا اس کا مفہوم یہ تھا۔
''ایسا لگ رہا ہے کہ ان کا ہاتھ مروجہ ایکشن کی حد سے نکل رہا ہے۔ وہ غالباً چند گیندوں کو 15 ڈگری کے زاویے سے زیادہ خم دیتے ہیں۔''
اس پر ایک سال کی پابندی لگا دی گئی۔
اس کے پاس اپیل کرنے کے لیے چودہ دن کا وقت تھا۔
''آئی سی سی بولنگ ریویو گروپ'' کے پاس درخواست پیش کر دی۔
''مما!'' اس نے رانیہ کو فون کیا تھا۔ وہ ان دنوں لاہور میں تھا۔ ''میرے لیے دعا کیجیے گا۔ اگر یہ پابندی برقرار رہی تو میں شاید کرکٹ ہی چھوڑ دوں۔'' اس سارے جھنجھٹ سے وہ بے پناہ دل برداشتہ ہو رہا تھا۔
''صبر کرو بیٹا، صبر کرو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔'' یہ وہ نصیحت تھی جو رانیہ نے ہمیشہ اپنے بچوں کو کی تھی اور ریان نے اپنی ماں کی اس بات کو کبھی نہ بھلایا۔
یہ اتفاق تھا، معجزہ تھا یا انہونی، ریان حیدر کو آئی سی سی باؤلنگ ریویو گروپ نے مقدمے سے بری کر دیا۔ کسی نے بہت اونچے درجے پر جا کر سفارش کی تھی۔

☆☆☆

اپنے باؤلنگ ایکشن میں ترمیم کر کے اسے آئی سی سی کے مروجہ قانون کے مطابق ڈھالنے کے بعد اسے مکمل طور پر کلیئر کر دیا گیا تو سری لنکا کے خلاف سیریز میں اسے شامل کر لیا گیا۔
سری لنکا میں گرمی اور حبس کے علاوہ کئی دوسری خوبیاں اور خوبصورتیاں ہیں، کولمبو میں پانچ ون ڈے میچز کی سیریز کھیلنے کے دوران فارغ دنوں میں وہ اپنا سیاحت کا شوق ضرور پورا کرتا تھا۔ کولمبو میں ہر چیز اسے پسند آئی تھی۔ ہوٹل، سڑکیں، پارکس، ساحل، میوزیم، بدھا کا مندر، مسجدیں، غرض ہر چیز اسے اچھی لگی تھی۔
آخری ٹیسٹ میچ سنہالیوں کے دیس کے ایک خوب صورت اور پرفضا مقام کینڈی کے کرکٹ اسٹیڈیم میں تھا۔
اس نے فراغت کے تین روز گزارنے کے لیے ''سٹی سینٹر'' سے اپنے لیے پینٹنگ کا سامان خرید لیا۔ اگلے دن اونچائی پر موجود اپنے ہوٹل ''کنگ ڈم گیٹ'' سے سٹیڈیم جا کر پریکٹس سیشن میں حصہ لینے کے بعد وہ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے ہوٹل چلا گیا۔ وہ تنہائی پسند نہ تھا مگر جیسے جیسے دوست ختم ہوتے جا رہے تھے، اس کو تنہائی کی عادت پڑتی جا رہی تھی۔
ٹیم کے دیگر کھلاڑیوں کے ساتھ کھانا نہ کھانے کی خبر اگر اخبارات کے ہاتھ لگتی تو وہ اسے اس کا مغرورانہ رویہ قرار دیتے مگر ریان ان کی زیادہ پروانہ کرتا تھا۔
کینڈی میں وہ کئی پارکوں اور تفریحی مقامات پر گھوما پھرا، مگر کوئی ایسا منظر اسے نہ بھایا جسے وہ اپنے برش

کے ذریعے کینوس پر اتار لیتا۔

تقریباً ڈھائی تین گھنٹے کے سفر کے بعد وہ سائیگریا پہنچ گیا۔ اسے ہر طرف سیاحوں کی ٹولیاں دکھائی دے رہی تھیں، جن میں کئی غیر ملکی بھی تھے۔ جلد ہی اسے عجیب وضع قطع کی وہ عظیم الشان چوٹی دکھائی دینے لگی جس کو سری لنکن گورنمنٹ دنیا کا آٹھواں عجوبہ claim کر رہی تھی۔ شاید اوپر کوئی بہترین چیز ہو۔ اس نے قیاس آرائی کی اور سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔

اس عظیم الشان چوٹی پر پہنچ کر اسے ہر طرف ہریالی دکھائی دینے لگی۔ منظر واقعی دل فریب تھا۔

وہ وہیں بنے ایک کیفے نما ریسٹورانٹ میں آ کر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور اس حسین وجمیل مقام سے لطف اندوز ہونے لگا اور اس وقت ادھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے ریان کو وہ منظر جس کی اسے تلاش تھی مل گیا۔

تھوڑی ہی دور ایک کھوہ نما جگہ تھی، جس پر ایک پتھریلی سل نے سایہ کر رکھا تھا۔ بالکل اس کے دائیں جانب چند درخت تھے اور ان سرسبز پتوں کے درمیان کھڑی وہ لڑکی تھی جس کو دیکھ کر ریان کے ذہن میں جھما کا ہوا تھا۔

اس کو وہ چہرہ یاد آ گیا اس جل پری کا چہرہ جو اس نے چار برس پہلے کراچی کے ساحل پر دیکھا تھا۔

اس وقت وہ جل پری لگ رہی تھی، آج ہریالی کا حصہ لگ رہی تھی۔ اس نے اسکن کلر کے ٹراؤزر پر شیفون جارجٹ کی ہلکی سبز گھٹنوں سے کچھ اوپر تک آتی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا رکھی تھی جبکہ ہاتھوں میں ایک بڑا سا ہرا پتہ پکڑ رکھا تھا وہ پتہ ان درختوں کا نہیں بلکہ مصنوعی لگ رہا تھا۔ وہ مسلسل اپنے سپید ہاتھوں میں پکڑے پتے کو دیکھ رہی تھی۔ تیز ہوائیں اس کے اجلے چہرے کو اس کی اپنی سیاہ زلفوں میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں، بادلوں کے پیچھے سے چاند جیسا خوب صورت لگتا ہے، وہ بھی ویسی ہی حسین دکھ رہی تھی۔

ریان کو اپنی یادداشت پر حیرانی ہوئی۔ وہ اس لڑکی کو اتنی جلدی پہچان گیا تھا کیوں؟ اور ریان کو پتا نہیں کیوں لگ رہا تھا کہ چہرہ مانوس سا ہے۔

وہ ویسی ہی ساکت کھڑی پتے کو دیکھ رہی تھی۔ ریان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا وجود اتنا ساکن کیوں ہے؟ وہ یوں سانس روکے کیوں کھڑی ہے؟ یہ کیسا اتفاق تھا کہ وہ لڑکی ایک دفعہ پھر اس کے سامنے آ گئی تھی؟

مگر ایسی کسی بھی بات کو سوچے بغیر اس نے بیگ سے اپنا ایزل اور کینوس نکال کر ایک خالی قطعے پر سیٹ کرنا شروع کر دیا۔ پھر برش، اور کلرز نکالے۔

اگلے ہی لمحے وہ اس کا اسکیچ بنانے لگا۔ وہ چہرہ نہایت مشکل تھا کیونکہ وہ بے تاثر تھا۔ مگر وہ چہرہ بناتے وقت اسے بے پناہ خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ صرف گیارہ منٹ اور پندرہ سیکنڈ میں اس نے خاکہ تیار کر لیا اور پھر اس حسن مجسم میں رنگ بھرنے لگا۔

تقریباً بیس منٹ بعد جب وہ اسکے ٹراؤزر کو پینٹ کر رہا تھا، وہ سست روی سے پتا ہاتھ میں لیے، روش پر چلتی ہوئی نیچے اترنے کے لیے زینوں کی جانب بڑھ گئی۔ ریان اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر بے دلی سے درختوں میں رنگ بھرنا شروع کر دیا۔

وہاں سے واپسی پر وہ تصویر اس نے کوریئر کے ذریعے لاہور ارسال کر دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے پاس ایک تصویر دیکھے اور خوامخواہ کچھ اور سمجھے۔

☆☆☆

ریان نے اس دفعہ چار روز تک یاد رکھا اور پھر بھول گیا۔

چار ماہ بعد وہ یو اے ای میں انڈیا اور نیوزی لینڈ کے خلاف سہ فریقی ٹورنامنٹ کھیلنے آیا تھا۔

ایک روز وہ دبئی میں شیرٹن (جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا) سے کچھ شاپنگ کرنے نکلا۔ جس ٹیکسی میں وہ بیٹھا، اس کا ڈرائیور ایک باتونی پٹھان تھا۔ وہ سارا راستہ ریان کو بتاتا آیا کہ وہ یہاں کس طرح رہتا ہے، کیسے جانوروں کی طرح روزی روٹی کماتا ہے اور پھر ساری رقم پاکستان بھیج دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ریان انتہائی تحمل سے اس کی گفتگو سنتا رہا، پھر اس نے ''خان'' کے خاموش ہونے پر یونہی بات کرنے کی غرض سے استفسار کیا۔ ''کرکٹ دیکھتے ہو، بابا؟''

''ارے، تم کیا بات کرتی ہے؟ کرکٹ تو ہماری جان ہے۔ ام سب پاکستانی جو ادھر دبئی شارجہ میں بستا ہے ام ساری کمنٹری بڑے شوق سے سنتا ہے۔'' وہ پرجوش لہجے میں اسٹیرنگ وہیل پر مکا مارتے ہوئے بولا۔ ایک دم جوش سے بولنے پر اس کے کان کی لوئیں سرخ ہوگئی تھیں۔

''اچھا، گڈ۔'' ریان نے اس کے ولولے کو سراہا۔ ''کون سے کھلاڑی پسند ہیں تمہیں؟''

''ام کو وقار یونس اچھا لگتا تھا، عمران خان بھی بہت اچھا لگتا تھا اور آج کل ام کو ریان حیدر بہت پسند ہے۔'' پٹھان ڈرائیور نے بیک ویو مرر اس کے چہرے پر سیٹ کر کے اس میں دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا ''تم کو پسند ہے ریان حیدر؟''

ریان چند ثانیے تو سوچتا رہا، پھر مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔ ''اچھا خان بابا، تمہیں کھلاڑیوں سے ملنے کا شوق ہے کیا؟''

''ارے شوق؟ ام کو تو جنون کی حد تک عشق ہے اپنے وطن کے کرکٹرز سے تم شوق کی بات کرتا ہے؟'' وہ فرط جذبات سے چور ہو کر بولا۔

ریان متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ اسے ایک مذاق سوجھا۔ ''اچھا میں تمہیں ان سے ملوا دوں گا۔ تم کل صبح آٹھ بجے شیرٹن ہوٹل آ جانا۔ اس وقت کھلاڑی بس میں بیٹھ رہے ہوں گے۔ تم ان سے مل لینا۔ میں بھی وہیں ہوں گا۔''

''ٹھیک صاب!'' وہ خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا۔

دبئی کا ''سیون اسٹار ہوٹل'' جس کی ساخت کشتی کے بادبان کی سی ہے اس شاپنگ سینٹر میں وہ آدھا گھنٹہ شاپنگ کرتا رہا۔

''لیمونیڈ......'' آرڈر کرنے کے بعد وہ اپنی انگلیوں سے عادتاً میز کی سطح بجانے لگا۔ دبئی میں ڈیڈ کے ایک دو قریبی دوست رہتے تھے جن سے ملنے بھی اسے جانا تھا اور اس وقت وہ اگلے چار مصروف دنوں میں سے وقت نکالنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کارنر کے ٹیبل پر موجود ذی نفس کو دیکھ کر وہ پتھر کا بن گیا۔

''کیا مذاق ہے یہ؟'' وہ بڑبڑایا۔

تیسری بار وہ اسے دیکھ رہا تھا، اور ایک دفعہ پھر وہ ایک نئے حلیہ میں تھی۔ اس نے سیاہ جارجٹ کا گاؤن اور اوپر سیاہ اسکارف پہن رکھا تھا۔ اس کے بال مکمل طور پر ڈھکے ہوئے تھے اور سیاہ لبادے میں سے اگر کچھ نظر آ رہا تھا تو وہ اس کے سپید ہاتھ، کالے نازک سے جوتوں میں جھلکتے پاؤں اور نکھرا نکھرا چہرہ۔

اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ میز پر رکھے ایک کاغذ پر پنسل سے کچھ بنا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ نگاہیں اٹھا کر ایک دفعہ نصب پلازمہ اسکرین کو بھی دیکھ لیتی اور پھر اپنے کام میں مگن ہو جاتی۔

پچھلی دو دفعہ جب ریان نے وہ چہرہ دیکھا تھا، تو وہ بالکل صاف شفاف اور میک اپ سے بے نیاز تھا، البتہ آج اس نے اپنی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں پر کاجل لگایا ہوا تھا جو انتہائی خوب صورت لگ رہا تھا۔ یہ کاجل بھی ریان کو تب نظر آیا تھا جب وہ نگاہیں اٹھاتی تھی ورنہ وہ ہمیشہ کی طرح اس کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی۔

''یہ کیا ڈرامہ ہے؟ یہ لڑکی کیوں مجھے تیسری دفعہ دکھائی دے رہی ہے؟ یہ ہر اُس جگہ کیوں ہوتی ہے جہاں میں جاتا ہوں؟'' اور پھر اس کی سمجھ میں آ گیا اور بے اختیار ہی اس کے لبوں پر ایک مسکان بکھر گئی۔

''یہ کوئی کریزی فین ہے جو پاکستان کرکٹ ٹیم کے ہر میچ کو follow کرنے کی کوشش میں ان شہروں میں جاتی ہے جہاں میچز کا انعقاد ہو رہا ہوتا ہے۔ میں ایسے ہی اسے سیریس لے رہا ہوں۔'' اس نے مسکرا کر سر جھٹک دیا۔

اس کے بعد اپنا من پسند مشروب پینے تک اس نے اس لڑکی پر کوئی توجہ نہ دی اور گلاس خالی کر کے جب لاشعوری طور پر اس کی جانب دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ شاید جا چکی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز جب ٹیم کے ڈریس میں اپنی کٹ کے ہمراہ دیگر کھلاڑیوں کے ساتھ ہوٹل سے نکل کر بس میں چڑھ رہا تھا تو اس نے اس کیب ڈرائیور کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ وہ نیچے اتر آیا اور اس کا استقبال کیا۔

''اے! تم نے کیوں کرکٹ والے کپڑے پہن رکھے ہیں؟'' وہ پٹھان حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''وہ خان بابا۔'' ریان نے بمشکل اپنی ہنسی کنٹرول کی۔ ''میں ریان حیدر ہوں۔''

''ابھی ام تم کو اپنی پشاوری چپل سر پر لگائے گا تو تم سچ بولو گی۔ کیوں امارے ساتھ مذاق کرتی ہے؟'' وہ بگڑ کر بولا۔

''میں واقعی ریان حیدر ہوں۔'' وہ اپنی صفائی دینے لگا۔

''کیوں جھوٹ بولتی ہے؟'' وہ اب غصے سے بولا اور ریان کا بازو پکڑ لیا۔ ''ام تم کو تب تک نہیں جانے دے گا جب تک تم ریان حیدر سے نہیں ملوا دیتا۔''

بالآخر ریان نے اپنے ٹیم منیجر، کوچ اور ایک دو کھلاڑیوں کو بلا کر تصدیق کروائی تو اس ''خان صاب'' کو یقین آیا اور ریان کی گلو خلاصی ہوئی۔

☆☆☆

ریان نے اب کی بار اس لڑکی کو مکمل طور پر اپنے ذہن سے تو نہ نکالا، البتہ اب اس نے اس پر توجہ دینی چھوڑ دی، کیونکہ اس کے حوالے سے جو تجسس اس کے ذہن میں پنپ رہا تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ اپنے طور پر اس نے فرض کر لیا تھا کہ وہ کرکٹ ٹیم کی ایک کریزی فین ہے اور کچھ نہیں۔

ان دنوں وہ باؤلنگ اتنے زبردست طریقے سے نہیں کر رہا تھا جتنی تہلکہ خیز بیٹنگ کا مظاہرہ کر رہا تھا وہ بھرپور فارم میں تھا اور اس کا مظاہرہ اس نے انگلینڈ کے خلاف ہوم سیریز میں کیا تھا۔

انگلینڈ کے خلاف سیریز کے بعد کھلاڑیوں کو دو ہفتے کا ریسٹ ملا اور پھر اگلے دو ہفتے کیمپ لگ گیا، جس کے بعد ساؤتھ افریقہ کا دورہ تھا۔

ہیروں کا دیس ساؤتھ افریقہ جو اپنی ہیروں کی کانوں......نسلی امتیاز اور ساحلوں کے باعث مشہور ہے کی آبادی کا نو فیصد گوری چمڑی پر مشتمل ہے اس کے باوجود ایک عرصے تک کلرڈ کو ٹیم میں کھیلنے کی اجازت نہ تھی۔ ساؤتھ افریقہ کی ٹیم پہلے صرف انگلینڈ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے میچز کھیلنا پسند کرتی تھی، جس کے باعث I.C.C نے ان کی رکنیت منسوخ کر دی تھی۔

کیپ ٹاؤن میں میچ کے دوران وہ بیٹنگ کر رہا تھا تھوڑی ہی دور، کرسیوں کے درمیان ہی ایک گھنا درخت تھا جس کا جھکاؤ اسٹیڈیم کی جانب تھا۔ اس درخت پر ایک سیاہ فام موجود تھا اور وہ بھی ایسے کہ ایک کمزور شاخ کو پکڑ کر لٹکا ہوا تھا۔ جنوبی افریقن باؤلرز اس کو کبھی سلو گیند کراتے تو کبھی شارٹ پچ، اس کو کھیلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ سیاہ فام جو درخت پر چڑھا ہوا تھا گلا پھاڑ پھاڑ کر ریان کو مخاطب کرنے لگا۔ ریان نے مڑ کر اسے دیکھا اور چونک گیا۔

وہ کہہ رہا تھا ''باؤنسر۔''

ریان نے دھیان نہ دیا اور دوبارہ کھڑا ہو گیا۔ اگلی گیند جو باؤلر نے کرائی وہ بے حد باؤنس ہوئی تھی اب ریان کو سمجھ میں آ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر چیخ رہا تھا ''فل......فل'' اگلی گیند یارکر تھی۔ مگر ریان اس کے لیے تیار تھا۔ اگلے آدھے گھنٹے تک وہ اس کو ہدایات دیتا رہا۔ وہ شاید اس کا کریزی قسم کا فین تھا۔

وہ چند ہدایات مزید دے دیتا اگر جس شاخ سے لٹکا ہوا تھا نے گر نہ جاتا۔ منتظمین ویسے ہی اسے کافی دیر سے نیچے آنے کو کہہ رہے تھے اس لیے جیسے ہی وہ گرا عملے نے فوراً اس کے بے ہوش وجود کو اٹھا کر ایمبولینس میں ڈالا اور ہسپتال لے گئے۔

میچ کے بعد ریان اس سے ملنے گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ اسے چار گھنٹے بعد ہوش آیا تھا اور ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹتے ہی بجائے اپنی حالت و کیفیت کے متعلق دریافت کرنے جو پہلا سوال اس کے لبوں سے نکلا تھا وہ یہ تھا۔

''میرا دوست کہاں ہے؟''

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کہیں آؤٹ تو نہیں ہو گیا؟ ریان بے حد متاثر ہوا۔ وہ جا کر اس سے ملا اور اس کو بتایا کہ وہ ابھی 63 پر کھیل رہا ہے اور کوشش کریگا کہ ٹیسٹ میچ کے اگلے دن بھی نہ آؤٹ ہو۔ ریان کو اپنی وجہ سے اس کے زخمی ہو جانے کا بے حد ملال تھا۔ اس نے اس غریب سیاہ فام کے علاج کا سارا خرچا اٹھایا اور دوبارہ جب ون ڈے

میچ کھیلنے کے لیے کیپ ٹاؤن آیا تو ''رابن'' سے ملنے ضرور گیا، جو بے چارہ اپنے پسندیدہ کرکٹر کو آؤٹ ہونے سے بچانے کے لیے اپنی ٹانگ، بازو، دو پسلیاں، ایک دانت تڑوا جبکہ کمر میں فیکچر کروا چکا تھا۔

کیپ ٹاؤن میں ایک غار ہے جسے محبت کا غار کہا جاتا ہے۔ یہ نام رکھنے کی وجہ تو ریان کو معلوم نہ تھی البتہ اس کو دیکھنے کے لیے آئے گئے سیاحوں کے جمگھٹے...... نے اس کو اتنا ضرور باور کرا دیا تھا کہ وہ کوئی عام غار نہیں ہے، بلکہ ایک اہم تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

جس وقت وہ باقی کھلاڑیوں کے ہمراہ اس تنگ دہانے والے غار کو دیکھنے گیا، اس وقت ان کے ساتھ ایک مقامی گائیڈ بھی تھا۔

اس دوران ریان کو جھٹکا لگا۔ جب اس نے ایک سنگی بینچ پر بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا جس کو اس نے اس سال میں دو مرتبہ اور چار برس پہلے ایک دفعہ دیکھا تھا۔ وہ آج پھر وہاں بیٹھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح ساکت۔

آج اس نے ہلکے گرے رنگ کا پورے بازوؤں والا کھلا کرتا نیچے اسی رنگ کی شلوار اور گرے پائی پنگ والا سفید دوپٹہ گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ اپنے بے حد سیدھے سیاہ لمبے بالوں کو اس نے ایک عام سے سفید کیچر کے ذریعے ہاف باندھا ہوا تھا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھے غار کے دہانے پر موجود سیاحوں کو مسلسل دیکھ رہی تھی۔ اس نے آج بھی، آنکھوں کو کاجل سے خوب کالا کیا ہوا تھا۔

ریان نے جیبوں کو...... ٹٹولا کہ شاید کوئی قلم کاغذ نکل آئے مگر وہ قلم کاغذ رکھتا ہی کب تھا؟ بھاگ کر قریب بنے ریسٹورنٹ میں گیا اور کاؤنٹر گرل سے ان دو چیزوں کا مطالبہ کیا۔ مطلوبہ اشیاء مہیا ہو جانے کے بعد وہ اپنی جگہ پر واپس آ گیا اور اس کی تصویر بنانی شروع کر دی۔

وہ بدستور وہیں اپنے رکے ہوئے وجود، ساکت دھڑکنوں اور ساکن سانسوں کے ساتھ کتنی ہی دیر بیٹھی رہی۔ جب ریان نے وہ تصویر مکمل کر لی، تو اندر ریسٹورنٹ سے ایک ویٹر کو بلایا اور کاغذ تہہ کر کے اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اسے اس لڑکی کے پاس لے جانے کی ہدایت کی۔

وہ ویٹر کو اس کے قریب جاتا ہوا دیکھنے لگا اس کا دل نامعلوم احساس سے دھڑک رہا تھا۔ نجانے وہ کیا سمجھے؟

ویٹر نے قریب جا کر اسے مخاطب کیا اور وہ کاغذ دیتے ہوئے ریان کی سمت اشارہ کر کے کچھ بتایا۔ وہ لڑکی خاموشی سے ریان کو نہیں ویٹر کو دیکھتی رہی اور جب وہ بات ختم کر چکا تو اس نے شائستگی سے سر کو خم دے کر جیسے شکریہ ادا کیا مگر بولی کچھ نہیں۔ اس نے وہ کاغذ دیکھے بغیر بنچ پر رکھ دیا اور وہ دوبارہ غار کو دیکھنے لگی۔ اس نے ایک دفعہ بھی کاغذ کی تہیں کھول کر نہیں دیکھا۔ اس نے ایک دفعہ بھی ریان حیدر کو نہیں دیکھا اس نے ایک لفظ بھی نہیں بولا اور وہ ایک دفعہ بھی نہیں مسکرائی۔ بس سپاٹ چہرہ لیے غار کے دہانے کو دیکھتی رہی۔

وہ انتظار کرتا رہا، مگر اس نے دوبارہ کاغذ کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

ریان کو برا لگا تھا۔ اس کو دکھ ہوا تھا اس نے اتنی محنت سے وہ تصویر بنائی تھی مگر اس کٹھور لڑکی نے ایک دفعہ بھی اسے نہیں دیکھا، مگر کیوں؟ کوئی وجہ بھی تو ہو شاید وہ اس کی فین نہیں تھی، اسے وہ برا لگتا تھا۔ شاید ایسا ہی ہو خیر جو

بھی تھا ریان کو بہت دکھ ہوا تھا۔

اپنے دکھ اور اس لڑکی کے رویے کے باوجود ریان نے ایک اور کاغذ منگوا کر اس کی تصویر ضرور بنائی تھی۔ تصویر بناتے ہوئے صرف آج نہیں بلکہ سری لنکا میں بھی، اس کو وہ رنگ بہت عجیب لگی تھی جو اس لڑکی کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں تھی۔

چند منٹ بعد وہ لڑکی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ ریان نے نوٹ کیا کہ اس نے اس دفعہ کھلاڑیوں سے آٹوگراف نہیں لیے۔

اس کے جانے کے بعد ریان نے بینچ پر بے حسی سے رکھا گیا کاغذ اٹھالیا۔ اسے واقعی بہت افسوس ہوا تھا۔

☆☆☆

میرین نے بائیس سال کی عمر میں شادی کی تھی اور ستائیس سال کی عمر میں اس کا بیٹا پیدا ہوا تھا۔

ریان کو انجلینا اور ڈینئل نے چھوڑا تھا، البتہ اسے لگا وہ میرین سے اب ناراض نہیں رہ سکتا۔ ان دونوں کی بات اور تھی، دوستی اور کزن کے رشتے کے علاوہ ان کے ساتھ ریان کا کوئی قلبی تعلق استوار نہ تھا مگر میرین اور وہ انوٹ انگ تھے۔ وہ اس سے کتنا ناراض اور خفا رہ سکتا تھا؟ وہ اپنے ڈپلومیٹ شوہر، جو کہ اب سفیر بن چکا تھا کے ساتھ اردن میں تھی اور وہیں اس کا بیٹا ہوا تھا۔

وہ ان دنوں ہوم سیریز کھیل رہا تھا مگر اس خبر کے ملنے اور اپنا ذہن بدل کر فیصلہ کرنے کے بعد اس نے اگلے دو میچز کھیلنے سے معذرت کر لی اور عمان آ گیا۔ وہ ان دنوں ہاسپٹل میں تھی۔ ریان کو یہ تمام معلومات انیہ سے ملی تھیں۔

دروازہ ہلکا سا بجا کر وہ اسے دھکیل کر اندر داخل ہوا اور اسے جھٹکا لگا۔ بستر پر لیٹی لڑکی میرین نہیں تھی۔ وہ میرین ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

آہٹ پر اس نے آنکھوں کے بند دریچے وا کر کے حیرت و بے یقینی سے اپنی جانب دیکھتے ریان کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔

وہ دونوں اس وقت حیرت سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ جس سے رابطہ کرنے کی اور بات کرنے کی کوشش میرین نے پچھلے پانچ سالوں میں بیشتر دفعہ کی تھی، وہ آج بن بلائے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ میرین کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

جس تر و تازہ اور شگفتہ چہرے اور مسکراتی آنکھوں والی لڑکی سے وہ ملنے آ رہا تھا اس کی جگہ سوکھی ہوئی جلد، کملائی ہوئی رنگت اور ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوئی لڑکی کو دیکھ کر ریان کو بھی اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''رونی!'' بمشکل اس کے لبوں سے نکلا۔ اس نے بے اختیار اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر ریان نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''کب آئے رونی؟ بیٹھو!'' وہ مسلسل اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

''ابھی۔'' مختصراً کہتا ہوا ریان اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''میرا بیٹا دیکھا ہے؟'' میرین نے پوچھا، ریان کچھ فاصلے پر کاٹ میں لیٹے بچے کو دیکھنے کے بجائے اس کا چہرہ ہی تکتا رہا۔

''ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟'' اس کو یوں اپنی طرف دیکھتا پا کر میرین نے آہستگی سے پوچھا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے، این؟''

''پہلے میرا نام کم بگاڑا ہے، جواب مزید چھوٹا کر رہے ہو۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر اس کی بات کو یکسر نظر انداز کر گئی۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' وہ دکھی ہو کر بولا۔ ''تم ایسی تو نہ تھیں۔ تم کیوں اتنی کمزور ہو گئی ہو؟ کیوں تمہاری آنکھوں تلے حلقے پڑ گئے ہیں، چہرہ بھی کیسے زرد ہو رہا ہے۔ تمہیں کوئی بیماری تو نہیں ہے؟'' ایک دم پریشان ہو کر ریان نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں، بس اکیلی ہو گئی ہوں۔'' وہ کچھ جتا کر بولی۔

''کیوں؟ تمہارا ہزبنڈ......؟''

میرین نے جواب دینے کے بجائے چہرہ جھکا لیا۔

''وہ......کیا کرتا ہے وہ؟'' کچھ چونک کر اس نے پوچھا۔

''ایمبیسڈر ہے۔''

''میرا مطلب ہے وہ......وہ تمہارا خیال نہیں رکھتا؟''

''خیال؟'' میرین نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔ ''ہاں رکھتا ہے۔''

''تم بولتی تھیں، ہنستی تھیں، گاتی تھیں، لوگوں کو لاجواب کر دیتی تھیں۔ ایسے بستر سے تو نہ لگ کر رہ جاتی تھیں۔''

''ریان! میں نے اس پہلو پر بہت سوچا، میری سمجھ میں آ گیا کہ جو لوگ دوسروں کو لاجواب کرنے کا فن جانتے ہیں وہ خود ایک دن بہت بری طرح بے بس ہو جاتے ہیں۔''

''مگر تمہیں تو یوں لگتا ہے بے بس کر دیا گیا ہے۔''

''کس نے کرنا ہے مجھے بے بس خدا کے علاوہ؟'' وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔

''تمہارے شوہر نے اور کس نے۔'' اس کا ذکر کرتے ہوئے ریان کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔

''ایسے مت کہو ریان، وہ جیسا بھی ہے میرا شوہر ہے، میں اس سے اتنی محبت کرتی ہوں جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''باقی لوگ نہیں آئے کیا؟'' ریان کا اشارہ اینجلینا اور ڈینئل کی جانب تھا۔

میرین نے ایک سرد آہ بھری اور بولی ''وہ مجھ سے ملتے ہی کب ہیں۔ وہ بڑے اسٹار بن چکے ہیں۔''

''تم دیکھتی ہو اینجلینا کی موویز؟'' اس کا نام لیتے ہوئے ریان کی آواز میں لاتعلقی تھی۔

''نہیں مجھے وہ تماشے نہیں پسند جو میری سابقہ دوست لگاتی ہے۔''

''ڈینی کے میچز تو دیکھے ہوں گے؟'' اس نے کریدا۔

''ہونہہ اس نے ٹیم میں رسائی کوچ کی بیٹی سے شادی کر کے حاصل کی تھی۔ اب کوچ بدل گیا ہے تو اس نے طلاق لے لی ہے۔ مجھے بغیر میرٹ پر سفارشیوں کے میچز دیکھ کر کیا کرنا ہے۔''

''کیوں یہ لوگ اتنے مادہ پرست ہو گئے ہیں؟ دولت کے پیچھے بھاگنے والے؟''

''تمہیں یاد ہے ریان! بچپن میں انجلینا میرے حصے کا بھی کھا جایا کرتی تھی؟ اسکی بھوک اور لالچ کبھی ختم نہیں ہوگی، ہوس ختم ہو ہی نہیں سکتی۔''

''سچ بتاؤں میرین! مجھے شرم آتی ہے کہ یہ لوگ کبھی میرے دوست تھے۔ میں بھی اسٹار ہوں اور مجھے کرکٹ سے ملنے والی پذیرائی پسند ہے مگر کرکٹ مجھے جو دولت دے رہی ہے اس پر میں کبھی نہیں سوچتا۔ پتا نہیں لوگ کیوں دولت کے پیچھے بھاگتے ہیں؟''

''پتا نہیں۔''

''اور ایک تمہارا شوہر ہے......'' وہ خاموش ہو گیا۔

''میرا بیٹا دیکھا ہے؟''

ریان نے نفی میں سر ہلایا اور اٹھ کر کاٹ کی جانب بڑھا۔ جھک کر اس نے سرخ و سفید وجود کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

''نام کیا رکھا ہے؟'' سر اٹھا کر میرین کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم رکھو۔''

''میں کیا رکھوں؟'' وہ حیران بھی ہوا تھا اور یہ اعزاز بخشے جانے پر خوش بھی۔

''جو تمہاری مرضی۔'' وہ بھی مسکرا دی۔

''یہ بہت اچھا بچہ ہے کیونکہ اس نے تمہیں اور مجھے ملا دیا ہے۔ یہ ایک طرح سے میرے اور تمہارے درمیان ایک برج سا بن گیا ہے۔ اس کا نام بھی کوئی ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' وہ سوچنے لگا۔ ''کیا خیال ہے، جبرائیل کیسا نام ہے؟''

''تم رکھ رہے ہو، اس لیے بہت اچھا ہے۔''

''اوہ کم آن۔'' وہ واپس اس کے پاس آ گیا۔ ''تم بھی نا......'' وہ خوامخواہ ہی ہنس دیا۔ ''رکھ دوں یہ نام؟'' پوچھنے لگا۔

''ہاں۔''

''تمہارا شوہر؟'' وہ تذبذب سے بولا۔

''اس کی پروا مت کرو۔ میں اسے تمہارے متعلق نہیں بتاؤں گی۔ یہ کہہ کر یہ نام بتاؤں گی کہ میں نے رکھا ہے۔''

''وہ مجھے جانتا ہے؟''

''ہاں اور تمہیں پسند بھی نہیں کرتا، مگر میں نے کہا نا کہ تم اس کی پرواہ ہی نہ کرو۔'' میرین نے پُر اعتماد لہجے

میں کہا۔ ریان پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کیوں مجھے پسند نہیں کرتا مگر کچھ سوچ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔

☆☆☆

جبرائیل آئر، ریان اور میرین کو واپس ملانے کا سبب بنا تھا اور اس ایک چیز نے ریان کی زندگی میں ایک دفعہ پھر بہاریں بھر دی تھیں۔ گویا ان ویرانیوں کا سبب میرین سے دوری تھی۔

وہ واپس تو آ گیا، مگر ہر دو تین روز بعد اس سے فون پر بات ضرور کرتا تھا۔ جو بات اسے کھلتی تھی، وہ شینڈلر آئر کا میرین کے ساتھ رویہ تھا۔ میرین اپنے شوہر کے بارے کوئی گلہ شکوہ یا شکایت اس کے سامنے نہ کرتی تھی مگر وہ جانتا تھا۔ وہ صبر کر رہی تھی برداشت کر رہی تھی پہلے اپنے اور اب اپنے بیٹے کے لیے۔ اپنے بیٹے کو وہ کسی بروکن فیملی کا فرد نہیں بنانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

''ہلیں مت...... چہرہ مت ہلائیں، اسمائل دیں نا۔''

''اوہ ہو۔ کتنی دیر سے بٹھایا ہوا ہے مجھے اس طرح؟ پورٹریٹ بنا رہے ہو یا مجسمہ؟'' رانیہ نے جھلا کر کہا مگر وہ جھلاتی بھی اتنے نرم طریقے سے تھیں کہ بے اختیار پیار آتا تھا۔

''بولیں مت، ورنہ اتنی ڈراؤنی تصویر بناؤں گا کہ ڈیڈ گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔'' وہ دھمکاتے ہوئے کینوس پر اسٹروکس لگا رہا تھا۔

''میرا تو خیال تھا کہ تم...... جلدی بنا لو گے، اتنی دیر کیوں لگا رہے ہو؟'' وہ کچھ دیر خاموشی کے بعد بولیں۔

''عورت ہیں نا بولے بغیر رہ نہیں سکتیں۔'' وہ مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''دیر کہاں لگا رہا ہوں، صرف ایک سٹنگ میں آپ تصویر بنوانا چاہ رہی ہیں۔ پھر تھوڑی دیر تو لگے گی حالانکہ میں جلدی کر رہا ہوں۔''

''اچھا جتنی بھی بنی ہے دکھا دو۔'' وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئیں۔ ''ارے بنا تو تم چکے ہو، رنگ بعد میں کر لینا مجھے جانے دو۔''

''نہیں، نہیں، آپ نہیں جا سکتیں۔'' اس نے برش رکھ کر ماں کو کندھوں سے تھام کر دوبارہ کرسی پر بٹھایا۔ ''ادھر بیٹھیں آرام سے۔''

''رونی! کتنی دیر لگاؤ گے؟''

''بس دو منٹ اور۔''

''پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے تم یہی کہہ رہے ہو۔'' وہ خفگی سے بولیں۔

''تو آپ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے پوچھ کیوں رہی ہیں، جب جواب پتا بھی ہے تو؟'' وہ لاپروائی سے بولا تو مما ایک گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

''تم نہیں بدلو گے ریان!''

''آپ اچھے اور پیارے کپڑے کیوں بناتی ہیں؟''

''کیونکہ آرائش وزیبائش سے کوئی مذہب یا قانون منع نہیں کرتا اور خود کو سنوارنا اور سجانا عورت کا بنیادی حق ہے۔'' وہ بولیں۔

''مگر میرے لیے کوئی ایسی لڑکی ڈھونڈیے گا، جو زیادہ میک اپ نہ کرتی ہو۔'' وہ فوراً بولا۔ لڑکی ڈھونڈ نے والی بات اس نے اس لیے کی تھی کہ اب علی کے بعد اسی کی باری تھی۔

''او ریئلی تو تم شادی پر تیار ہو؟'' وہ خوشی سے بولیں۔

''ہاں بالکل مگر لڑکی سادہ سی ہو۔'' اس نے فوراً اپنی پسند سے آگاہ کر دیا۔

''ارے تم اس کی فکر ہی نہ کرو۔''

''ہاں تو میں نے پہلے کون سا فکریں پال رکھی ہیں اور پلیز! آپ چپ کر جائیں ورنہ۔'' اس نے دھمکایا تو وہ خاموش ہوگئیں، مگر دل میں وہ بہت خوش تھیں۔

☆☆☆

وہ مسلسل کھانس رہی تھی۔

''میرین۔'' ریان پریشان ہو کر بولا۔ ''کیا بات ہے؟ کیوں اس طرح کھانس رہی ہو؟''

''کچھ نہیں، بس طبیعت ٹھیک نہیں۔'' اس نے ٹالنا چاہا۔

''تو چیک اپ کرواؤ نا؟''

''میں شینڈلر کے ساتھ چیک اپ کروانے نہیں جانا چاہتی۔'' وہ دوٹوک مگر کمزور آواز میں بولی۔

''اچھا، میں آجاؤں؟'' اس نے فوراً پیشکش کی۔

''تمہیں تکلیف ہوگی۔'' وہ ایک دفعہ پھر ٹال رہی تھی۔

''تکلف مت کرو، کہیں اس شخص نے۔'' میرین نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ریان پلیز، اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔''

''اچھا میں آجاتا ہوں۔''

''اوکے۔'' اس دفعہ اس نے احتجاج نہیں کیا۔

وہ دو روز بعد عمان پہنچا اور جس پہلے شخص سے اس کی ملاقات ہوئی وہ شینڈلر آرتر تھا۔

''ہیلو۔'' اس نے نہایت سرد انداز میں ریان کا استقبال کیا۔

''ہائے۔'' ریان لب بھینچ کر رہ گیا۔

''کب آئے ہو؟'' وہ اسی سپاٹ انداز میں پوچھنے لگا۔

''ابھی۔'' وہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو سخت ناپسند کرتے تھے اور یہ بات اچھی طرح جانتے بھی تھے۔

ریان نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔

وہ چھتیس برس کا، مضبوط جسم اور دراز قد رکھنے والا خوب صورت مرد تھا۔ اس کی آنکھیں بے حد شفاف اور گہرے کلر کی تھیں جبکہ بال سیاہ تھے۔ ریان اس کو پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ جن دنوں میرین نے اس سے شادی کی تھی، ریان ذہنی اور جذباتی طور پر میرین سے متنفر تھا اور ایسے حالات میں اس سے شادی کرنے والے مرد کا تصور بھی اس کے ذہن میں کچھ اچھا نہیں بنا تھا، اس سے ملنے کے بعد اور بالخصوص اس کا سپاٹ انداز محسوس کرنے کے بعد اسے شینڈلر آئر قطعاً پسند نہیں آیا تھا۔

وہ بھی ریان کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کو میرین نے ریان کے متعلق بہت کچھ بتایا تھا مگر وہ دو باتیں شینڈلر کو یاد رہ گئیں تھیں کہ ریان ایک مسلمان ہے اور یہ کہ وہ میرین کا دوست رہ چکا ہے۔

''میرین کہاں ہے؟'' ریان نے دانستہ طور پر فرنچ میں اسے مخاطب کیا۔ بعض اوقات ہم کسی دوسرے پر رعب ڈالنے کے لیے کوئی ایسا کام ضرور کرتے ہیں، جو دوسرے بندے کے خیال میں ہم نہیں کر سکتے اور ریان کا خیال تھا کہ شینڈلر اسے کوئی جاہل پاکستانی سمجھتا ہوگا، اسے ضرور اس کو غلط ثابت کرنا چاہیے۔

اور شینڈلر کے چہرے پر چند لمحے کے لیے در آنے والی حیرت سے یہ اندازہ کرنا قطعاً مشکل نہ تھا کہ وہ واقعی ریان کو جاہل اور گنوار پاکستانی ہی سمجھتا تھا اور اس کے منہ سے فرنچ سن کر بے حد حیران ہوا۔

''ٹھہرو، وہ آرہی ہے۔'' وہ سنبھل کر بولا۔

چند لمحے توقف کرنے کے بعد رسماً کہنے لگا ''بیٹھو۔'' وہ بھی اب فرنچ بول رہا تھا، ویسے بھی فرانسیسیوں کو فرنچ کے علاوہ کسی اور زبان میں بات کرنا بے حد ناگوار گزرتا ہے۔

ریان نہایت کروفر سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور بظاہر تنقیدی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

''مجھے جانا ہے، سو گڈ بائے اینڈ، ہیو اے نائس ڈے۔'' آخری فقرہ جانے کیوں انگریزی میں ادا کر کے شینڈلر نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے وہاں سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی میرن سٹنگ روم میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر ریان کو دھچکا لگا۔

وہ پہلے سے زیادہ کمزور ہوگئی تھی اس کے سرخ و سفید گال اندر کو پچک گئے تھے جبکہ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے پڑے تھے۔ رنگت بے حد زرد ہو رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے جھلس گئی ہو۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''میرین؟'' اس کے لبوں سے حیرت و بے یقینی سے نکلا۔

''کیسے ہو ریان؟'' وہ زبردستی مسکرائی تو اس کی براؤن آنکھوں کے گرد دو ہلکی ہلکی لکیریں سی پڑ گئیں۔

''تم کیسی ہو؟ ٹھیک تو نہیں لگ رہیں۔'' وہ فکر مندی سے اسے دیکھتے ہوئے بیٹھ گیا، تو وہ بھی سامنے براجمان ہوگئی۔

''ٹھیک نہیں ہوں۔'' وہ نقاہت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟'' وہ بے چینی سے بولا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔''

''میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو'' وہ سختی سے بولا تو اس نے منع کرنا چاہا مگر اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود بھی وہ اسے لے کر چلا گیا۔

''چاہے تمہارا شوہر مجھے گولی ہی کیوں نہ مار دے میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں گا'' وہ غصے کو قابو کرتے ہوئے بولا تو وہ خاموش ہوگئی۔

ڈاکٹر نے اس کے چند ٹیسٹ لیے اور ان کی رپورٹس تین دن بعد لینے کو کہا اور میرین کو سختی سے آرام کرنے کی ہدایت کی۔

بعد میں میرین کے علم میں لائے بغیر ہی ریان نے ڈاکٹر کو رپورٹس کے لیے ایڈوانس پے منٹ کی اور ساتھ میں اپنا پتہ بھی لکھوا دیا کہ وہ رپورٹس آنے پر اس کو ایک کاپی پاکستان بھجوا دے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میرین اسے کچھ نہیں بتائے گی چاہے رپورٹس میں کوئی خطرناک بات ہی کیوں نہ ہو۔

کلینک سے نکلنے کے بعد وہ اسے عمان کے بازار لے آیا۔

ایک مہنگے اسٹور سے وہ دھڑا دھڑ جیولری اور میرین کے لیے گفٹس خریدنے لگا، میرین اسے روکتی رہ گئی مگر وہ اس کی پروا کیے بغیر ہی شاپنگ میں مصروف رہا۔

انیہ اور علی کی شادی بھی قریب ہی تھی ان دونوں کی بچپن سے بات طے تھی اور اب شادی ہو رہی تھی، سو ان کے لیے گفٹس بھی لیے۔

''سنو کیسا ہے یہ برسلیٹ؟'' وہ ایک قیمتی سلور برسلیٹ اسے دکھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''ریان! بس کرو، اتنا کچھ تو تم لے چکے ہو میرے لیے۔'' میرین نے فوراً احتجاج کیا۔

''اوہو، تمہارے لیے تھوڑی لے رہا ہوں، وہ تو بیہ کے لیے......'' اس کی بات منہ میں ہی رہ گئی، وہ ٹھٹک کر سامنے دیکھنے لگا۔

اس سے کچھ فاصلے پر جیولری دیکھتی لڑکی کا چہرہ اسے سائیڈ سے ہی دکھائی دے رہا تھا مگر وہ اسے پہچان گیا تھا۔

یہ وہی تھی، جو ہمیشہ کسی بے حد اچھے لباس اور قیمتی جیولری میں ملبوس میچ کے دوران یا اس کے کسی بھی فارن ٹور پر موجود ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ یہی سمجھا کرتا کہ یہ پاکستانی کرکٹ ٹیم کی فین ہے۔ جو ہر اس جگہ موجود ہوتی ہے جہاں ٹیم ہوتی ہے۔ مگر اس کی عمان میں موجودگی یہ ظاہر کرتی تھی کہ وہ ریان حیدر کی فین ہے۔

ریان برسلیٹ رکھ کر کڑی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ جیولری دیکھتے ہوئے مسلسل اپنے ہمراہ موجود ایک ادھیڑ عمر خوش لباس خاتون سے باتیں کر رہی تھی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ریان نے اسے بولتے سنا تھا وہ اس کی آواز ٹھیک سے سن تو نہیں پا رہا تھا مگر اس کے خوب صورت لب ہلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟ کون ہے یہ؟'' اس کی نگاہوں کے تعاقب میں میرین نے بھی اسے دیکھا۔ پھر سوالیہ نظروں سے ریان کا چہرہ تکنے لگی۔

"پتانہیں۔" ریان نے شانے اچکائے۔"
اسی اثناء میں وہ لڑکی مڑی اور سیدھا ریان اور میرین کو دیکھا مگر میرین اس وقت تک پلٹ چکی تھی، اسی لیے وہ اس کی محض پشت ہی دیکھ پائی مگر صرف ایک لمحے کے لیے ریان اور اس کی نگاہیں ملی تھیں اور ریان نے ان بڑی بڑی سیاہ خوب صورت آنکھوں میں حیرت اور شاک کی کیفیت دیکھی تھی، بس ایک لحظہ بھر کو نظریں ملیں اور پھر وہ شانے جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

ریان اس کی پشت پر بکھرے گھنے سیاہ بال دیکھتا رہا۔

"چلو۔" میرین کی آواز پر وہ چونک پڑا پھر کچھ خفیف سا ہو کر برسلیٹ اٹھالیا اور کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

پاکستان واپس آنے کے سترھویں روز اسے میرین کی رپورٹس مل گئیں اور وہ کسی بری خبر کے نہ ہونے کی دعا کرتے ہوئے لفافہ کھولنے لگا۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ میرین کے ساتھ کچھ نہ کچھ سیریس ضرور ہے، ورنہ اس کی طبیعت اتنی خراب نہ ہوتی مگر جو اسے رپورٹس پڑھ کر معلوم ہوا۔

میرین کو پھیپھڑوں کا کینسر تھا، آخری سٹیج پر پہنچ چکا تھا۔ ریان کے ہاتھ سے رپورٹس بے اختیار چھوٹ گئیں۔ وہ بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں گیا اور سیل فون اٹھا کر اس کا نمبر ملایا۔

"ہیلو میرین۔" سلسلہ ملتے ہی وہ بے تابی سے بولا۔

"ریان! میں تمہیں کال کرنے ہی والی تھی۔" اس کی آواز سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ ریان نے بے یقینی سے ریسیور کر گھورا۔

"ریان، تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے میرے پاس۔" اس کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا جیسے کوئی بہت بڑی خوشی اس کو ملی ہو۔ "ہم لوگ نیکسٹ منتھ فرانس واپس جا رہے ہیں، شینڈلر کی ایک سال کی ٹریننگ ہے اس کے بعد ہم لوگ اسلام آباد ہائی کمیشن میں آجائیں گے۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ اب ہم دونوں قریب ہو جائیں گے۔"

"میرین!" وہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی کہ ریان کو اس کی بات کاٹنا پڑی۔ "تم نے اپنی رپورٹس پڑھیں؟"

ایک لمحے کو وہاں خاموشی چھا گئی پھر دوسری جانب سے میرین کی آواز ابھری "ہاں پڑھ چکی ہوں۔"

"ڈاکٹر نے مجھے بھی وہ رپورٹس بھیجی ہیں۔"

"اوہ......اچھا......وہ......"

"میرین، میری بات سنو تم نے شینڈلر کو بتایا؟" وہ فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔

"ہاں وہ کہہ رہا تھا، وہ میرا اعلاج کرائے گا۔" اس کے الفاظ کے برعکس لہجے میں مایوسی تھی۔

"تم سچ کہہ رہی ہو؟" ریان کو پتا نہیں کیوں یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا میں بالکل ٹھیک ہوں، تم میری پروا مت کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔"

ریان بس ریسیو کو دیکھ کر رہ گیا۔ "تم بہت بہادر ہو میرین۔" وہ کہے بنا نہ رہ سکا۔

جواباً میرین زخمی انداز میں ہنسی تھی ''ہر مجبور انسان بہادر ہوتا ہے ریان......! لیکن میں اتنی بھی بہادر نہیں ہوں۔ اگر میں مر بھی گئی تو......تو پلیز! تم مجھے میری موت کے وقت اکیلا نہ چھوڑنا سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہی ہوتی ہے کہ انسان مرتے وقت تنہا ہو۔''

''ایسی باتیں مت کرو۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' اس نے تسلی دینا چاہی۔

''آہ آئی وش سو۔'' میرین نے ایک گہری سانس لی اور الوداعی کلمات کہہ کر فون رکھ دیا۔

فون بند ہونے کے کافی دیر بعد تک بھی وہ ریسیو ہاتھ میں پکڑے سن سا اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

☆☆☆

اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب ریان حیدر کی قسمت اور اس کے کیریئر نے ایک نیا موڑ کاٹا۔

بھارت کے خلاف ٹیسٹ میچ کا دوسرا دن تھا اور ریان پر الجھنوں اور مصیبتوں کے پہاڑ ایک ساتھ ٹوٹے تھے۔

عمان میں اس نامعلوم لڑکی کو دیکھنے کے بعد وہ اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ وہ کرکٹ ٹیم کے پیچھے ہر اس جگہ نہیں ہوتی جہاں وہ ہوتا ہے۔ وہ ریان کی فین ہے اور اس کے پیچھے آتی تھی، لیکن اگر واقعی یہی بات تھی تو وہ ہمیشہ اس کو نظر انداز کیوں کر دیتی تھی؟

ابھی عمان والا شاک پرانا نہیں ہوا تھا کہ ہوٹل تاج پیلس میں ریان نے اسے ایک دفعہ پھر دیکھا۔

شاید اسے نفیس اور قیمتی ملبوسات پہننے اوڑھنے کا شوق تھا، یا ماحول میں کیموفلاج ہو جانے کا ہنر آتا تھا۔ اس شام اس نے اپنے لمبے بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا اور زردوزی و مروڑی کے کام والی ہلکے رنگوں کے امتزاج کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ اس کے گلے میں نیکلیس دیکھ کر لگتا تھا وہ کسی پارٹی کے لیے تیار ہوئی ہے۔ وہ واقعی بے حد حسین لگ رہی تھی۔

اس لڑکی کو ایک دفعہ پھر دیکھنے کے بعد ریان نئے سرے سے الجھ گیا۔ اس سے پہلے وہ مزید الجھتا، ایک نئی مصیبت اس کے گلے پڑ گئی۔

ٹیم کا کپتان انجرڈ ہو کر واپس چلا گیا تھا اور عمران اکمل کو کپتان جبکہ ریان کو وائس کپتان بنا دیا گیا۔

وہ وائس کپتان ہی رہتا تو ٹھیک تھا مگر میچ سے عین ایک روز پہلے عمران نیٹ پریکٹس کے دوران کمر کے درد کا شکار ہو بیٹھا اور پہلے ٹیسٹ کے لیے ریان حیدر کو قائم مقام کیپٹن بنا دیا گیا۔

وہ شاید ستائیس برس کی عمر میں یہ ذمہ داری نبھانے کے لیے تیار نہ تھا، مگر کپتانی ہر کرکٹر کا شوق ہوتی ہے خواہش ہوتی ہے اس کی بھی تھی۔

بیٹنگ سائیڈ پر کپتان کا ایک فیصد کام دراصل کھیلنے کے لیے جانے والے بلے بازوں کی باری طے کرنا یا نائٹ واچ مین بھیجنا وغیرہ ہوتا ہے۔ صلاحیتوں اور اعصاب کا اصل امتحان فیلڈ میں ہوتا ہے۔

اسے پتا تھا اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے عمران خان کی تقلید کرتے ہوئے جارحانہ حکمت عملی اپنائی۔ کھانے کے وقفے کے بعد جب وہ کھیلنے کے لیے آئے تو رچن متود کر 42 پر کھیل رہا تھا۔ پہلا اوور کروانے کے لیے ریان نے

گیند ہاتھ میں لی، تو نومی اس کے پاس آیا۔
''ریان بھائی! میں شروع کر دیتا ہوں، آپ کو کٹ پڑ جائے گی ورنہ۔''
ریان بے اختیار ہنس دیا اور گیند اس کو تھما دی۔ نومی کو رجن نے ایک چھکا مارا اوور ختم ہوا تو ریان نے بجائے اسپنر کو دوسرے اینڈ سے لگانے کے، خود اگلا اوور کرایا۔
اور نعیم کے اگلے اوور میں وہ واقعہ ہوگیا جس کے متعلق کسی نے سوچا بھی نہ تھا، جس نے ریان کی قسمت بدل دی۔
نومی (نعیم) نے ایک تیز گیند کروا کر رجن کو کاٹ بی ہائنڈ کیا۔ اپیل خاصی جان دار قسم کی تھی۔ ایمپائر نے سوچنے کے بعد انگلی اٹھا دی مگر رجن جا کر ایمپائر سے احتجاج کرنے لگا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ گیند نے اس کے بلے کو نہیں چھوا تھا مگر ایمپائر نے اس کی بات رد کر کے رخ پھیر لیا۔ رجن اونچی آواز میں بڑبڑاتا ہوا فیلڈ سے نکل گیا۔
ریان اس وقت نومی سے گلے مل رہا تھا جب اس نے غیر مطمئن رجن کو واپس جاتے دیکھا۔ وہ چند ثانیہ اسے دیکھتا رہا، پھر جیسے اس نے فیصلہ کر لیا۔ کھیل تو کھیل ہوتا ہے اس میں وہ کسی کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ اسپورٹس مین اسپرٹ کو نبھاتے ہوئے ریان دوڑتا ہوا اس کے پیچھے گیا۔ رجن اس وقت سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔
''رجن!'' اس نے اسے پکارا۔ رجن نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔
''کم آن۔'' وہ اس کے قریب جا کر بولا۔ ''تم مطمئن نہیں ہو، تو ٹھیک ہے، واپس آجاؤ۔ ہم اپنی اپیل واپس لے لیتے ہیں۔''
رجن حیرت سے کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر اس کے ساتھ ہولیا۔
اس کو لے کر ریان جب واپس فیلڈ میں آیا تو یک دم سناٹا چھا گیا۔ آدھے اسٹیڈیم کو اس وقت معلوم ہوا تھا کہ مخالف کپتان چاہے تو آؤٹ ہوئے کھلاڑی کو واپس لا سکتا ہے۔ بہر حال رجن نے کھیلنا شروع کیا اور اگلی ہی گیند پر بالکل اسی طرح کاٹ بی ہائنڈ ہوا مگر اس بار رجن مطمئن و راضی ہو کر پویلین کی جانب لوٹ رہا تھا۔
پورا اسٹیڈیم تالیوں سے گونج رہا تھا اور سب جانتے تھے کہ یہ تالیاں رجن کے لیے نہیں بلکہ ایک حقیقی اسپورٹس مین ریان حیدر کے لیے تھیں۔

☆☆☆

کرکٹ میں ہمیشہ چڑھتے سورج کی پرستش کی جاتی ہے۔ حقیقی کپتان کا انجری سے واپس آنا انتہائی مشکل تھا اسی کے پیش نظر ریان کو اگلے دورہ بنگلہ دیش کے لیے بھی کپتان مقرر کر دیا گیا۔
وہ کپتان کیا بنا، لوگوں نے اسے دیوتا بنالیا۔ ہر جگہ وہ تھا اور صرف وہ تھا۔
جس روز وہ رجن کو واپس لے کر آیا تھا، اس شام میچ کے بعد رجن نے ریان سے اس اقدام کی وجہ دریافت کی تو اس نے محض اتنا کہا ''اگر میں ایسا نہ کرتا تو مجھے بہت اضطراب اور بے چینی ہوتی۔''
رات کو میڈیا سے گفتگو کرتے وقت رجن نے ریان کے لیے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا اور اپنی

طرف سے اس کو ریسٹ لیس رونی کا خطاب دیا۔ یوں جس طرح ''زیڈ'' (ظہیر عباس) ایشین بریڈ مین، سچن ٹنڈولکر لٹل ماسٹر یا راہول ڈریوڈ ''دی وال'' بن گئے تھے اسی طرح وہ بھی ریسٹ لیس رونی بن گیا۔

اس کا کیرئیر ایک اہم موڑ پر تھا۔ کپتان بننے کے بعد اسے اشتہار ملنے لگے تھے بلکہ فلموں کی آفر بھی ہوئی تھی۔ اشتہارات تو وہ کر لیتا تھا مگر فلمیں یہ کہہ کر کہ ''میرے ڈیڈ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔'' رد کر دیتا اسپانسرز تو خیر پہلے بھی تھے مگر اب وہ رقم زیادہ دیتے تھے۔

کچھ کپتان صرف کپتان ہوتے ہیں اور کچھ کپتان طاقت ور کپتان ہوتے ہیں ریان کا تعلق دوسری کیٹیگری سے تھا۔

ایک دفعہ ایک ڈرا ہوتے، ٹیسٹ میچ کے آخری دن، آخری سیشن کے کھیل میں اس نے اپنے اسپنر جسے باؤ کہا جاتا تھا کو باؤلنگ اٹیک سے ہٹا کر باؤنڈری پر بھیج دیا تاکہ اس کی انرجی ضائع نہ ہو۔ باؤلر کو ریان کا یہ رویہ پسند نہ آیا مگر وہ خاموش ہو گیا۔

ایک دوسرے میڈیم پیسر کی گیند پر جب بلے باز نے سوئپ شارٹ کھیلی تو گیند سیدھی باؤلر کے پاس آئی جسے اس نے غصے کے اظہار کے طور پر باؤنڈری لائن تک جانے دیا۔ ریان جو کہ سلپ میں کھڑا تھا اوور ختم ہوتے ہی اس کے قریب آیا اور اس سے کہا کہ فی الحال وہ اندر جا کر آرام کر لے اور کسی اور کو بھیج دے باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ ریان نے یہ کہہ کر واپس اپنی فیلڈ پوزیشن سنبھال لی اور باؤ بھی اندر چلا گیا۔

شام کو جب ٹیم ڈریسنگ روم میں جمع ہوئی تو ریان کے خلاف باؤ نے محاذ بنا لیا تھا۔

''یا میں رہوں گا یا ریان بھائی۔'' اس کا مطالبہ تھا کہ ہم میں سے کوئی ایک واپس جائے۔ ریان اور بقیہ ٹیم مینجمنٹ نے اسے سمجھانے کی بہتری کوشش کی مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی۔

مقابلہ سخت تھا کیونکہ اگر ریان کپتان تھا تو وہ وائس کپتان مگر سلیکٹرز اور مینجمنٹ نے باؤ کو واپس بھیج دیا۔

یہ ایک عام سا واقعہ تھا کوئی اتنی خاص بات نہ تھی مگر اگلے کئی دنوں تک اخبارات نے ریان کے خلاف خوب پروپیگنڈا کیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ایک دم تمام اخبارات، جو اس کو کچھ عرصہ پہلے تک تاریخ کا بہترین کپتان ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے ایک دم اس کے خلاف کیوں ہو گئے تھے۔

☆☆☆

ریان خود ایک بہترین اسپورٹس مین تھا اور چاہتا تھا کہ دوسرے بھی ویسے ہی اچھے بن جائیں۔ اس کا خیال تھا اپنے اچھے رویے کے باعث اس نے اپنے مخالفین کے رویے کو کم از کم اپنے لیے تو بدل ہی دیا ہے مگر اس واقعہ کے بعد یہ خیال محض خام خیالی ثابت ہوا۔

پاکستان ٹیم کو جیتنے کے لیے 30 رنز درکار تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح اپنی ٹیم کو ساتھ لے کر چل رہا تھا یعنی نو کھلاڑی پویلین کی جانب شکستہ دل ہو کر لوٹ چکے تھے۔ میچ ففٹی ففٹی جا رہا تھا کیونکہ انڈین ٹیم کو جیتنے کے لیے محض ایک وکٹ کی ضرورت تھی اور ریان ہر اوور کے اختتام پر رن لے کر اگلے اوور کی اسٹرائیک بھی لے لیتا تھا۔ جس کے

باعث مخالفین سخت دباؤ کا شکار تھے۔

اسی طرح، ایک اوور کے اختتام پر اس نے گیند کو مڈ وکٹ کی جانب کھیلا اور رن لینے کے لیے بھاگا۔ فیلڈر نے گیند اٹھا کر زور سے ماری، گیند ریان کو بازو پر لگی اور وہ اس اچانک افتادہ پر نیچے گر گیا۔ دوسرے فیلڈر نے جلدی سے گیند اٹھا کر وکٹ توڑ دی اور اپیل کر دی جس پر ایمپائر نے انگلی اٹھا دی۔

کرکٹ کے قوانین کے تحت وہ آؤٹ تھا مگر اسپورٹس مین اسپرٹ کا پاس رکھتے ہوئے انڈین فیلڈرز کو اپیل نہیں کرنی چاہیے تھی۔ انڈین کھلاڑی کو پویلین سے واپس لانے کا واقعہ ابھی پرانا نہیں ہوا تھا مگر وہ بھارتی ہی کیا جن میں انسانیت ہو۔

میچ کے اختتام پر تقریب میں جب خوب صورت بالوں اور مہذب لہجے والے محب وطن پاکستانی کمنٹیٹر نے ریان سے اس شکست پر تبصرہ کرنے کو کہا تو اس نے صرف ایک بات کہی۔

''انڈیا نے میچ تو جیت لیا مگر کرکٹ ہار دی۔'' اور کتنی ہی دیر اسٹیڈیم تالیوں سے گونجتا رہا۔

☆☆☆

چیمپنز ٹرافی اس دفعہ پاکستان میں منعقد ہونا تھی اور ریان نے اپنے ملک کی قیادت کرنا تھی۔

چیمپنز ٹرافی کو منی ورلڈ کپ بھی کہا جاتا ہے۔ ریان نے اپنی زندگی میں محض ایک ورلڈ کپ کھیلا تھا، جس کے سیمی فائنل میں ٹیم بری طرح ہاری تھی، اسے اس میچ کے بعد والی صورت حال ابھی تک یاد تھی۔

تھکی ہاری ٹوٹی ہوئی ٹیم جب اسٹیڈیم سے نکل کر پویلین کی جانب بڑھ رہی تھی تو اسے کراؤڈ میں سے ایک کٹیلا فقر سنائی دیا۔

''بک گئے۔''

اس بات پر اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ معلوم نہیں ہر جیت پر ہماری ٹیم کو دیوتا اور ہر شکست پر سٹہ باز کیوں بنا دیا جاتا ہے؟

دراصل ہماری قوم شکست کو برداشت تو کر لیتی ہے مگر قبول نہیں کرتی۔ قوم میں شکست قبول کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہے۔

اس صورت حال پر اسے غصہ بھی آتا اور صدمہ بھی ہوتا۔

مگر اس جملے کو وہ بھول گیا کیونکہ وہ کہنے والے شخص سے دو قطاریں اوپر دو لڑکیاں بری طرح رو رہی تھیں۔ وہ یوں بلک رہی تھیں جیسے ان کا کوئی عزیز رشتہ دار مر گیا ہو۔

ہوٹل واپس جاتے ہوئے ریان کی نگاہوں کے سامنے سے لڑکیوں کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے نہ ہٹ سکے تھے۔ وہ لڑکیاں اسے آج بھی یاد تھیں۔ وہ زندگی میں (بڑا ہو کر) کبھی نہیں رویا تھا مگر اس واقعہ کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں نمی آنے لگتی تھی جسے وہ فوراً اپنے اندر اتار لیتا ہوں۔ سکول کے زمانے میں جب میرین چھوٹی چھوٹی باتوں پر روتی تھی تو کہتا تھا۔

''تم اتنا روتی ہو۔ دیکھنا میں کبھی نہیں روؤں گا۔ تم کبھی میری آنکھوں سے آنسو گرتے نہیں دیکھو گی۔''

چیمپنز ٹرافی میں ابھی دو ماہ تھے۔ اسے یاد آیا پچھلی چیمپنز ٹرافی کے دو ہفتوں بعد ہی اسے کپتان بنا دیا گیا تھا۔ یعنی اب اس کو کپتان بنے بھی دو سال ہونے کو آئے تھے۔

اسے لگتا تھا یہ ابھی کل ہی کی بات ہے جب اسے کپتانی ملی تھی، اور آج وہ جب اپنے کیریئر کے عروج پر تھا اپنا تین سالہ ڈومیسٹک کیریئر اور سات سالہ انٹرنیشنل کیریئر ایک سہانا خواب سا لگتا تھا۔

وہ مکمل فارم میں تھا، اس کا ردھم برقرار تھا، فیلڈنگ اس کی ہمیشہ سے بہترین رہی تھی۔

وہ عروج تھا، اور وہ عروج کی انتہا تھی۔

اس سے آگے زوال تھا اور پاتال کی پستی تھی۔

گراف کی سوئی اب اوپر نہیں بڑھ رہی تھی، اب وہ نیچے آنے والی تھی۔

☆☆☆

وہ بس سے سفر نہیں کرتا تھا، مگر سیالکوٹ میں ایک فیسٹول میچ کھیلنے بس سے جانا پڑا۔ البتہ واپسی کا سفر اس کی زندگی کا بدترین سفر ثابت ہوا تھا۔

وہ بس میں سوار افراد کی حرکات و سکنات کا نوٹس لینے کے بجائے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کی ساتھ والی نشست پر ایک لڑکی بیٹھی ہے جس کی شکل دیکھنے کی زحمت بھی اس نے نہیں کی تھی۔

لاہور پہنچنے میں ابھی کم و بیش گھنٹہ ہی رہ گیا تھا جب اس لڑکی نے اسے مخاطب کیا۔ ''آپ کو میں نے کہیں دیکھا ہوا ہے کیا؟''

''معلوم نہیں۔'' اس نے شانے اچکا اور اپنی ہم سفر کو دیکھا۔

''آپ کہیں ریان حیدر تو نہیں؟'' وہ اچانک یاد آ جانے پر جوش سے بولی۔

''نہیں۔'' سرد مہری سے کہہ کر اس نے دوبارہ اپنی نگاہیں بھاگتے مناظر پر جما دیں۔ اسٹارڈم کا اپنا مزہ ہے اپنا نشہ ہے مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گرد فینز کا جمگھٹا لگ جائے۔

''اچھا! میں سمجھی تھی کہ......'' کچھ کہتے کہتے وہ رک گئی۔

بس ایک ہوٹل کے آگے رکی تو سواریاں کچھ کھانے پینے کے لیے اترنے لگیں۔

''چلیں کچھ کھا لیتے ہیں۔'' وہ لڑکی یہ کہہ کر سیٹ سے اٹھی دروازے کے قریب پہنچنے ہی والی تھی کہ رک کر مڑی اور سوالیہ نگاہوں سے ریان کا چہرہ دیکھا۔

''میں......'' وہ احتجاج کرنے ہی لگا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی تقلید کرتا ہوا باہر آ گیا۔

وہ ایک عام اور کھٹارا بس تھی اور مسافر بھی لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ ریان وہ واحد شخص تھا جو اپنے حلیے اور چہرے مہرے سے خاصا سلجھا ہوا اور مہذب لگ رہا تھا۔

وہ دوسری مسافر تھی جو بہت امیر نہیں تو بہت غریب بھی نہیں دکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک سادگی اور

بھولپن تھا، جس سے ریان دھوکہ کھا گیا تھا۔

وہ دونوں چائے کا آرڈر دے کر اپنی جگہ پر بیٹھے چائے کا انتظار کر ہی رہے تھے کہ وہ بولی۔

''کیا کرتے ہیں آپ؟''

''آرٹسٹ ہوں۔''

''یعنی بے وقوف ہیں۔'' وہ اپنے پرس سے بالیاں نکالتے ہوئے ہنسی۔

''نہیں تو!'' وہ فوراً مدافعانہ انداز میں بولا۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ وہ اپنا کپ اٹھانے ہی لگا تھا کہ اس لڑکی نے کان میں بالی ڈالتے ڈالتے نیچے گرا دی۔ ریان فوراً نیچے جھکا اور مٹی میں سے چمکتی ہوئی بالی تلاش کر کے اس کو تھما دی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور چائے پینے لگی۔

ریان کو چائے کچھ کڑوی لگی اس نے مزید شکر منگوا کر اسے مزید میٹھا کیا اور غٹا غٹ پورا کپ پی گیا۔

چائے ختم ہونے کے بعد وہ دونوں اٹھے اور بس میں سوار ہو گئے۔

''مگر مجھے ابھی بھی لگتا ہے کہ آپ کرکٹر ریان حیدر ہیں۔'' ریان نے جواب دینے کے بجائے مسکرا کر انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ بس ایک دفعہ پھر اپنی منزل کی جانب گامزن تھی۔

اس لڑکی نے دو ایک بار اس کو مخاطب کر کے گفتگو شروع کرنے کی کوشش کی مگر اس کی جانب سے کوئی خاطر خواہ رسپانس نہ ملنے پر وہ خود ہی خاموش ہو گئی۔

بس لاہور کی حدود میں داخل ہو رہی تھی، ریان کا سر چکرانے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کنپٹیوں کو سہلایا اور سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اور بہت گہرا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا، کیسے اور کیوں ہوا؟ ریان کو ہوش نہ رہا تھا۔

☆☆☆

ریان نے اپنے بھاری پپوٹے کھولنے کی کوشش کی، سر اتنا بوجھل ہو رہا تھا کہ اسے لگا وہ آنکھیں نہیں کھول سکے گا۔ مگر مشکل سے اس نے دونوں پلکوں کو ایک دوجے سے جدا کر کے دیکھا۔

وہ ایک اجنبی کمرے میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی تھی، جو اس پر کچھ پڑھ کر پھونکنے کے ساتھ ساتھ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کا ماتھا بھی چوم لیتی تھی۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھنے کی سعی کی۔

''کیسی طبیعت ہے ریان؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔ اس کا دماغ آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ کھوئے ہوئے حواس مجتمع ہو رہے تھے۔ اس نے پوری آنکھیں کھولنا چاہیں مگر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پلکوں پر کوئی بوجھ سا آن پڑا ہو۔

''ریان؟'' اس نے دوبارہ اسے پکارا تھا۔

ریان نے بولنے کی کوشش کی مگر حلق سے آواز نکلنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ اس نے دایاں ہاتھ بمشکل اٹھا کر اپنے سرہانے بیٹھی انیہ کے گھٹنے پر رکھ کر گویا تسلی دی۔

''منہ سے بولو نا'' انیہ اسے بلوانے پر مصر تھی۔ اسکی انگلیاں مسلسل اس کے بالوں کو سہلا رہی تھیں۔

''نھ.....ٹھیک ہوں۔'' وہ نقاہت سے بولا۔''میں کہاں ہوں؟''

''ہاسپٹل میں۔''

''کیوں؟''اب وہ پہلے سے بہتر بول رہا تھا۔

''تم پچھلے چار دنوں سے بے ہوش ہو۔تمہیں کیا ہوا تھا؟''اس کے ماتھے پر آئے بال نرمی سے ہٹاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''مجھے؟''ریان نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی۔''میں بس میں سو گیا تھا۔''

''مگر پٹرول پارٹی کو تم لاہور کی ایک غیر معروف شاہراہ پر بے ہوش پڑے ملے تھے۔تمہارا والٹ،موبائل، گھڑی،کریڈٹ کارڈ،سب کچھ غائب تھا۔مجھے آرام سے بتاؤ کیا ہوا تھا؟''

انیہ کی بات پر ریان کے ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔ایک دم ہی اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔اسے یاد آیا اس نے ایک جگہ رک کر چائے پی تھی اور اس سے پہلے وہ لڑکی کی بالی اٹھانے کو نیچے جھکا تھا..... چائے اسے کڑوی لگی تھی۔ دھیرے دھیرے اس نے تمام تفصیلات انیہ کے گوش گزار کر دیں۔

''بچپن سے بتایا جاتا ہے کہ دوران سفر کسی سے لے کر کچھ نہیں کھاتے مگر تم اتنے بڑے ہو کر.....خیر چھوڑو۔''اپنے بھائی کی بے وقوفی پر غصہ تو اسے بہت آیا تھا مگر اس کی حالت کے پیش نظر وہ ضبط کر گئی۔

ریان نے ایک دفعہ پھر آنکھیں موند لیں۔گزرے حالات ایک فلم کی طرح اس کے دماغ کے پردوں پر چلنے لگے تھے۔

''معلوم نہیں میں اتنا بے وقوف کیسے بن گیا کہ.....''فقرہ ادھورا چھوڑ کر اس نے آنکھیں کھولیں اور انیہ کا اجلا چہرہ دیکھا۔

انیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ریان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔''آتی ہوں،ذرا ڈاکٹر کو لے کر۔''اس نے مسکرا کر بتایا اور باہر نکل گئی۔

اس کے دروازہ بھیڑ کر جانے پر ریان کمرے میں تنہا رہ گیا۔اس نے آنکھیں بند کر لیں اور نیند کا غلبہ اس پر طاری ہونے لگا۔

اور اس روز اس نے پہلی بار وہ خواب دیکھا،جس نے اس کی پوری زندگی کو بانٹ کیے رکھا۔

اس نے دیکھا،ایک سرمائی قطعہ اراضی ہے جس پر دراڑیں پڑی ہیں زمین پر کوئی تھوڑی گھٹنوں سے ٹکائے بیٹھا ہے۔اس کے سامنے ایک شخص کدال لے کر سخت زمین کو کھود رہا ہے جیسے کوئی قبر کھودتا ہے۔زمین پر بیٹھا وجود ہولے ہولے سسکیاں لے رہا ہے اور ان سسکیوں سے ریان کو اندازہ ہوا کہ وہ کوئی لڑکی ہے۔جیسے جیسے وہ مرد قبر کھودتا جاتا ہے وہ پہلے سے اونچی آواز میں رونے لگتی ہے۔جب وہ کھدائی کا کام مکمل کر لیتا ہے تو وہ یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔نیم تاریکی میں بھی ریان کو اس کا لباس بغیر کسی دقت کے دکھائی دے رہا تھا اس نے اسکن کلر کے شفون جارجٹ کا لباس پہن رکھا تھا اور بیل باٹم آستینوں کے آخر اور نیک لائن پر اسی رنگ کے ستارے لگے تھے۔

اس کے پاؤں میں جوتی تھی نہ جسم پر دوپٹہ......اور وہ مسلسل رو رہی تھی۔

''ریان سو گئے؟'' انیہ کی آواز نے اسے جگا دیا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ کیا دیکھ رہا تھا؟ خواب ڈراؤنا نہ ہونے کے باوجود خوفناک ضرور تھا۔ اس کی اپنی ہتھیلیاں اور پیشانی نم آلود ہو گئیں۔

ڈاکٹر اس کو چیک کرنے لگا اور ساتھ ساتھ انیہ کو مسلسل ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔ اس کو ابھی کل رات تک ایڈمٹ رہنا تھا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد ریان نے انیہ سے پوچھا ''گھر بتایا ہے؟''

''جب تمہیں ہسپتال لے کر آئے تھے تو سب سے پہلے انہوں نے گھر ہی فون کیا تھا۔'' وہ رسان سے بتانے لگی۔

''میرا والٹ تو انہوں نے چھین لیا، پھر گھر کا نمبر انہیں کیسے معلوم ہوا؟'' وہ حیران سا ہو کر پوچھنے لگا۔

''اوہ، تم ایک سیلیبرٹی ہو، اسٹار ہو۔ جب تمہاری فینز کا آئے دن گھر پر تانتا بندھا رہتا ہے وہ تو پھر پولیس والے تھے۔''

''میری فینز؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں ہر دوسرے دن میں تمہاری کسی فین کو بے عزت کر کے یا سمجھا بجھا کر گھر واپس بھیج رہی ہوتی ہوں۔ کئی ایک تو تم سے شادی کرنے آئی ہوتی ہیں۔'' انیہ نے مزے لے کر بتایا۔

''اچھا پھر گھر میں سے کوئی نہیں آیا؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔ اتنا تو اسے اندازہ تھا کہ وہ لاہور میں ہے۔

''مما آئی تھیں، دو دن رہی تھیں تمہارے پاس آج صبح گئی ہیں۔ دراصل وہ زاہد انکل ہیں نا جو نیوجرسی میں ہوتے ہیں ان کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا ہے۔ مما کو فوراً جانا پڑا۔''

''اور ڈیڈ؟''

''وہ بھی صبح ہی گئے ہیں، مما کے ساتھ۔'' انیہ نے لاپروائی سے بتایا۔

''اور باقی سب؟'' وہ مایوسی چھپاتے ہوئے بولا۔

''علی آیا تھا، مگر پہلے دن ہی چلا گیا تھا، کیونکہ ڈیڈ کے پیچھے آفس اس نے سنبھالنا ہے۔ باقی ہیثم اور بیا کا اسکول کالج۔''

''بس تم ہی فارغ تھیں'' نہ چاہتے ہوئے بھی ریان کے لہجے میں طنز در آیا تھا۔

''اب یہ علی سے مت کہنا۔ وہ پہلے ہی مجھے فارغ اور نکمی کہتا ہے تمہارے بتانے پر اسے یقین آ جائے گا۔'' انیہ نے بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔

اس کا دماغ اس خواب نے پہلے ہی الجھا دیا تھا، اب یہ الگ ڈپریشن اس کا دل اتنا برا ہوا کہ اس نے انیہ سے کہا۔

''انیہ! مجھے تنہا چھوڑ دو!'' انیہ نے حیرت بھری آنکھوں سے اسے دیکھا، بات سے زیادہ اس کا بات کرنے درشت انداز انیہ کو حیرت زدہ کر گیا۔

''ریان تم.....'' اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ریان نے اس کا جملہ کاٹ دیا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کوئی خاص چوٹیں نہیں آئیں مجھے، جاؤ یہاں سے اور بے شک کراچی چلی جاؤ میری طرف سے، نہیں ضرورت مجھے تمہاری، مرنہیں جاؤں گا عیادتوں خدمتوں اور ہمدردیوں کے بغیر۔ جاؤ یہاں سے گیٹ لاسٹ''
بات کا آغاز دھیمے لہجے میں کر کے پھر وہ غصے اور ڈپریشن سے چیخنے لگا تو انیہ گھبرا کر اٹھی اور دور ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

''جاؤ!'' وہ غرایا۔

انیہ کچھ دیر تو حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی، پھر دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

ریان اٹھ کر بیٹھ گیا اور غصے سے ڈرپ کا کنولا اپنے ہاتھ سے نکالنا چاہا مگر یہ جان کر کہ یہ انتہائی تکلیف دہ کام ہوگا اس نے کوشش ترک کر دی۔ کنولا چونکہ اٹھارہ بیس گھنٹے پرانا ہو چکا تھا اسی لیے درد کر رہا تھا۔ مگر ریان کے سینے میں اٹھنے والی ٹیسیں اس سے بھی زیادہ شدید تھیں۔

اسے باپ سے زیادہ ماں پر غصہ تھا۔

نجانے وہ کون سی افسانوی مائیں ہوتی ہیں جو اولاد کے لیے پوری رات جاگتی ہیں۔ میری ماں نے تو کبھی میرے لیے ایک بھی رات آنکھوں میں نہیں کاٹی ہوگی۔ میری ماں نے تو مجھے دیورانی کی جھولی میں ڈال دیا تھا، میری ماں نے تو مجھے اپنے دودھ سے بھی محروم رکھا۔ میری ماں، میری ماں، میری ماں۔

ان دو لفظوں کی ایک تکرار اس کے ذہن میں مسلسل ہو رہی تھی۔ اپنی ماں سے اس کو کئی شکایتیں تھیں۔ وہ دو سال کی عمر میں ان کی گود میں یوں آیا تھا جیسے وہ کوئی لے پالک بچہ ہو۔ دو سال تک اسے انیہ کی امی نے دودھ پلایا تھا پالا پوسا تھا اس کو لگتا تھا علی، بیا اور بیشم کو شروع کے وہ دو سال ملے تھے تو ان کو ماں کی ''زیادہ'' محبت ملی تھی۔ اس کے اور اس کی ماں کے درمیان یہ دو برس حائل تھے یا پھر وہ ایسا سمجھتا تھا۔ یہ اس کی چچی تھیں جنہوں نے اس کو پہلی بار لفظ ''ماں'' سے روشناس کرایا تھا اور اس کی کتنی خواہش تھی کہ وہ دن لوٹ آئیں اس کی ماں اسے دوبارہ سے بولنا سکھائیں تو وہ وعدہ کرے گا کہ اتنا زیادہ بولنا چھوڑ دے گا۔

مگر یہ کیسی ماں ہیں؟ جن کو اپنے ہسپتال میں پڑے بیٹے کا کوئی خیال نہیں ہے لیکن سمندر پار شوہر کے دوست کے بیٹے کی موت کا ملال و صدمہ بہت ہے۔

وہ بنیادی طور پر ایک بے تکلف مزاج رکھتا تھا ہر طرح کا مذاق کرتا تھا، اسے یوں لگتا تھا کہ مما اپنی محبت کا اظہار علی سے کرتی ہیں مگر اس سے نہیں۔

اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ علی سے ضرور جیلیس ہوتا مگر وہ ریان تھا۔

اسے کبھی بھی علی سے جلن محسوس نہ ہوتی وجہ اس کی اور علی کی بہترین دوستی تھی جو بچپن سے اب تک چلی آ رہی تھی۔

مگر آج تو اس کو علی بھی دیکھنے نہیں آیا تھا۔ محض چند گھنٹے ٹھہر کر واپس بزنس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے

لوٹ گیا۔

اس رات، جو اس نے ہسپتال میں کاٹی، اس نے مما کو جتنا مس کیا وہ بیان سے باہر تھا۔ اس کا جی چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے مگر وہ ضبط کر گیا۔

اس نے بہت پہلے خود سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی نہیں روئے گا کبھی اپنے آنسو دنیا کو نہیں دکھائے گا۔

اگر ریان عظیم حیدر کو معلوم ہوتا کہ اس کی قسمت میں تقدیر نے آنسو اور بے تحاشا آنسو لکھے ہیں تو وہ کبھی خود سے یہ وعدہ نہ کرتا۔

☆☆☆

مسلسل جھک کر کام کرنے سے اس کی گردن اکڑ سی گئی تھی۔ اس نے سر کو کئی بار دائیں بائیں جانب گھما کر گردن کو واپس نارمل حالت میں لانے کی کوشش کی اور جب قدرے افاقہ ہوا تو سر میز پر رکھ دیا۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔

''ارے آپ سو گئیں؟'' اس کو اس پوزیشن میں بیٹھے دیکھ کر دروازہ کھول اندر داخل ہوتی رعنا ٹھٹکی۔

امل نے چونک کر سر اٹھایا اور اسے دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''نہیں تو آؤ بیٹھو۔'' وہ استقبال کے طور پر اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تھک گئیں؟'' کاندھے سے بیگ اتار کر میز پر رکھتے ہوئے رعنا نے کچھ ہمدردی سے پوچھا۔

''ارے نہیں۔'' وہ بے دلی سے ہنسی۔ ''بس ایسے ہی اور تم سناؤ کیسے آنا ہوا؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''بس ایسے ہی آ گئی۔'' دراصل یہاں سے گزر رہی تھی سوچا آپ سے مل لوں۔ اس منتھ جو آپ کے ڈیزائنز ہمارے میگزین میں چھپے تھے، مائی گاڈ! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں ان کی تعریف کرنے کو، فیشن سیکشن سے تعلق نہ ہونے کے باوجود بھی میں آپ کو بتا سکتی ہوں کہ وہ...... وہ انتہائی زبردست تھے۔'' رعنا کے لہجے سے واقعی لگ رہا تھا کہ وہ اپنے خیال کو الفاظ کا روپ دینے میں ناکام ہو رہی تھی۔

''تمہیں چاہیے تو تم کوئی پسند کر لو۔ تمہیں اسپیشل ڈسکاؤنٹ پر مل جائیں گے۔'' امل نے فراخ دلی سے پیشکش کی۔

''او تھینک یو۔'' وہ حیران اور خوش سی ہو کر شکریہ ادا کرنے لگی۔

''اور جرنلسٹ صاحبہ، کیا خبریں وبریں ہیں آپ کے پاس؟'' وہ خوش دلی سے پوچھنے لگی۔

''کوئی خاص نہیں بس اسٹریٹ کرائمز بڑھتے جا رہے ہیں۔'' وہ بتانے لگی۔ ''ابھی کل ہی ہمارے کپتان صاحب کو کسی نے کچھ کھلا کر لوٹ لیا اور ان کے بے ہوش وجود کو سڑک پر پھینک دیا۔''

امل نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''ریان حیدر کو؟'' وہ آنکھیں پوری کھولے پوچھ رہی تھی۔

''جی۔'' رعنا عام سے انداز میں تفصیلات بتانے لگی۔

''ویری گڈ'' امل نے دل ہی دل میں قدرت کی مدد کو سراہا۔ ''ویری گڈ یہی وہ چیز تھی جو مجھے چاہیے تھی۔ کیسا اتفاق ہے کہ یہ موقع ریان کے عروج کے دور میں ہی آیا ہے۔

جس وقت اس نے مجھے بے عزت کیا تھا وہ بلندی پر تھا اور میں پستی میں۔ اب ہم دونوں اوپر ہیں اور اب مجھے اس کو نیچے گرانا ہے۔ جیسے اس نے کبھی مجھے بے عزت کیا تھا۔ اب اسی طرح ذلت اس کا مقدر بنے گی۔

اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے ایک بے حد ملنسار اور حلیم طبع خاتون کے گھر میں جگہ مل گئی تھی۔ وہ دولت اور خوب صورتی جو اسے بہت اچھی لگا کرتی تھی اب گھر کی لونڈی تھی۔

عفت بیگم کو اس نے یہ یقین دلایا تھا کہ اسے کرکٹ سے بے انتہا لگاؤ ہے اور چونکہ وہ اس سے بے حد محبت کرنے لگی تھیں اسی لیے اسے ہمیشہ پاکستان ٹیم کے کھیلے جانے والے ٹورنامنٹس میں لے جایا کرتیں، چاہے وہ اندرون ملک ہوتے یا بیرون ملک اور اس سے اس کا ایک مقصد تو پورا ہو ہی گیا تھا کہ ریان حیدر اسے نوٹ کرنے لگا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے عمان میں جب اس نے ریان کو دیکھا تو اسے اس کرکٹر کی آنکھوں میں شناسائی کی واضح جھلک دکھائی دی تھی۔ جس سے وہ کم از کم اتنا تو جان ہی گئی تھی کہ وہ اسے پہچانتا ہے البتہ عمان میں اس سے ملاقات قطعاً اتفاقیہ تھی۔

وہ اور عفت بیگم ایک فیشن فیسٹیول میں شرکت کرنے وہاں آئے تھے جہاں دنیائے عرب کے نامور اور ممتاز فیشن ڈیزائنرز تشریف لا رہے تھے۔ اس کے تو خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ ریان سے وہاں سامنا ہوگا وہ تو خود اس کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔

اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد وہ عفت بیگم کے ہمراہ بوتیک پر ہی کام کرتی تھی اور رعنا سے اس کی دوستی وہیں ہوئی تھی۔ رعنا ایک صحافی تھی اور اس سے یہ نئی خبر سننے کے بعد امل کو پہلی بار دنیائے صحافت سے تعلق رکھنے والوں کی دوستی کی اہمیت کا اندازہ ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب اسے اگلا قدم کیا اٹھانا ہے۔

☆☆☆

''آئی ایم ریئلی سوری انیہ۔'' وہ معافی مانگنے کے لیے الفاظ کا انتخاب کر ہی رہا تھا جب انیہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''اٹس او کے ریان! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم زیادہ نہ بولو میں تمہارے لیے ناشتے کا انتظام کرتی ہوں۔''

اسے ہسپتال سے گھر منتقل ہوئے تیسرا روز تھا۔

اس کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ ڈاکٹرز نے دو تین دن تک مکمل بیڈ ریسٹ کا کہہ کر پرہیزی کھانا بتایا تھا اور ریان نے سوچا تھا، گھر جاتے ہی وہ سب سے پہلے ان ہی دونوں احکامات کی خلاف ورزی کرے گا۔ وہ کوئی اتنا زیادہ بیمار نہ تھا، محض تارکول کی سڑک پر بس سے پھینکے جانے پر چوٹیں اور زخم آئے تھے ورنہ وہ آرام سے چل پھر سکتا تھا۔

وہ سوچوں میں گم تھا کہ انیہ ٹرے میں ناشتہ اور اخبار لے کر آ گئی۔ اس کو دیکھ کر اس نے کمبل ایک طرف ڈال دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انیہ ناشتہ میز پر لگانے لگی۔

''نئی خبر پتا ہے تمہیں؟'' وہ پلیٹیں سیٹ کرتے ہوئے بولی۔

''کیا؟''

''شینڈلر آ ئر کا ٹرانسفر ادھر ہو گیا ہے۔ وہ دو ہفتے بعد آ جائے گا۔''

''اور میرین؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''وہ بھی ساتھ آئے گی ظاہر ہے۔''

''ویسے مجھے پتا تھا۔''

''اچھا!'' وہ ٹوسٹ پر جیم لگاتے ہوئے اخبار پر بھی نگاہیں دوڑاتی جا رہی تھیں یکدم اس کی حرکت کرتی انگلیاں رک گئیں اور وہ حیرت سے اخبار کو دیکھنے لگی۔

''اوہ''

''کیا لکھا ہے؟'' اس نے عام سے انداز میں پوچھا۔

انیہ نے سر اٹھا کر اسے کچھ متذبذب سی ہو کر دیکھا پھر اخبار ایک طرف رکھ کر چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی ''کچھ بھی نہیں چھوڑو ناشتہ کرو۔'' مگر ریان کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ اس نے خود جھپٹ کر، انیہ کے منع کرنے کے باوجود اخبار اٹھالیا اور دیکھنے لگا۔ سرخی لگی تھی۔

''پٹرول پولیس نے نشے میں دھت ریان حیدر کو ہسپتال پہنچایا۔''

''کثرت شراب نوشی کے باعث پاکستان کرکٹ ٹیم کے کپتان سڑک پر گر کر بے ہوش ہو گئے۔''

چند ثانیے تو وہ بے یقینی سے شہ سرخیوں کو دیکھتا رہا پھر غصے سے اخبار مروڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ طیش کے عالم میں اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے انگلیوں سے اپنی کنپٹیاں سہلاتے ہوئے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی مگر پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

''یہ کیوں یہ بکواس چھاپ رہے ہیں؟'' اس نے غصے اور صدمے سے انیہ سے پوچھا۔

''معلوم نہیں؟'' انیہ نے شانے اچکائے۔ ''مگر تم پروا نہ کرو۔ کارواں گزر جاتے ہیں کتے بھونکتے رہ جاتے ہیں، کتوں کو بھونکنے دو۔''

''مگر کیوں؟ کیا کیا ہے میں نے جو یہ....'' اس کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے، کن الفاظ میں اپنے اندر کا لاوا باہر نکالے۔

''تم پروا مت کرو۔ یہ لوگ جلتے ہیں۔ کسی اور کو کامیاب نہیں دیکھ سکتے۔''

''لیکن میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے جو یہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں؟''

''جانے دو۔''

''یہ ان فیئر ہے، قطعاً غلط بات ہے۔ میں دیکھ لوں گا اس نیوز پیپر کے ایڈیٹر کو۔'' مٹھیاں بھینچتے ہوئے وہ اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

''ریان! پلیز خود کو کنٹرول کرو۔ مت دل برا کرو۔ یہ لوگ ایسے ہی جیلس ہوتے ہیں۔ ان کی باتوں پر دھیان دینے کے بجائے اپنی پرفارمنس پر توجہ دو۔ ان دو ٹکے کے لوگوں کو جو بکنا ہے، بکنے دو۔ یہ ایسے ہی اپنی دشمنیاں

نکالتے ہیں۔'' انیہ نے اسے حتی المقدر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''مگر میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔'' وہ جھلا کر بولا تو انیہ بری طرح چونکی۔

''ایک منٹ ٹھہرو!'' وہ مدھم آواز میں خودکلامی کے انداز سے بولی'' کہیں تمہاری کسی سے کوئی دشمنی تو نہیں۔''

''نہیں تو۔'' ریان نے کہہ تو دیا مگر انیہ کی جانب دیکھتے ہوئے اسے جو جھٹکا لگا وہ آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے مشکوک نگاہوں سے اسے تک رہی تھی۔

''میری واقعی کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔'' اس نے جلدی سے اپنی بات دہرائی مگر انیہ اسے مسلسل اسی طرح دیکھتی رہی۔

''کبھی کسی صحافی کو ڈانٹا تو نہیں، جھاڑ وغیرہ تو نہیں پلا دی؟'' وہ تفتیشی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔''

''اس پیپر کے خلاف تو کوئی بات نہیں کر دی؟''

''نہیں۔''

''پھر کیوں وہ تمہارے خلاف لکھ رہے ہیں؟ یہ اخبار جس ادارے کا ہے ان کی کئی نیوز پیپرز، فیشن اسپورٹس، اور ککنگ میگزینز ہیں ان کو ضرورت کیا ہے تمہارے خلاف پروپیگنڈا کرنے کی۔'' وہ پرزور لہجے میں بولی تو ریان نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''انہوں نے رائی کا پہاڑ بنایا ہے۔ میں اس رائی کو ڈھونڈنا چاہتی ہوں۔'' وہ اٹھی اور بغیر مزید کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئی۔

ریان نے ایک نظر ٹھنڈے ہوتے ناشتے کو دیکھا اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ناشتہ کرنے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

انیہ نے فوراً علی کو فون کر کے تمام صورتحال سے اسے آگاہ کیا وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر اسے کچھ انتظار کرنے کو کہا اور تقریباً پندرہ منٹ بعد اس نے انیہ کو فون کر کے اسے اپنے ذرائع سے معلوم کر کے بتایا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ وہ فون بند کر کے اٹھی اور ریان کے کمرے کی جانب چل دی۔

وہ اسی طرح صوفے پر بیٹھا تھا بس کپڑے تبدیل کر لیے تھے اور گیلے بال تازہ تازہ شاور لینے کی چغلی کھا رہے تھے۔ آدھے بازوؤں والی گرے شرٹ اور سیاہ ٹراؤزر میں ملبوس وہ کافی فریش لگ رہا تھا۔

انیہ اس کے مقابل آ کر بیٹھ گئی اور چند ثانیے تک اس کا چہرہ دیکھنے کے بعد بات کا آغاز کیا۔

''میں تم سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں، خوب سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ میرے ساتھ غلط بیانی مت کرنا۔ پلیز!''

''پوچھو۔'' ریان سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مگر اس کا دل زور زور سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔

''تم الماس نامی کسی لڑکی کو جانتے ہو؟'' علی نے اسے اتنا بتایا تھا کہ رعنا صدیقی نامی جرنلسٹ نے یہ پروپیگنڈا کسی فیشن ڈیزائنر امل رحیم کی شہ پر کیا ہے جس کا اصل نام الماس ہے۔'' انیہ نے یونہی الماس کا نام استعمال کیا تھا بجائے امل کہنے کے۔ ریان نے بے تاثر چہرے کے ساتھ اسے دیکھا۔

''میں کسی الماس کو نہیں جانتا۔'' اس کو ایک بھولا بسرا واقعہ، ایک انتہائی غیر اہم قصہ یاد آیا تھا۔

انیہ نے جیسے مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اس نے جھلا کر کروٹ بدلی۔ ''بند کر دے ٹی وی۔''

''تو چپ کر کے سو جا!'' کامی نے ٹس سے مس ہوئے بغیر چینل تبدیل کرتے ہوئے ساتھ لیٹے ریان سے پرسکون لہجے میں کہا۔

''تو ٹی وی بند کرے گا تو میں سوؤں گا، ایڈیٹ!'' اس نے کمبل منہ پر کر لیا مگر ٹی وی کی مسلسل آواز سے وہ ڈسٹرب ہو رہا تھا۔

''میں نہیں بند کر رہا۔'' کامی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو وہ تلملا کر رہ گیا۔ چیمپینز ٹرافی کے پہلے میچ کے سلسلے میں وہ لوگ پی سی کراچی میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اس کا روم میٹ اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔

''کامی بند کرنا!'' وہ چیخ کر بولا تو کامی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''میرا دل کر رہا ہے تو کہیں اور جا کر سو جا۔'' کامی اس کا بہت اچھا دوست تھا تب ہی دونوں کے درمیان اتنی بے تکلفی تھی۔

''کبھی ہم خوبصورت تھے۔''

''کامی بیٹا! اب تو خدا کا نام لے کر ٹی وی بند کر دے۔'' کمبل چہرے سے ہٹا کر وہ زور سے بولا۔

''کبھی ہم خوب صورت تھے۔''

''بہتر ہے تو اپنی بکواس بند کر کے سو جا۔'' کامی نے ریان سے اسے مشورہ دیا تھا۔

''کتابوں میں بسی خوشبو کی مانند۔

سانس ساکن تھی۔''

''دیکھ ذلیل انسان، نہ تو کتابوں میں خوشبو ہوتی ہے نہ ہی سانس ساکن ہو سکتی ہے۔ کیوں اس فضول بکواس کو سن رہا ہے؟''

''کتابوں کی خوشبو تو نے نہیں سونگھی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان میں خوشبو نہیں ہوتی۔ اگر کمرے کے ایک کارنر میں پرفیوم چھڑکی جائے تو وہ فوراً پھیل جاتی ہے مگر کتابوں میں بسی خوشبو وہیں ٹھہری رہتی ہے ایک ہی جگہ، ایک ہی نقطے سے آگے نہیں جاتی۔ اسی طرح کبھی زندگی بھی جمود کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کو سانس ساکن ہونا کہتے ہیں

کچھ آیا کھوپڑی میں؟''

بہت سے ان کہے لفظوں سے
تصویریں بناتے تھے۔

''تو پاگل ہے کامران! بالکل بالکل!'' وہ لاپروائی سے ہنسا۔''میری زندگی اتنی فاسٹ ہے کہ اس میں جمود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری فطرت میں بے چینی ہے میری سانسیں ساکن نہیں ہوسکتیں اس لیے خدا کا نام لے بند کردے ٹی وی کو۔''

پرندوں کے پروں پر نظم......

کامران نے اس کے مسلسل اصرار پر تنگ آکر ٹی وی بند کر ہی دیا اور خود بھی بتی بجھا کر لیٹ گیا۔

''ویسے کامی! یار نظم اچھی تھی۔'' اس کا مقصد محض کامران سے بدلہ اتارنا تھا، کیونکہ اس کی اپنی نیند تو بھاگ چکی تھی اب اس کو بھی نہیں سونے دینا تھا۔

''ہاں اچھی تھی۔'' کامران کی آواز سے لگ رہا تھا اسے ہلکی ہلکی نیند آرہی ہے۔

''نیرہ نور نے گائی ہے نا؟''

''ہوں۔'' اسے واقعی نیند آرہی تھی۔

''لکھی کس نے ہے؟''

''احمد شمیم نے، میرے بیگ میں اس کی کیسٹ ہے تو لے لینا مگر فی الحال آرام سے سوجا۔'' اب جب خود سونے لگا تو ریان کے مکالمے بول رہا تھا۔

''میں ٹی وی چلا رہا ہوں تو نے سونا ہے تو کہیں اور چلا جا......''

اس نے لائٹ آن کیے بغیر ٹی وی چلا دیا اور اسی چینل پر نشر کی جانے والی نظم سننے لگا۔

''کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے۔''

وہ اسے چڑانے کے لیے اگلے آدھے گھنٹے تک ٹی وی دیکھتا رہا۔

☆☆☆

''ٹکٹ تو تمام کے تمام بک چکے ہیں۔'' اہل نے مایوسی سے اس کی جانب دیکھا۔

پاکستان میں ہونے والا ریان حیدر کا کوئی میچ اس نے کبھی مس نہیں کیا تھا مگر چونکہ وہ حال ہی میں کراچی شفٹ ہوئی تھی اسی لیے گھر کو سیٹل کرنے میں اسے کافی وقت لگا تھا اور مصروفیت میں میچ کا خیال اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ جب یاد آیا اور وہ سٹیڈیم پہنچی تو ٹکٹس فروخت ہو چکے تھے۔

چیمپینز ٹرافی کے افتتاحی میچ کو وہ مس نہیں کرنا چاہتی تھی مگر ٹکٹ نہ ہونے کی صورت میں اس کے پاس واپسی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے ایک دفعہ پھر کوشش کی''میں دگنی قیمت ادا کروں گی مگر مجھے ٹکٹ ضرور چاہیے۔''

''سوری میڈیم! مگر میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ٹکٹس فروخت ہو چکے ہیں۔'' ٹکٹ کلرک نے اپنی بات دہرائی۔

''مگر میں......؟''

''ایکسکیوز می!'' اپنے عقب سے ابھرنے والی آواز پر اہل نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ تیئس چوبیس سالہ لڑکی تھی۔ جو مسلسل چیونگم چبا رہی تھی۔ اس کی رنگت سانولی مگر پرکشش اور جسامت انتہائی دبلی تھی۔

''یس؟'' اہل نے سوالیہ نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''میرے پاس دو ٹکٹس ہیں ایک میری کزن کا تھا مگر وہ نہیں آسکی۔ آپ وہ ٹکٹ لے لیں۔'' وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''او وہ تھینکس!'' اہل نے قیمت ادا کرنے کے لیے پرس کھولا تو اس نے روک دیا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میں نے خود نہیں خریدا تھا۔ آپ تحفہ سمجھ کر لے لیں۔''

''مگر......''

''پلیز!''

''اوکے۔'' اہل نے مسکرا کر شانے اچکائے۔

''آپ کے خیال میں کون جیتے گا؟'' نشست سنبھالتے ہوئے اس لڑکی نے اہل سے پوچھا۔

''پاکستان۔'' اہل نے بے ساختہ کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

''آپ کا نام کیا ہے؟'' کسی اچانک خیال کے تحت اہل نے اس سے پوچھ لیا۔

''حاریہ ملک۔''

''شعیب ملک کی کچھ لگتی ہیں کیا؟'' اس نے شرارت سے پوچھا۔

''شعیب ملک؟ اس کی تو ذاتی ہارڈ فین ہوں ویسے آج کل ریان حیدر پسند ہے اور آپ کو؟'' وہ پوچھنے لگی تو اہل نے سٹیڈیم پر نگاہ دوڑائی اور ریان حیدر کو دیکھ کر بولی۔

''مجھے بھی ریان حیدر پسند ہے۔'' (تم کیا جانو وہ مجھے کتنا پسند ہے؟'') اس نے سوچا۔

''آپ کا نام'' حاریہ پوچھنے لگی۔

''اہل رحیم۔'' پھر قدرے توقف سے کہنے لگی۔ ''ہمارا ایک بوتیک ہے۔ پرل۔''

''پرل؟ آپ پرل والی اہل رحیم ہیں؟'' وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

''جی۔'' اہل نے خوش دلی سے کہا۔ ''کبھی آیئے نا ہمارے بوتیک پر۔''

''اوہ شیور، وائے ناٹ۔'' حاریہ نے بالوں کو جھٹکا۔

☆☆☆

''میں مرنا نہیں چاہتی۔'' شکر پڑیاں پر موجود ریسٹورانٹس کے سامنے سے گزر کر روش پر چلتے ہوئے میرین نے اسے کہا تھا۔

ریان نے جواب نہیں دیا اور دائیں جانب گھاس پر کھڑے مداری اور تماشہ دکھاتے بندر کو دیکھتا رہا۔
وہ چیمپیئنز ٹرافی کے فائنل کے سلسلے میں پنڈی آیا تھا۔ پنڈی سے اسلام آباد آ کر میرین سے ملنے کے بعد اسے دیکھنے کے بعد ریان کو لگا تھا کہ عمان کا ڈاکٹر درست کہتا تھا۔
وہ اسے آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شکر پڑیاں لے آیا تھا مگر میرین کے موڈ میں کوئی واضح فرق نہ آیا تھا۔ وہ اب بھی ویسی ہی بجھی بجھی، اداس اور مضمحل لگ رہی تھی۔
''مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا تھا مگر اب لگتا ہے۔'' اونچی جاتی روش پر چلتے ہوئے وہ اس کو خاموش پا کر بولی۔
''کیوں لگتا ہے؟'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ اس کے پاس میرین کو تسلی دینے کے لیے الفاظ نہ تھے کیونکہ اس کی شکل سے ہی وہ بتا سکتا تھا کہ وہ.... ریان آگے نہ سوچ سکا۔
''اب مجھے جبرائیل کا خیال آتا ہے۔'' وہ رو نہیں رہی تھی مگر آواز میں آنسو غالب تھے۔
''میں ہوں نا!'' اس نے دلاسہ دینے کی ناکام کوشش کی۔
''تم کیا کر لو گے؟'' پتھریلی روش کے عین درمیان اچانک رک کر میرین نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ نگاہیں چرا گیا۔ وہ یونہی کچھ دیر اس کو دیکھتی رہی اور پھر دوبارہ سے چلنا شروع کر دیا۔
وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے فوارے کے آگے بنی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ دونوں کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا اور بہت کچھ تھا۔
''مجھے موت سے ڈر لگتا ہے، مجھے خوف آتا ہے۔'' اس کی آواز بھیگی سی تھی۔
''مجھے بھی موت سے خوف آتا ہے۔'' اس نے ایک جھرجھری لے کر کہا۔ اس وقت ریان حیدر کو لگ رہا تھا کہ اس کے مرنے پر وہ خود بھی مر جائے گا اور اس کو اس زندہ موت سے خوف آتا تھا۔
''میں مرنا نہیں چاہتی۔'' یہ بات وہ شاید ساتویں دفعہ کہہ رہی تھی۔
ریان نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں...... بے تحاشا ضبط کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ ریان کا دل دکھ کر رہ گیا۔
''تم نہیں مرو گی۔'' اس نے ایک دم بے چین ہو کر کہا۔
''میں مر جاؤں گی۔'' اپنے زرد ہاتھوں کو مسلتے ہوئے اس نے آزردگی سے کہا۔ اس کا چہرہ بھی ہاتھوں کی مانند زرد ہو رہا تھا۔ اس نے میرین کے سرد ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کے ہاتھ وہ اپنے چہرے کے بالکل قریب لے گیا اور اس کے ناخنوں کو دیکھنے لگا۔
اسے نہیں معلوم کب اور کیسے وہ رو پڑا۔ پھر وہ اپنی آنکھیں سختی سے رگڑ کر صاف کر رہا تھا۔
''پلیز، ڈونٹ۔'' وہ ایک دم تڑپ کر بولی اور اپنی انگلیوں سے اس کے گالوں پر موجود نمی کو صاف کیا۔
''مرد رویا نہیں کرتے۔'' پھر لہجہ دھیما کر کے بولی۔
''تم اس لیے رو رہے ہو کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ میں مر جاؤں گی۔'' اس نے جواب دیے بغیر خاموشی

سے آنکھیں خشک کیں۔ میرین کو لگا اس کا جواب اثبات میں ہے۔

اس نے جواب میں کچھ کہے بغیر ہولے سے اس کا بایاں ہاتھ تھاما اور رنگ نرمی سے اس کی انگلی سے نکال کر پیچھے بہتے فوارے میں پھینک دی۔

''تمہیں نہیں لگتا میرین تم نے کچھ کھو دیا ہے؟''

''رنگ اتار کر؟''

''رنگ پہننے کے بعد۔''

''شاید'' مہرین نے تھکے تھکے لہجے میں کہہ کر اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

''میرے بیٹے کا خیال رکھنا، اسے میری کمی محسوس نہ ہونے دینا۔''

''وہ میرا بھی بیٹا ہے میرین مجھے لگتا ہے کہ جیسے وہ میرا اور صرف میرا بیٹا ہو۔''

''تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟'' وہ اب روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''کیونکہ میں اس سے اور تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' مہرین بے آواز سسکیوں سے روتی رہی۔

وہ دونوں لاجواب کر دینے والے وجود، جن کے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا آج خود قدرت کی ستم ظریفی کے آگے ٹھہر نہیں سکے تھے۔ آج خود بے بسی کا نمونہ بنے لاجواب ہو کر بے حرکت بیٹھے تھے۔

دونوں کو معلوم تھا آگے کیا ہوگا اور دونوں اس سے خوفزدہ تھے۔

دو گھنٹے بعد اسے اس کی رہائش گاہ پر چھوڑتے وقت اس کی ملاقات شینڈلر آئر سے ہوئی تھی۔ ان دونوں کو آمنے سامنے پا کر میرین بغیر کچھ کہے اندر چلی گئی۔

''تم......تم بے ہودہ انسان! تم اسے مارنا چاہتے ہو، ہاں؟ کیوں خیال نہیں رکھتے تم اس کا؟'' اپنی نفرت اور حقارت کو جو وہ آئر کے لیے رکھتا تھا چھپا نہ سکا تھا۔

''تم ہو کون مجھ سے یہ پوچھنے والے؟''

''میں اس کا بھائی ہوں۔ تم اس کے متعلق میرے آگے جواب دہ ہو۔'' وہ چیخ کر بولا۔

''تم جاؤ اور جا کر کرکٹ کھیلو۔ میرا دماغ نہ کھاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ مڑنے ہی لگا تھا کہ ریان نے اسے کندھے سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی جانب کیا۔

''اگر میرین کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔'' وہ غرایا۔ ''میں سچ مچ تمہیں شوٹ کر دوں گا۔'' غصے میں کہہ کر اس کا کندھا چھوڑا اور مڑ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ جانتا تھا میرین کا کینسر آخری اسٹیج پر ہے اور یہ جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے بلکہ ہو گا مگر اس حقیقت پر یقین کرنے کو اس نے خود کو تیار کیا تھا نہ تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا ابھی بھی خیال تھا کہ شاید میرین کو بچانے کی کوئی صورت نکل آئے شاید کوئی معجزہ ہو جائے کوئی انہونی رونما ہو جائے مگر اس کے چاہنے کے باوجود بھی ایسا کچھ نہ

ہو سکا۔ کپڑے تبدیل کیے بغیر جب وہ میچ کے خاتمے کے بعد اس کی سرکاری رہائش گاہ پر اس سے ملنے گیا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ کچھ بھی نہ بچا تھا۔

میڈ نے اس سے کچھ کہے بنا اندر کمرے میں جانے دیا تو وہ بوجھل دل و دماغ کے ساتھ اندر چلا آیا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ آج کچھ ہونا ہے اور کچھ ہو کر رہے گا اور وہ کچھ ہو چکا تھا۔

بستر پر لیٹی میرین کے قریب کرسی پر ڈاکٹر بیٹھا تھا جبکہ ایک نوکرانی اور ایک میڈ دائیں جانب کھڑی تھیں۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر سوائے میرین کے ان تمام نفوس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ ریان نے دروازہ اپنے پیچھے بند کیا اور خاموشی سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔

''کیا...... کیا ہوا ہے میرین کو؟'' سوالیہ نگاہوں سے فرانسیسی ڈاکٹر کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی میڈم کی۔'' ڈاکٹر کے بجائے نوکرانی نے جواب دیا۔ ''ہم نے فوراً مسٹر آرکو اطلاع دی مگر وہ پریس کانفرنس میں تھے۔ پھر میں نے خود ڈاکٹر کو بلا لیا، مگر......'' وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر رونے لگ گئی۔

وہ جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ اسے لگا وہ کبھی ہل نہیں سکے گا، کبھی حرکت نہیں کر پائے گا اسے لگا وہ پتھر کا بت بن چکا ہے۔

''مرنے سے پہلے مسز آرنے اپنے بیٹے سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی مگر جب تک میڈ جبرائیل آر کو لے کر آئی وہ انتقال کر چکی تھیں۔'' ڈاکٹر نے اپنے جوتوں کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

''آپ...... آپ پلیز اس کمرے سے چلے جائیں۔'' ریان نے التجا کی تھی اور زندگی میں پہلی بار اس نے یوں بے چارگی سے التجا کی تھی۔

نوکرانی نے آنسوؤں کے درمیان کچھ کہنا چاہا مگر ڈاکٹر نے ہاتھ اٹھ کر روک دیا اور باہر چلنے کا اشارہ کر کے خود اپنی نشست سے اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھا۔

جب کمرہ خالی ہو گیا تو ریان نے ایک نظر میرین پر ڈالی جس کے چہرے پر کمبل تھا اور آگے آ کر اس کے چہرے سے کمبل اتارا۔ اس کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید تھا اور گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ ریان نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے ماتھے کو چھوا، وہ یوں تھا جیسے برف ہو۔ یخ ٹھنڈا اس نے دیکھا اس کے ماتھے پر رکھی اس کی انگلیاں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔

اپنا ہاتھ اب اس نے میرین کے دائیں اور پھر بائیں گال پر رکھا، وہ بھی آئس برگ کی طرح پھر اس نے اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا اور دوزانو ہو کر بیڈ کے ساتھ لگ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

''میرین؟'' اس نے دھیمی آواز میں اپنی بچپن کی ساتھی کو پکارا، مگر وہاں خاموشی تھی۔

''جواب تو دو بے شک ہمیشہ کی طرح کوئی آؤٹ اسٹینڈنگ قسم کا جواب مت دینا، مگر کم از کم اتنا تو بتا دو کہ...... کہ......'' اس سے کچھ کہا نہ گیا۔ کوئی چیز ہولے ہولے اس کے چہرے کو گیلا کر رہی تھی۔

''میرین! دیکھو تمہیں میرا یوں تمہارا نام بگاڑنا برا لگتا تھا نا دیکھو اب میں تمہیں تمہارے نام سے پکارتا

ہوں۔میری اپنے فیونا آرَ، پلیز اٹھ جاؤ۔
میں وہ وقت واپس لانا چاہتا ہوں جب ہم شرارتیں کرتے تھے۔ بچوں کے بیگز میں مرے ہوئے کیڑے مکوڑے ڈال دیتے تھے۔ ربڑ کے چوہوں اور سانپوں سے جونیئرز کو ڈراتے تھے، فٹ بال میچز کے دوران مجھے سپورٹ کرنے کے لیے تم مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کی آنکھوں میں آئینے کے ذریعے روشنی مارتی تھی اپنے سے پنگا لینے والوں کو سیدھا کر دیتے تھے، جو ہمارے ساتھ برا کرتا تھا اسے سبق سکھا دیتے تھے مگر آج...... آج میں تمہاری موت کا بدلہ کس سے لوں؟ کس کو سبق سکھاؤں؟''

اس نے اس کا سرد ہاتھ آہستہ سے چوم لیا۔ اس کے چہرے پر بہتے آنسو میرین کی انگلیوں کو نم کر چکے تھے۔
''تمہیں یاد ہے میرین! ہم نے کیمسٹری کے ٹیچر سے ایک مذاق کیا تھا۔ میں نے کہا تھا میں کرکٹر بنوں گا اور سب کتنا ہنسے تھے۔ ڈینئل نے کہا تھا وہ فٹ بالر بنے گا اور سب اس سے بھی زیادہ ہنسے تھے۔ پھر...... پھر تم نے کہا تھا اگر تم ڈاکٹر نہ بن سکیں تو مریض بن کر ڈاکٹرز کی خدمت کرو گی اور اس وقت ہم چاروں پر خدا ہنسا تھا۔''
اس نے میرین کا بے جان ہاتھ چھوڑ دیا اور اس کے بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر چہرے پر پھسلتے جا رہے تھے۔
''اور میں سوچتا ہوں میرین! اس وقت خدا کتنا ہنسا ہوگا۔''

☆☆☆

''بھائی! میرے فرینڈز کی شرٹس سائن کر دیں نا۔'' ہیثم نے منہ بسور کر درخواست کی۔
''اور وہ جو لاسٹ ٹائم میں نے شرٹس کا پلندہ اور آٹو گراف بکس کا ڈھیر سائن کیا تھا وہ کن کا تھا؟'' ریان نے کچھ جھلا کر پوچھا۔
''وہ...... بھی فرینڈز کا ہی تھا۔'' اس نے کچھ کھسیانا سا ہو کر جواب دیا۔
''تو ان سے کہو کہ ان ہی پر قناعت کریں۔'' اس نے حتمی لہجے میں بات ختم کرنا چاہی۔
''کم آن رونی! کر دے نا سائن۔'' علی نے اس کی حمایت کی تو وہ خوش ہو گیا۔
میرین کی موت کے سات ماہ بعد اس شام پہلی دفعہ ریان نے ہنس کر بات کی تھی ورنہ ان سات ماہ میں وہ جس ناقابل بیان اذیت سے گزرا تھا، اسے لگتا تھا دنیا بس ختم ہو گئی ہے۔
اب اس کا دل کرتا تھا وہ فیملی کے ساتھ وقت گزارے، اسی لیے میرین کی موت کے بعد دوسری مرتبہ وہ کراچی آیا تھا۔
اس شام وہ تینوں بھائی لان میں ''بے ڈھنگے'' انداز میں بیٹھے تھے، جس کا مطلب تھا، تینوں کی طبیعت درست ہے۔
علی سفید میز پر براجمان، اپنے موبائل سے کھیل رہا تھا۔ ہیثم کرسی سے ٹیک لگائے گھاس پر بیٹھا تھا جبکہ وہ اپنی بلی ''نینسی'' کو سینے پر لٹائے لش گرین گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔

''علی! تیری کوئی سابقہ دوست آ رہی ہے بیٹا! حساب کتاب لینے۔ اب تو سنبھال اس کو۔'' کہہ کر ریان سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اپنی طرف آتی لڑکی کو دیکھنے لگا۔

علی نے بری طرح چونک کر سر اٹھایا اور اسے دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔

''میری کچھ نہیں لگتی یہ۔'' اس نے سرگوشی میں ریان سے کہا۔ اتنے میں چوکیدار قریب آ چکا تھا۔

''صاب! یہ لڑکی کہتی ہے، مجھے ریان حیدر سے ملنا ہے۔''

چوکیدار نے اپنے پیچھے کھڑی، قدرے گھبرائی گھبرائی لگنے والی، کالج یونیفارم میں ملبوس، انیس بیس برس کی لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔

''تجھ سے حساب چکانے آئی ہے بیٹا!'' علی نے مدھم آواز میں اس سے کہا اور موبائل فون بند کر کے میز پر رکھ دیا۔

''جی فرمائیے۔'' بلی کو چھوڑ کر ریان اٹھ کھڑا ہوا اور متانت سے پوچھنے لگا۔

''آپ ریان حیدر ہیں نا؟'' اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر وہ خوشی اور جوش کے ملے جلے تاثرات سے پوچھنے لگی۔

''شک ہے آپ کو؟'' علی مسکراہٹ دباتے ہوئے بڑبڑایا۔

''جی، مگر میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' وہ قدرے الجھ کر بولا۔

''میں مناہل ہوں، مناہل بخاری!'' اس نے جھٹ اپنا تعارف کرایا۔

ریان نے گڑبڑا کر علی اور ہیثم کی جانب دیکھا جو دلچسپی سے تماشا دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ دونوں اس تماشے کے عادی تھے، محض ریان نہیں جانتا تھا۔ ریان نے اس کی طرف دیکھا اور ابرو اٹھا کر پوچھنے لگا۔

''میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''میں...... میں آپ سے شادی کرنے آئی ہوں۔''

''ش...... آدی م...... م مجھ سے؟'' حیرت کے عالم میں ہکلاتے ہوئے اس نے اپنی جانب اشارہ کیا تو اس لڑکی نے جھٹ سر ہلا دیا۔

ریان نے امداد طلب نگاہوں سے پیچھے کھڑے علی اور ہیثم کو دیکھا جو ہنسی دبانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

''مگر وہ میں آپ سے کس طرح شادی کر سکتا ہوں؟'' اس نے بے چارگی سے مناہل بخاری کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''جس طرح کرتے ہیں۔'' لڑکی نے معصومیت سے بتایا تو اس سے پیشتر کہ وہ اپنا سر پکڑ لیتا، علی نے جھٹ مداخلت کی۔

''ایسا ہے مس بخاری کہ ریان کی تو ہم شادی کر رہے ہیں۔'' جس رسان سے علی نے اس کو بتایا ریان کا جی چاہا اس کو گلے لگا لے۔

''نہیں پلیز، دیکھیے میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں، صرف اور صرف آپ سے۔ میں نے آپ کی

تصاویر سے اپنی تین scrap books بھر رکھی ہیں۔ میرے کمرے میں آپ کے درجنوں پوسٹرز لگے ہیں۔ آئی رئیلی لو یو۔'' علی کے بجائے ریان کو مخاطب کر کے وہ جذباتی انداز میں کہے جا رہی تھی۔

''آپ کی شادی ریان سے ہو سکتی ہے مگر اس کے لیے کچھ شرائط وضوابط ہیں۔'' علی نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔''آپ کو شادی کے بعد ریان کے ساتھ افریقہ کے جنگلات میں رہنا ہوگا۔ شکار کرنا سیکھنا ہوگا، کیونکہ وہاں کھانے کو آپ کو خرگوش اور ہرن وغیرہ ملیں گے۔ رنگ آپ کو اپنا کالا کرنا ہوگا، دانت ایک دو تڑوانے ہوں گے، پانی کے بجائے ناریل کے پانی پر گزارا کرنا ہوگا۔''

ریان کے لبوں پر ایک دھیمی سی مسکان بکھر گئی اور وہ موقع پا کر کھسک گیا۔ ہیثم بھی اس کے پیچھے ہولیا اور دونوں اکٹھے ہی لاؤنج میں داخل ہوئے جہاں مما اور انیہ کپڑوں کے کسی ڈیزائن میں الجھی دکھائی دے رہی تھیں۔

''مما!'' ریان نے سینٹر ٹیبل پر رکھے پیالے میں سے چھلی اور کٹی ہوئی گاجر کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے ان کو مخاطب کر کے کہا۔''علی نے اس لڑکی سے جھوٹ بولا ہے کہ میری شادی ہونے والی ہے۔''

''اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے اور انیہ نے واقعی تمہارے لیے ایک لڑکی ڈھونڈی ہے۔ بلکہ ہم نے رشتہ بھی طے کر دیا ہے۔'' انہوں نے اسے مطلع کیا۔

''واٹ؟ مجھ سے پوچھے بغیر ہی؟''

''لو، تم نے خود ہی تو اپنی شادی کا فیصلہ میرے ہاتھ میں دیا تھا۔ بھول گئے کیا؟''

''نہیں وہ تو آپ بے شک میرا رشتہ کر دیں جس سے چاہے کر دیں مگر مجھے ایک دفعہ دکھا تو دیں کہ کون ہے، کیسی ہے، کہیں انیہ کی طرح خوفناک صورت ہوئی تو میں تو اسے دیکھتے ہی بے ہوش ہو جاؤں گا۔'' انیہ کو دیکھ کر اس نے آخری فقرہ کہا تھا۔

انیہ نے سننے کے باوجود بھی کوئی کومنٹ پاس کرنے سے گریز کیا۔

''اچھی خاصی شکل کی ہے وہ، بلکہ بے حد خوب صورت۔'' اس کے قریب بیٹھتے ہوئے علی نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''پر ہے کون؟'' ریسٹ لیس رونی نے بے چینی سے پوچھا۔

''انکل داؤد کی بیٹی۔'' پیالے سے گاجر اٹھاتے ہوئے علی نے جواب دیا۔

''ان کی تعریف؟''

''ڈیڈ کے اتنے اچھے دوست ہیں، جانتے نہیں ہو تم؟''

''میں کوئی ڈیڈ کی ٹیلی فون ڈائریکٹری ہوں جو مجھے علم ہوگا۔'' وہ برا مان کر بولا۔

''ارے بیٹا، ریا کو تو جانتے ہو نا، داؤد بھائی کی بیٹی، حاریہ۔ اس کی بات کر رہے ہیں۔'' مما نے رسانیت سے بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

حاریہ کو وہ جانتا تھا، فیملی ڈنرز پر اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ ٹینس بہت اچھا کھیلتی تھی۔ وہ اس کے کھیل کا مداح تھا۔ وہ خوب صورت تھی، نائس تھی، با اخلاق تھی، امیر تھی، واقعی حاریہ ملک ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھی۔

ریان نے ایک دھیمی مسکان کے ساتھ سر اثبات میں ہلا کر گویا مما کو اپنی رضا مندی کا یقین دلایا۔
''مگر مما! وہ واقعی خوب صورت ہے نا، مطلب کہیں انیہ کی طرح میک اپ تھوپ کر تو نہیں......'' اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی انیہ نے کشن اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا تھا۔
''کیوں، سچ برداشت نہیں ہوا کیا؟'' وہ ابھی تک اسے چڑانے سے باز نہیں آیا تھا۔
''اف رونی، تم کتنا بولتے ہو!'' مما نے سرد آہ بھر کر تاسف انگیز لہجے میں کہا۔
''صحیح کہہ رہی ہیں۔'' گاجر کترتے ہوئے علی نے فوراً مما کی تائید کی۔
''تمہارے فادر ان لاء سے یہ عادت چرائی ہے، سمجھے؟'' وہ کچھ فخر سے گردن تان کر بولا تو علی دھیرے سے ہنس دیا۔
''ہا......آہ زلفی بھی بہت بولتا تھا۔'' مما کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے یادوں کے دریچے کھولنے لگیں۔
''میں اسے بہت منع کرتی تھی کہ کم بولا کرے، مگر وہ کہتا تھا تم مجھے خاموش نہیں کرا سکتیں۔ پھر جس دن میں نے اس کی خاموش میت دیکھی میں نے سوچا تھا زلفی آج چپ ہو گیا ہے۔'' مما کے اداسی میں کہے گئے جملوں سے ماحول سوگوار اور پژمردہ ہو گیا۔
فضا کو خوشگوار بنانے کے لیے ریان نے فوراً مداخلت کی۔ ''چلیں پھر آپ مجھے بھی خاموش نہیں کرا سکتیں، میں بھی اب ایسے ہی چپ ہوں گا۔''
''ریان!'' مما نے دہل کر اسے دیکھا تھا ''ایسے کہتے ہیں؟ میرے خدا، ذرا بھی زبان پر کنٹرول نہیں ہے تمہیں...... یوں بدفال نکالتے ہیں منہ سے؟'' وہ خفگی سے اسے گھور رہی تھیں۔
''مذاق کر رہا تھا مما...... آپ بھی کیا سولہ سال کی لڑکی کی طرح سیریس ہو جاتی ہیں۔'' اس نے جلدی سے اپنی نرم مزاج ماں کے غصے کو کم کرنا چاہا۔
''ویسے مما، اس عمر میں بھی آپ لڑکی ہی لگتی ہیں۔'' علی نے بھی فوراً جملہ دیا۔ ''ذرا ڈیڈ کے ساتھ باہر جائیں کہیں، لوگ پوچھیں گے، انکل یہ لڑکی کہاں سے اڑائی ہے۔'' اس کے انداز پر مما سمیت سب ہنس دیے۔

☆☆☆

مدھم دستک پر اس نے آنکھوں پر رکھا بازو ہٹا کر ادھ کھلے دروازے میں کھڑی رانیہ کو دیکھا تو فوراً اٹھ بیٹھا اور ایک استقبالیہ مسکراہٹ سے ان کو اندر آنے کا کہا۔
''میں سمجھی تم سو گئے ہو گے، مگر لائٹ آن دیکھی تو سوچا تم سے چند باتیں کرتی جاؤں۔ سو تو نہیں رہے تھے نا؟'' کمرے میں داخل ہو کر اس کے قریب آتے ہوئے انہوں نے اپنے آنے کی وضاحت کر دی۔
''جی نہیں۔'' ریان نے جواب دیا۔ وہ اگلے روز دورہ انگلینڈ کے لیے لندن بقیہ ٹیم کے ہمراہ روانہ ہو رہا تھا۔
''کبھی گھر بھی رہا کرو۔'' وہ شاکی انداز میں کہنے لگیں۔ ''ہم بھی تمہارے کچھ لگتے ہیں۔ ہمارا بھی تم پر حق بنتا ہے۔ ہمیں بھی ٹائم دیا کرو بیٹا۔''

ریان نے قدرے چونک کر ماں کو دیکھا"وہ......"

"میں یہ نہیں کہہ رہی کہ لاہور مت جایا کرو، مگر یہاں بھی رہا کرو۔"اس کی بات کاٹ کر وہ بولیں۔"اب تم شادی کے بعد کدھر رہو گے؟"

"لا...... پتا نہیں۔"شاید اس کا لاہور کہنا مناسب نہ ہو، اسی لیے اس نے شانے اچکا کر پتا نہیں کہہ دیا۔

"بیٹا، ماں باپ ساری عمر اولاد کے لیے اتنا کچھ کرتے ہیں اولاد پھر بھی انہیں چھوڑ جاتی ہے۔ تم اب اپنے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر لاہور بس جاؤ گے تو کیا خیال ہے ہم دونوں خوش رہیں گے؟"

"آپ دونوں؟"وہ بے خیالی میں بڑبڑایا۔

"ہاں میں اور عظیم باقی رہے تمہارے بہن بھائی تو انہیں شاید اتنا فرق نہ پڑے جتنا ہمیں پڑتا ہے یا پڑے گا۔"

"پھر؟ کہاں رہوں؟"وہ سعادت مندی سے پوچھنے لگا۔

"میں تو کہتی ہوں ادھر ہمارے پاس ہی رہو۔ کراچی میں بھی تو کرکٹرز ہوتے ہیں نا۔ وہ بھی تو رہتے ہیں۔ باقی تمہاری مرضی۔"وہ پیار سے اس کے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔"ریا سے بھی پوچھ لینا۔"

"ریا سے؟ اس سے کیوں؟"اندر کے انا پرست، خوددار اور ناک اونچی رکھنے والے مرد نے سر اٹھایا"یہ میری مرضی ہوگی کہ میں کہاں رہوں۔"

"مگر بیٹا، ایسے کرو گے تو زندگی نہیں چلے گی۔ شوہر بننا ہے تمہیں، الٹرو خان نہیں کہ بیوی کی ہر بات سے اختلاف کرنا ہے۔ سمجھے؟"

"ہوں۔"

"انگلینڈ سے واپس آجاؤ تو ہم سوچ رہے ہیں شادی کر دیں تمہاری۔ صحیح ہے نا؟"

"جی صحیح ہے۔"

"کوئی اعتراض تو نہیں؟"یہ بات انہوں نے اس کے کراچی قیام کے دوران ایک سو اٹھارویں دفعہ پوچھی تھی۔

"اوں ہوں۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ بس اتنا کریں کہ اس بات کو ذرا سیکرٹ ہی رکھیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری شادی کی خبر میڈیا میں پھیلے اور خوامخواہ کی پبلسٹی ہو۔ شادی سے دو ڈھائی ہفتے پہلے ہی disclose کریں گے۔"

"ویسے تمہارا کیا خیال ہے، کب تک کرکٹ کھیلو گے؟"

"ابھی چار پانچ سال مزید انشاء اللہ۔"اس نے ایک عزم سے بتایا۔

"ریان بیٹا، یہ تمہارے کیریئر کا عروج ہے۔ اسکو برقرار رکھو اور اسی عروج پر ریٹائرمنٹ لے لینا۔ اس سے پہلے کہ تم پر خدانخواستہ زوال آنے لگے، تم کرکٹ سے الگ ہو جانا۔"وہ سمجھانے والے انداز میں بولیں۔

ریان نے سر ہلا دیا تو انہوں نے جھک کر اس کا ماتھا چوم لیا۔"اب سوؤ گے؟"

"جی۔"

"چلو پھر سو جاؤ۔"وہ پیار بھرے لہجے میں بولیں۔"ویسے بھی جب تک آنکھیں بند کیے سوئے پڑے ہوتے

ہو تو اتنے پیارے لگتے ہو کہ میرا دل کرتا ہے میں اپنے بیٹے کو دیکھتی ہی رہوں۔"
"چلیں ٹھیک ہے۔" وہ آنکھیں موند کر دھیما سا ہنسا۔
"جب میں مر جاؤں تو آپ میری لاش کو کافی دیر تک دیکھتی رہنا۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹا اچھا لگوں گا نا؟"
"بدتمیز نہ ہو تو، مت نکالا کرو بدفال منہ سے۔" اپنے بیٹے کی مذاق کرنے کی عادت سے واقف تھیں مگر پھر بھی تنبیہہ کیے بغیر نہ رہ سکیں۔
کہتے ہیں ہم انسانوں کا کہا گیا ایک ایک حرف ریکارڈ ہوتا ہے۔
ریان حیدر کا یہ فقرہ بھی ایسے ہی وقت کہا گیا تھا۔

☆☆☆

لارڈز کرکٹ اسٹیڈیم میں پریکٹس سیشن کے دوران، دو واقعات پیش آئے۔
ایک تو یہ کہ نیٹ پریکٹس دیکھنے آئے شائقین میں سے ایک سے مل کر ریان کی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔
وہ اس سے اپنے بیٹے کی شرٹ پر آٹوگراف لینے آئی تھی۔ شرٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا "آپ نے مجھے پہچانا؟" ریان نے سائن کرتی انگلیاں روک کر اسے دیکھا "نہیں تو۔" وہ واقعی نہیں پہچان پایا تھا۔
"میرے بھائی کا نام شعیب ہے۔ اب یاد آیا؟" وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگی تو اوسط یادداشت کے مالک ریان حیدر کو ایک جھماکے سے یاد آ گیا۔
"میں پہچان گیا۔ آپ مجھے تقریباً ساڑھے گیارہ برس پہلے برمنگھم میں ملی تھیں، آپ کا نام عائشہ ہے اور میں آپ کو اپنے دوست شعیب ملک کی بہن سمجھا تھا۔" آخری فقرہ اس نے ہنستے ہوئے ادا کیا تھا۔
"گو کہ میں نے اپنی طرف سے آپ کو کافی سمجھایا تھا مگر آپ دلی طور پر راضی نہیں ہوئے تھے۔ پوچھ سکتی ہوں، یہ تبدیلی کون لایا؟"
"کون سی تبدیلی؟" وہ ذہن پر زور ڈالے بنا پوچھنے لگا۔
"یہی کہ آپ اپنے ملک چلے گئے۔"
"اوہ اچھا..... آپ کی باتوں کا اور کچھ میری چھوٹی بہن کے سمجھانے کا اثر ہوا، مجھے میری پہچان مل گئی۔" یہ بات اب اتنی پرانی ہوگئی تھی کہ ریان کو ٹھیک سے یاد بھی نہ تھی۔
"بہت خوشی ہوتی ہے آپ کو کھیلتا دیکھ کر۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کو کرکٹر میں نے بنایا ہے۔" عائشہ کا چہرہ واقعی خوشی سے دمک رہا تھا۔
"کھیلتے ہوئے تو مجھے بھی ....." اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرتا، ٹیم منیجر احسان رفیع بھاگتے ہوئے اس کے پاس آئے۔
"ریان! جلدی کرو۔" وہ بوکھلائے ہوئے لگ رہے تھے۔ شرٹ اس کو تھما کر وہ فوراً احسان بھائی کے پیچھے

ہولیا۔ پویلین کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ دونوں براؤن اینٹوں سے بنے خوب صورت اور تاریخی ڈریسنگ روم میں داخل ہوئے۔ جس چیز پر اس کی پہلی نگاہ پڑی، وہ اس کا پیک شدہ سامان تھا۔ کرسیوں پر کوچ، میڈیا منیجر، فزیو اور ٹیم ٹرینر براجمان تھے۔

''تمہاری فلائٹ بک کرا دی گئی ہے، تم آج شام ہی پاکستان واپس جا رہے ہو۔'' احسان بھائی نے اسے آگاہ کیا۔

''مگر کیوں؟'' وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔

''ہیتھرو ائیر پورٹ جانے کے لیے تم دس منٹ میں تیار ہو جاؤ۔''

''مگر احسان بھائی، کیوں؟ میرے گھر میں سب خیریت ہے نا؟'' وہ دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھنے لگا۔

''ہاں مگر......'' وہ خاموش ہو گئے۔

''مگر کیا؟'' وہ پریشانی سے بولا۔

''مگر یہ کہ...... ہیپی برتھ ڈے۔''

''جی؟'' وہ حیرت سے کھڑا انہیں دیکھتا رہا، پھر جب سمجھ میں آیا تو بے اختیار ہنس دیا۔ ''مگر میرا سامان؟'' اس نے اپنے بند بیگز کی جانب اشارہ کیا۔

''تمہارا سامان پیک نہیں کیا۔ بس تمہیں ڈرانے کے لیے رکھا تھا۔'' کوچ نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''اوہ گاڈ!'' وہ بری طرح ہنس رہا تھا۔

اتنے میں ارمغان ہاتھ میں کیک لیے دیگر کھلاڑیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ ''رونی بھائی، آج آپ تئیس سال کے ہو گئے ہیں۔''

وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ ''بڑے تیز ہو گئے ہو تم لوگ۔ میری تو جان ہی نکال دی تھی۔ میں سمجھا میرا ڈوپ ٹیسٹ مثبت آ گیا ہے۔'' اس کی بات پر کمرے میں ایک قہقہہ گونج اٹھا۔

☆☆☆

انگلینڈ کے خلاف سیریز کے اختتام پر جب وہ دیگر کھلاڑیوں اور ٹیم مینجمنٹ کے ہمراہ وطن واپس آیا تو دو خبریں اس کی منتظر تھیں۔ پہلی تو یہ کہ نامعلوم اور ذاتی وجوہات کی بنا پر چیئرمین پی سی بی لیاقت علی نے استعفیٰ دے دیا تھا ان کی جگہ نئے چیئرمین کا حلف مرزا جاوید نے اٹھایا تھا۔

مرزا جاوید، ریان کے ٹیم میٹ ارمغان کے والد تھے، ان سے پہلی دفعہ ریان اپنی واپسی کے دوسرے روز قذافی اسٹیڈیم میں ملا تھا۔

''شاید تمہیں یاد ہو کہ ٹھیک ساڑھے سات ماہ پہلے میں تم سے پی سی بی میں ایک فنکشن میں ملا تھا۔'' اس کا نہایت اچھے طریقے سے استقبال کرنے کے بعد انہوں نے سگار سلگاتے ہوئے پوچھا۔

وہ ٹیپکل بیوروکریٹ تھے۔ ان کی پرسنالٹی انتہائی شاندار اور مسحور کن تھی اور جتنے اچھے طریقے سے وہ ریان

سے ملے تھے اس طرح تو کبھی کوئی پچھلا چیئر مین بھی نہیں ملا تھا۔اس کو پہلی ہی ملاقات میں وہ پسند آئے تھے۔

''یس سر،تب میں آپ کو ارمغان کے فادر کی حیثیت سے جانتا تھا۔'' وہ یادداشت پر زور دیتے ہوئے بتانے لگا۔اس وقت وہ دونوں قذافی اسٹیڈیم میں چیئر مین پی سی بی کے دفتر میں موجود تھے۔ جہاں ریان محض ان کے کہنے پر ملنے آیا تھا۔

''آئی وش کہ تم مجھے آئندہ ارمغان کا فادر نہ سمجھو۔'' انہوں نے سگار کا جلا ہوا حصہ ایش ٹرے میں ڈالا اور آگے کو ہو کر سنجیدگی سے بولے'' مجھے یہ تعارف پسند نہیں ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ نا سمجھی کے عالم میں انہیں دیکھنے لگا۔

''دیکھو ریان۔'' وہ اپنی نشست سے اٹھے اور دھیرے قدموں سے چلتے ہوئے کھڑکی کی جانب بڑھ گئے۔ کھڑکیوں کے برابر کیے قیمتی اور نفیس پردے ہٹاتے ہوئے وہ کہنے لگے''اس دنیا میں ہر شخص کو دوسرے کے خلوص پر شبہ ہوتا ہے۔لوگوں کو، پریس کو، میڈیا کو، یہاں تک کے کھلاڑیوں کو بھی میرے متعلق یہ شبہ ہوگا بلکہ ہے کہ میں اپنے بیٹے کی جگہ مستحکم کرنے کی کوشش کروں گا حالانکہ یہ لوگ جانتے بھی نہیں ہوں گے کہ میں سرے سے ارمغان کے کرکٹ کھیلنے کے ہی خلاف تھا۔''

''کیوں؟'' وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''میں اسے سول سروس میں لانا چاہتا تھا مگر وہ اپنے شوق کے ہاتھوں کرکٹ میں آگیا۔'' وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے بتا رہے تھے۔''لیکن اب وہ خاصا اپ سیٹ ہے کہ ساتھی لڑکے اسے باپ کے چیئر مین پی سی بی ہونے کا طعنہ دیں گے۔ پلیز ریان! میں تمہیں بیٹا سمجھ کر یہ بات کر رہا ہوں،تم ارمغان کو چیئر مین پی سی بی کا بیٹا مت سمجھنا۔ اگر وہ بری پرفارمنس دے رہا ہے تو بے شک اسے ٹیم سے ڈراپ کر دینا۔میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے۔''

''اٹس اوکے سر! میں سلیکشن ہمیشہ میرٹ پر ہی کرتا ہوں۔'' وہ پرعزم لہجے میں بولا۔

''تھینک یو مائی بوائے۔'' وہ دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہوگئے۔''ویسے روبی آئی ایم اے گریٹ فین آف یورز۔'' وہ دھیمے سے مسکرائے تو وہ شرمندہ ہوگیا۔

''بس تم کبھی کسی حق دار کی چیئر مین پی سی بی کے بیٹے کے لیے حق تلفی نہ کرنا، پلیز یہ ریکویسٹ ہے میری۔''

''آف کورس سر!''

''بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر۔'' انہوں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے ریان نے فوراً تھام لیا۔ یہ اس بات کا سگنل تھا کہ''انٹرویو از اوور۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور انہیں خدا حافظ کہہ کر وہاں سے نکل آیا۔

اگر انہوں نے یہ کہا تھا کہ وہ ریان کے کھیل کے مداح تھے تو وہ واقعی تھے۔آنے والے دنوں میں انہوں نے سلیکشن کمیٹی کا اصل کام ریان کے حوالے کر دیا۔ ریان جو کہتا وہ اسے فوراً تسلیم کر لیتے۔انہوں نے کبھی اس کے کام میں مداخلت نہیں کی، نہ ہی کبھی ارمغان کے سلسلے میں اس سے بات کی۔

ارمغان کو ٹیم سے ڈراپ نہیں کیا گیا کیونکہ وہ بہت اچھی پرفارمنس دے رہا تھا۔اسے ڈراپ کرنے کا

سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

☆☆☆

''کیا حال ہے انکل آپ کا، سب ٹھیک ٹھاک......؟'' داؤد انکل کو ڈرائینگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور سلام دعا کے بعد پوچھنے لگا۔

''بالکل سب ٹھیک ٹھاک ہے۔شکر ہے تم نے شکل تو دکھائی۔'' وہ پرتپاک انداز میں اس سے گلے ملے۔

''بس انکل! ٹائم ہی نہیں ملتا۔'' وہ کھسیانا سا ہو کر بولا۔

کراچی واپسی پر جو دوسری خبر اسے ملی تھی، وہ اپنی شادی کی تھی جو دسمبر کی آخری تاریخوں میں یعنی چند ہفتوں میں رکھی گئی تھی۔

مما تو روز ہی کہتی تھیں مگر اسے اتنا وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ جا کر ان لوگوں سے مل ہی آتا، ویسے بھی وہ رشتہ طے ہونے سے لے کر شادی کی تاریخ رکھے جانے تک ان کے گھر نہیں جا سکا تھا۔رسموں میں شمولیت سے معذرت تو وہ انہیں ''زنانہ'' اور ''غیر ضروری'' کہہ کر، کر ہی لیا کرتا تھا مگر ایک دفعہ جانا تو بہر حال بنتا ہی تھا، سو اس روز ویک اینڈ پر کراچی آنے پہ وہ وہاں چلا آیا۔

وہ اتوار کا دن تھا اور وہاں سب دیر سے اٹھے تھے۔داؤد انکل نے عام سا ڈھیلا ڈھالا سا لباس پہن رکھا تھا اور غالباً اسی وقت ناشتے سے فارغ ہوئے تھے۔اس وقت گیارہ بج رہے تھے اور ریان نے تو صبح خیزی کے باعث اتوار کے باوجود بھی آٹھ بجے ناشتہ کر لیا تھا اور اس وقت دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ خدا کرے یہ اس سے کچھ کھانے پینے کو بھی پوچھ لیں۔

داؤد انکل کے آنے کے کچھ دیر بعد ہی حاریہ چلی آئی تھی۔ریان کو باپ کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر وہ کچھ جھجکی پھر اندر داخل ہوگئی۔

وہ اس کو دیکھ کر بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا تو وہ مزید جھجکتے ہوئے ان کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی اور دھیمی آواز میں سلام کیا۔

اس کو بیٹھتا دیکھ کر اس نے سلام کا جواب دیا اور اپنی سابقہ نشست سنبھال لی، پھر بظاہر داؤد صاحب سے باتیں کرتے ہوئے وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ دراز قد، دبلی پتلی بلکہ slender کہنا زیادہ مناسب ہوگا اور سنہری رنگت کی حامل ایک پرکشش لڑکی تھی۔اس کے شولڈر کٹ بالوں میں نہایت نفاست سے اسٹریکنگ کی گئی تھی، تین شیڈز میں اور نہ چاہتے ہوئے بھی ریان کو ایک بھوری آنکھوں والی لڑکی یاد آ گئی تھی۔

ایک ہوک سی تھی جو سینے میں اٹھی، مگر وہ اسے دبا گیا۔

''میں ذرا تمہاری آنٹی کو دیکھتا ہوں۔'' داماد پہلی دفعہ گھر آیا تھا، ظاہر ہے داؤد صاحب کے فراق میں تو نہیں آیا تھا، اسی لیے اپنی زیادہ دیر موجودگی انہیں مناسب نہیں لگی اور وہ بہانے سے اٹھ کر چلے گئے۔

ان کے جانے پر رونی نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور حاریہ کی جانب دیکھا جو بدستور اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔

''اوپر دیکھ لو، اب ڈیڈی چلے گئے ہیں تمہارے۔ ویسے بھی زیادہ دیر تک گردن لٹکانے سے اس کے گرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔'' اس نے بڑے سنجیدہ انداز میں نہایت مخلصانہ مشورہ دیا تھا، جس پر حاریہ نے ہڑبڑا کر اوپر دیکھا تھا۔

وہ اس سے پہلے غالباً دو تین بار ہی اس سے ملی تھی مگر ریان کے انداز میں برسوں کی شناسائی تھی اور پھر وہ تھا بھی سدا کا تیز طرار، اس کا بوکھلانا فطری تھا۔

''ویسے تم اس رشتے سے خوش تو ہو؟'' داؤد صاحب کے جانے کے بعد وہ کچھ اور شیر ہو گیا تھا اسی لیے بے باکی سے پوچھنے لگا۔

''جی۔'' اسے اس سوال پر حیرانی ہوئی تھی۔

''اچھا۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔ ''شکل سے تو نہیں لگ رہا۔''

''وہ کیا ہے کہ میں کافی حسن پرست ہوں، مگر آپ کے معاملے میں، میں نے شکل کے علاوہ اور بہت کچھ دیکھا اور یہ سوچ کر ہاں کر دی کہ کوئی بات نہیں، شکل تو اللہ نے بنائی ہے، مگر کرکٹر تو آپ کافی اچھے ہیں۔'' حاریہ نے بظاہر معصومیت سے جواب دیا۔ اپنے تئیں اس نے مذاق کیا تھا مگر کسی چیز نے لمحہ بھر کو ریان کو خاموش کر دیا۔

وہ کوئی یونانی حسن سے مالا مال دیوتا نہیں تھا کم از کم علی کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہ تھا مگر انفرادی طور پر کافی خوب صورت تھا اور اب تو گلیمر اور گردمٹ نے اسے اور بھی ڈیشنگ کر دیا تھا، لیکن اسے حاریہ کی یہ بات پتا نہیں کیوں کسی چابک کی طرح لگی تھی۔

''مذاق کر رہی ہو؟'' اس نے لہجے کو بظاہر نارمل رکھتے ہوئے پوچھا، جواب میں وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

ریان نے ایک گہرا سانس لیا۔ وہ واقعی مذاق کر رہی تھی۔

''ویسے ایک بات بتاؤ۔'' وہ بغور اس کے چہرے پر دائیں آنکھ کے قریب موجود تل کو دیکھ رہا تھا۔ ''تم نے مجھ سے شادی کا فیصلہ میرے کرکٹر ہونے کی بناء پر کیا تھا؟''

سامنے بیٹھا شخص اس کا منگیتر تھا اور ایسا سوال وہ بھی منگیتر کی زبان سے سننے پر ہر لڑکی، چاہے وہ وکیل ہی کیوں نہ ہو، شرما جاتی ہے، حاریہ بھی جز بز سی ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ محض شادی کے ذکر پر ہی اس کی یہ حالت ریان کو کافی لطف دے رہی تھی۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔ اگر میں کرکٹر نہ ہوتا تو کیا تم مجھ سے شادی کر لیتیں؟''

''شاید نہیں کیونکہ مجھے کرکٹر پسند ہیں۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

ریان کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا، اسے کم از کم یہ جواب سننے کی توقع نہ تھی۔

''اچھا اگر شادی کے چند دن بعد ہی میرا شاندار کیریئر ختم ہو گیا تو تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی؟'' وہ اسے چڑانے کے لیے کہہ رہا تھا۔

''فار گاڈ سیک! کم از کم آپ تو ایسی باتیں مت کریں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ جانتی تھی کہ وہ اس وقت کس سے بات کر رہی تھی۔ پاکستان کے ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے نام ور، معروف اور ممتاز کرکٹر، اسپیڈ اسٹار اور دنیا کے سب سے زیادہ اسٹائلش بلے باز سے جو کسی ایڈ میں کام کرنے کا معاوضہ لالی وڈ کے سب سے بڑے اداکار سے زیادہ لیا کرتا تھا، جو تین بین الاقوامی کمپنیوں کا سفیر تھا اور وہ بات کر رہا تھا اپنا کیریئر ختم ہونے کی! حاریہ کو تو ہنسنا چاہیے تھا۔

''آپ ایک کرکٹر ہیں اور آپ اچھے ہیں تو میرے ماں باپ نے رشتہ ادھر کیا ہے اور جہاں تک بات ہے آپ کو خدانخواستہ چھوڑنے کی تو کم از کم میں وہ آخری فرد ہوں گی جس سے یہ عمل سرزد ہوگا۔'' وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔

''لگتی تو نہیں ہو، مگر ہو کافی ذہین۔'' ریان نے اس کی ذہانت کا اعتراف بالکل ویسے ہی کیا جیسے مرد کرتے ہوتے ہیں، اوپر سے، وہ بھی مذاق کی صورت میں۔

''لگنے کا کیا ہے، لگتے تو آپ بھی خاصی ذہین ہیں۔'' وہ لاپروائی سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ریان جانتا تھا کہ وہ مذاق کر رہی ہے وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

☆☆☆

لائٹ آف کر کے وہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ وہ سیدھا نہیں سو سکتا تھا، ہمیشہ دائیں یا بائیں کروٹ سوتا تھا۔ حالانکہ مما بائیں جانب سونے سے انتہائی منع کرتی تھیں مگر وہ عادت سے مجبور تھا۔ اس وقت بھی بائیں طرف کروٹ لے کر اس نے آیۃ الکرسی پڑھی اور آنکھیں موند لیں۔

حاریہ اچھی لڑکی تھی، اسے سمجھتی بھی تھی۔ خوب صورت بھی تھی۔ کوکنگ میں بھی ماہر تھی۔ بااخلاق، مہذب، شائستہ مگر اسے یاد آ گیا، انیہ نے دو ایک روز پہلے اس کے متعلق کیا کمنٹ پاس کیا تھا 'Selfish' (خودغرض) ہے، مگر خیر کوئی بات نہیں۔ سب ہوتے ہیں۔''

لیکن وہ جانتا تھا وہ ان سب میں شامل نہیں ہے۔ وہ انتہائی selfless (بے لوث) انسان تھا اور دوسروں سے بھی یہی توقع کرتا تھا۔ لیکن پھر انیہ کیوں......

اسے نیند آ گئی تو سوچوں کا یہ ربط بھی ٹوٹ گیا۔

☆☆☆

اس کے آگے دو خوب صورت اور انتہائی محبت سے تیار کردہ ملبوسات رکھے تھے اور وہ مسلسل اسی شام کے متعلق سوچ رہی تھی جب وہ اس کے پاس آئی تھی۔

وہ ایک عام سی شام تھی۔ دن بھر کے کام ختم کر کے وہ مسز انصاری کی ساڑھی کے لیے ڈیزائن ڈرا کرنے کے بعد اس کی colour co-ordination پر کام کر رہی تھی، جب وہ اس کے بوتیک میں داخل ہوئی۔

پہلے تو وہ اس کو پہچان نہیں پائی تھی۔ اس کا سوشل سرکل خاصا وسیع تھا اور ایسے میں محض ایک دفعہ کی ملاقات کے بعد چہرہ اور شخصیت یاد رکھنا کافی مشکل تھا مگر جب حاریہ نے چیمپینز ٹرافی کے میچ کے ٹکٹس کا حوالہ دے کر یاد کرایا۔

تمام واقعہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

''اوہ ہاں، مجھے یاد ہیں آپ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلا کر حاریہ کو بتایا تھا۔''خیریت؟ کیسے یاد کیا آپ نے ہمیں؟'' وہ خوش مزاجی سے پوچھنے لگی۔

''میری شادی ہو رہی ہے اور میں برائیڈل آپ کا ہی پہننا چاہتی ہوں۔'' تیکھے نقوش اور تیز تیز بولنے والی حاریہ کے لہجے میں اصرار تھا۔

''اوہ حاریہ! مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمیں اس قابل جانا، مگر ہم تو برائیڈلز تیار نہیں کرتے۔'' اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد امل نے معذرت کر لی۔

''مگر مجھے آپ کے ڈیزائن بے حد پسند ہیں اور میں آپ کا تیار کردہ ڈریس ہی پہننا چاہتی ہوں۔'' وہ بضد تھی۔

''حاریہ! ہم برائیڈلز نہیں بناتے، آپ اپنے جہیز کے لیے تمام ڈریسز یہاں سے تیار کروا سکتی ہیں۔''

''جہیز اور ولیمہ کا ڈریس تو تیار ہے، مگر مجھے برائیڈل آپ کا ہی پہننا ہے۔''

''اچھا کرتے ہیں کچھ۔'' امل ٹال رہی تھی۔''ویسے کہاں ہو رہی ہے آپ کی شادی؟'' اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے اس نے پوچھا۔

''پاپا کے ایک دوست کے بیٹے سے۔'' وہ بتانے لگی۔

''کیا کرتے ہیں؟'' وہ بھی دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

''کرکٹر ہیں، ریان حیدر کو تو آپ جانتی ہوں گی۔'' حاریہ نے عام سے انداز میں کہہ کر گویا امل پر بجلیاں گرا دیں۔

کتنی ہی دیر وہ ساکت ہو کر اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ دماغ بیدار ہونا شروع ہوا۔ تو وہ شادی کر رہا ہے؟ وہ کسی اور سے شادی کر رہا ہے۔

اس نے حاریہ کی جانب دیکھا اور زبردستی مسکرائی۔''آپ اسپیشلی ہمارے پاس آئی ہیں۔ آپ بتائیں آپ کس طرح کا برائیڈل چاہتی ہیں۔''

''اوہ تھینکس۔'' وہ مشکور ہوئی۔''مجھے Blue Icy پر سلور کا کام والا لہنگا چاہیے۔ کام بہت نہ ہو۔ دوپٹے پر ایک چوڑی پٹی کی صورت میں ہو اور بلاؤز پر کافی زیادہ ہو۔ باقی لہنگے پر ہلکا ہونا چاہیے۔'' وہ اسے اپنی پسند سے آگاہ کرنے لگی۔

''اور آپ کے ہونے والے شوہر؟ وہ کیا کہتے ہیں؟''

''ریان؟ اس کا تو دل تھا میں Puschia Pink کلر لوں۔ دوپٹہ سر پر رکھنے کے بجائے گلے میں لے لوں۔ بال کھلے رکھوں اور آنکھوں میں خوب ہیوی کاجل کا کوٹ کروں۔ باقی کوئی میک اپ وغیرہ نہ کروں مگر آپ تو جانتی ہیں کہ یہ ناممکن ہے۔ میں تو وہی پہنوں گی جو میرا دل چاہے گا۔'' حاریہ نے لاپروائی سے کہا۔

اس کے جانے کے بعد امل نے دو ڈیزائنز بنا کر اپنے ہاں کام کرنے والی لڑکیوں کے حوالے کیے تھے۔

ایک Blue Icy لہنگے اور میچنگ پرس و جوتوں کا تھا۔ جبکہ دوسرا ڈیزائن ایک Puschia Pink لباس کا تھا۔ اور آج وہ دونوں ملبوسات اس کے سامنے رکھے تھے۔ پنک ڈریس کے اوپر حاریہ کی جانب سے ریان اور اس کی شادی کا کارڈ رکھا تھا جو 31 دسمبر کو آواری ٹاورز میں منعقد ہونا تھا۔ اہل کو معلوم تھا اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

''تم آج معمول سے زیادہ ہینڈسم لگ رہے ہو۔'' علی نے اس پر ایک ستائشی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''تھینکس۔'' وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر مسکرا دیا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

''اوئے گدھے، میں نے تیری تعریف کی ہے، اب تو بھی میری تعریف کر۔'' علی نے گویا سر ہی پیٹ لیا تھا۔ اس نے مڑ کر علی کو دیکھا۔

گریش بلیک سوٹ، میچنگ ٹائی اور ڈان کارلس کے جوتوں میں علی ہمیشہ کی طرح شاندار لگ رہا تھا۔ علی کی عادت تھی جب تک آدھی پرفیوم کی شیشی خود پر انڈیل نہ دیتا، اسے چین نہیں آتا تھا، وہ پاگل پن کی حد تک صفائی ستھرائی کا قائل تھا۔

''ہوں...... آج لگ رہا ہے کہ میری بہن کے ساتھ بہت بڑی زیادتی نہیں ہوئی۔''

اس کی بات پر علی اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگا۔

''ویسے یار! تم واقعی آج بہت شاندار لگ رہے ہو۔'' علی نے اپنی بات دہرائی۔ ''آج تمہاری فینز کو تم سے شادی نہ ہونے کا افسوس ہوگا۔''

بغیر ٹائی کے givenchy کے سیاہ کوٹ اور پینٹ اور لائٹ گرے شرٹ میں ریان واقعی اچھا لگ رہا تھا۔ ورنہ اس سے پیشتر وہ سوٹ بہت کم پہنتا تھا۔ مگر آج اس کی شادی تھی۔ اس کی زندگی کا اہم ترین دن۔

سب لوگ ہوٹل پہنچ چکے تھے، سوائے علی اور ریان کے۔ ریان نے کہا تھا، وہ علی کے ہمراہ آئے گا مگر علی نے نہانے میں پورا سوا گھنٹہ اور تیاری میں پون گھنٹہ لگایا تھا اور یہ بھی جلدی تھا ورنہ اس سے کچھ بعید نہ تھا۔

''اکٹھے چلیں یا الگ الگ؟'' علی نے پورچ میں پہنچ کر اس سے پوچھا۔

''اکٹھے ہی چلتے ہیں۔'' وہ جو اپنی کار کی جانب بڑھ رہا تھا کچھ سوچ کر علی کے BMW کی طرف آ گیا۔

فنکشن میں سب سے خوب صورت انیہ اور علی کا کپل لگ رہا تھا۔ انیہ نے وہی اسکن کلر کا فرنچ شفون کا لباس اور اور پرل کی جیولری پہنی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اپنی زمین پر جھاڑو دیتی شال کے ساتھ وہ تمام انتظامات بخوبی سنبھال رہی تھی۔

علی کی وجہ سے وہ دیر سے پہنچا تھا، مگر چیف گیسٹ ہوتے ہوئے دیر سویر معانی نہیں رکھتی تھی۔ ہر کوئی توصیفی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا اور لوگوں کے چہروں پر پڑھی جانے والی ستائش ریان کو اچھی لگ رہی تھی۔

آج سال کا آخری دن تھا، اس کی زندگی کا اہم ترین، خوب صورت ترین دن اور کل صبح سے اسے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ ہر پرانی بات بھلائے...... وہ صرف حاریہ کے متعلق سوچ رہا تھا مگر اسے لگا

تھا شاید دل کا کوئی کونہ خالی ہے لیکن اس خیال کو جلد ہی دماغ میں تھپکی دے کر سلا دیا تھا۔

وہ ابھی تک اسٹیج پر نہیں گیا تھا، ہال میں ہی تمام کرکٹر دوستوں اور کزنز کو ویلکم کر رہا تھا۔ انجلینا اور ڈینئل کو اس نے انوائٹ کیا تھا مگر وہ نہیں آئے تھے۔ کرس آئی تھی۔ میرین کے مرنے کے بعد جبرائیل کی ذمہ داری اس نے اٹھالی تھی اور آج بھی وہ جبرائیل کو ساتھ لے کر آئی تھی۔ جبرائیل کو دیکھ کر ریان کو بے ساختہ ایک بہت محبت کرنے والی لڑکی یاد آگئی تھی۔

تین سالہ جبرائیل کی آنکھیں بالکل میرین جیسی تھیں اور غصے میں بھنویں اٹھانے کا انداز، مسکراہٹ سب میرین سے مشابہہ تھا۔ اس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔

اس وقت بھی وہ مہمانوں سے مل رہا تھا جب اس نے tinted کرسیوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے اسے فرنٹ رو کی جانب جاتے ہوئے دیکھا اور ایک پل کو جیسے مبہوت سا ہو گیا۔

یہ تو وہی تھی جو ہر جگہ ہوتی تھی۔ ان گزرے برسوں میں ریان نے اس کو کئی بار مختلف مقامات پر دیکھا تھا۔

اسے یاد آیا آخری بار اس نے اس کو اردن کے شہر عمان میں دیکھا تھا وہ ہر دفعہ پہلے سے زیادہ خوب صورت لگ رہی ہوتی تھی...... اور آج، آج اس کی شادی پر وہ آئی ہوئی تھی؟ مگر کیوں؟

کون ہے یہ؟ کیا مقصد ہے اس کا یوں میری گارڈین اینجل (Guardian Angel) بن کر ہر جگہ میرے پیچھے پھرنے کا؟

☆☆☆

وہ ساکت سا پنک ڈریس میں چلتی ہوئی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جب علی نے اس کا شانہ ہلایا۔

''چلو...... اسٹیج پر۔''

ریان کا دماغ گویا بھک سے اڑ گیا۔ جتنی دیر وہ اس کو دیکھتا رہا تھا اسے اپنا اور حاریہ کا تعلق بھول گیا تھا۔ یہ بات اس کے دماغ سے محو ہو چکی تھی کہ ابھی کچھ دیر میں اس کا اور حاریہ ملک کا نکاح ہونے والا ہے اور جب وہ حال میں واپس آیا تو دل یک دم اچاٹ ہو گیا تھا۔

اس کو لگا وہ اب حاریہ سے شادی نہیں کر سکتا۔ حاریہ کا تمام تر حسن اسے اب معمولی اور پھیکا لگ رہا تھا۔

عورت اگر ذہن بدلنے میں ایک دن لگاتی ہے تو مرد ایک سیکنڈ اور وجہ صرف وہ لڑکی نہ تھی وجہ اس کی گہری آنکھوں میں چھپا وہ اسرار تھا جو ریان حیدر کو اکسا رہا تھا۔

''رونی چل یار! نکاح خواں آ گئے ہیں۔'' علی نے ڈیڈ کے ہمراہ سٹیج کی جانب بڑھتے دو تین آدمیوں کی طرف اشارہ کیا تو اس نے بڑی بے چارگی سے علی کی طرف دیکھا تھا۔

''علی! میری بات سنو۔'' اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے الفاظ جیسے کم پڑ گئے تھے۔

''بعد میں کہنا جو بھی کہنا ہے۔ فی الحال چلو۔'' وہ اس کی بات سنے بغیر آگے جانے لگا۔

''علی یار! دو منٹ میری بات سن لے۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ کم ان رونی! بعد میں کرنا بات۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ کیونکہ ہال میں سناٹا چھا گیا تھا۔ نکاح کے عمل کے باعث عورتوں نے زبردستی سروں پر دوپٹے جمائے اور زبانوں کو قفل لگائے تھے۔
اسٹیج پر موجود صوفے پر بیٹھے اسے عجیب سی وحشت سی ہو رہی تھی۔ سامنے والی رو میں وہ بیٹھی تھی۔ پہلے جب بھی ریان نے اس کو دیکھا تھا وہ ہمیشہ کسی دوسری سمت نگاہیں مرکوز کیے بیٹھی ہوتی تھی مگر آج وہ سیدھی اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔
اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک کشش، ایک سحر، ایک چمک تھی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ریان کو لگا وہ کچھ کہہ رہی ہے، لبوں سے نہیں نگاہوں سے۔
''مولوی صاحب نے تعوذ و تسمیہ کے بعد مخصوص آیات تلاوت کرنے کے بعد ریان سے پہلی دفعہ اس کی مرضی مانگی۔
وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ جس نے گردن کی ہلکی سی جنبش سے نفی کا اشارہ کیا تھا۔ ریان کو لگا وہ اس اجنبی لڑکی کی بات نہیں ٹال سکتا۔ وہ جیسے اس کی سیاہ آنکھوں کے اثر سے مسمرائز ہوگیا تھا۔
''ریان!'' علی نے سرگوشی میں کہا تو اس نے دھیرے سے رخ پھیر کر اسے دیکھا۔ علی کو لگا اس کا چہرہ سفید پڑ رہا ہے۔
''وہ کچھ پوچھ رہے ہیں، جواب دو۔'' اسے لگا علی کہیں بہت دور سے بول رہا ہے۔
''علی! میں...... میں یہ نہیں کر سکتا۔'' اس نے تمام قوتیں مجتمع کر کے بدقت دھیرے سے کہا تاکہ کوئی اور نہ سن پائے۔
''کیوں؟ کیا ہوا؟'' علی حیرت اور شاک سے اسے دیکھ رہا تھا۔
''بس! کہا نا کہ نہیں کر سکتا۔'' وجہ خود بھی نہ جاننے کے باعث اس نے مبہم سا جواب دیا۔
''تمہارا دماغ درست ہے ریان! تمہیں سائن کرنے پڑیں گے۔'' علی نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے غصہ دبا کر کہا۔
ہال میں یک دم چہ میگوئیاں گردش کرنے لگی تھیں.. دولہا نکاح خواں کی بات کے جواب میں ''قبول ہے'' کہنے کے بجائے اپنے بھائی سے پریشانی اور فکرمندی کے عالم میں گفتگو کر رہا ہے یہ چکر کیا ہے؟ ہر کسی کے ذہن میں اس وقت وہی سوال گردش کر رہا تھا۔
''ریان!'' ڈیڈ نے تنبیہی انداز میں اسے ٹوکا تو اس نے پریشان سا ہو کر اس لڑکی کی جانب دیکھا۔ وہ بھی اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ اس سے دو نشستیں چھوڑ کر بیٹھی انیہ پر اس نے نگاہ ڈالی، جو اپنی سبز آنکھیں سکیڑے ریان کو دیکھ رہی تھی۔
''اسے یاد آیا وہ اس کی شادی پر کتنا خوش تھی۔ تمام تیاریاں تمام انتظامات اسی نے کیے تھے اگر وہ انکار کر دیتا ہے تو اس کی رضائی بہن کے دل پر کیا گزرے گی؟''
اس نے عظیم کی جانب دیکھا۔ کئی برسوں کی کمائی گئی ساکھ اور عزت ریان کا ایک انکار دو منٹ میں

ریت کی دیوار کی طرح ڈھا سکتا تھا۔

اس نے انیہ کے ساتھ موجود اپنی ماں کو دیکھا۔ فنکشن کے عین درمیان میں اس کے ''مجھے قبول نہیں۔'' کہنے سے ان کو کتنا بڑا صدمہ پہنچتا؟

اس نے مما کے ساتھ بیٹھی بیا کو دیکھا۔ وہ اور ہیثم اپنے کرکٹر بھائی پر کتنا فخر کرتے تھے، ناز کرتے تھے۔ آج اگر ان کا بھائی عین موقع پر شادی سے انکار کر دیتا ہے تو وہ اپنے فرینڈز کو کیا منہ دکھائیں گے؟

اس نے علی کی طرف دیکھا اور پھر گویا اس نے فیصلہ کر لیا مگر فیصلہ کرتے وقت ریان عظیم حیدر نے اس لڑکی کی جانب نہیں دیکھا۔

''آپ کو حاریہ ملک ولد داؤد ملک اپنے نکاح میں بعوض پندرہ لاکھ حق مہر سکہ رائج الوقت قبول ہے؟''

''قبول ہے۔''

''دستخط کر دیں۔''

ریان نے تیزی سے قلم پکڑا اور جہاں جہاں مولانا صاحب بتاتے گئے اس نے دھڑا دھڑ سائن کرنے شروع کر دیے۔ اس نے ایک بار بھی سر اٹھا کر اس لڑکی کی جانب نہیں دیکھا۔ گواہان کے دستخط کے بعد سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ ریان نے بھی بہ مشکل اپنے ہاتھ اٹھائے۔ آمین کہہ کر تمام افراد نے ہاتھ چہرے پر پھیرے۔ اور تب پہلی دفعہ اپنے نکاح کے بعد اس نے اس لڑکی کی جانب دیکھا۔

حیرت سے اس کے ہونٹ کھل گئے تھے۔ اس کی آنکھیں شاک کے باعث پوری کی پوری پھیل گئی تھیں اور وہ اتنی حیرانی اور صدمے سے ریان کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے ریان کے اقرار اور اپنی شکست کی امید نہ ہو۔ پھر اس نے دیکھا اس مانوس اجنبی لڑکی کی بڑی بڑی، کاجل سے لدی، آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے اور بے حد شکستگی اور تھکاوٹ سے چور احساس کے ساتھ ریان کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر لکھی تحریر بہت واضح تھی۔

''میں ہار گئی۔ قسمت جیت گئی۔'' ریان یہ تحریر بہ خوبی پڑھ سکتا تھا، مگر اس کے اپنے چہرے پر بھی یہی لکھا تھا۔

سب کھڑے ہو چکے تھے اور گلے ملتے ہوئے ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔ ہال میں عورتوں نے مجبوراً اوڑھے گئے دوپٹے جلدی سے سر سے اتار دیے اور پھر وہی آوازیں اور شور فضا میں رچ بس گیا جو نکاح سے پہلے تھا مگر دو وجود ایسے بھی تھے جن کے اندر مکمل سکوت چھایا ہوا تھا، جو بالکل خاموشی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔

پھر ایک دم ریان نے اسے کھڑے ہوتے دیکھا تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ جتنی دیر میں وہ لابی میں پہنچا، وہ باہر جا چکی تھی۔

تقریباً بھاگتے ہوئے وہ باہر پارکنگ لاٹ میں آیا تو وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ ریان دوڑ کر اس کی گاڑی کے قریب گیا۔ ان دونوں کے درمیان محض ایک بند شیشہ حائل تھا۔ اسی بند شیشے کے پار سے اس نے ریان کی جانب جن نظروں سے دیکھا ریان کا جی چاہا وہ زمین میں دفن ہو جائے۔

اس کی آنکھوں سے کاجل کے باعث سیاہ آنسو نکل کر سرخ و سفید گالوں پر پھسل رہے تھے۔

''سنو، میری بات سنو۔'' آج وہ سب کو اپنی بات سننے کو کہہ رہا تھا مگر آج کوئی اس کی نہیں سن رہا تھا، اس نے بھی بغیر سنے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے فل اسپیڈ پر اڑاتی ہوئی وہاں سے نکال کر لے گئی۔

''بات تو سنو میری، پلیز۔'' وہ اس کی فراٹے بھرتی گاڑی کو دیکھتے ہوئے سڑک پر تنہا کھڑا کہہ رہا تھا۔ سردی کے باعث اس کے منہ سے دھواں نکل رہا تھا مگر اس کو سردی نہیں لگ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ مر گیا ہے زندہ سلامت قبر میں چلا گیا ہے۔

تھک ہار کر وہ پارکنگ لاٹ میں موجود ایک قدرے اونچی جگہ پر بیٹھ گیا اور اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

''مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ، ہاں؟ اس طرح ڈرامے کر کے تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟'' علی کی غصیلی آواز پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''شادی تمہاری مرضی سے ہو رہی تھی، تو عین موقع پر تم کیوں انکار کرنے والے تھے؟ تمہیں ذرا خیال ہے ڈیڈ کی عزت کا؟ عزت بنانے میں سالوں لگ جاتے ہیں اور اسے ملیامیٹ کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ ریان! تم کرنا کیا چاہتے ہو، کیا نکاح پر ڈراما کری ایٹ کر کے لوگوں کو باتوں کا موقع دے رہے ہو، اور اب جب وقت آیا ہے کہ تم اپنی کوئی صفائی دو، تو تم یوں فنکشن چھوڑ کر یہاں آ بیٹھے ہو۔ ادھر ڈیڈ اور مما تمہاری طرف سے تاویلیں دے دے کر......'' علی یک دم رک گیا۔ ''رونی! تم...... رو رہے ہو؟'' وہ حیرت سے منہ کھولے ریان کو دیکھ رہا تھا۔

''نہیں تو۔'' اس نے آنکھیں صاف کیں۔ ''بھلا میں...... میں کیوں روؤں گا؟''

''ریان؟ کیا ہوا ہے یار! مجھے بتا۔'' وہ بھی اس کے ساتھ وہیں بیٹھ گیا۔

''تمہیں؟ تمہیں بتاؤں؟'' وہ اسی بھیگی آواز میں ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ ''میں خود نہیں جانتا۔''

''تمہیں تو حاریہ پسند تھی۔''

''ہاں...... مگر مجھے اس سے محبت تو نہ تھی۔''

''تو اس سے ہے جس کے لیے عین موقع پر تو نے مائنڈ چینج کر لیا؟'' علی آہستگی سے پوچھ رہا تھا۔

''اس سے؟'' ریان نے سوچا۔ ''نہیں...... پتا نہیں۔''

''کون ہے وہ؟''

''پتا نہیں۔''

''تو نہیں جانتا اسے؟''

''میں...... میں جانتا ہوں اسے......'' اسے لگا وہ اسے حاریہ سے زیادہ جانتا ہو۔

''کب سے؟''

''آٹھ سال ہو گئے ہیں۔'' اس نے خالی خالی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''ریان! اگر کوئی ایسی بات تھی تو تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' علی کے لہجے میں دکھ، تاسف، فکرمندی، سب کچھ تھا۔

''بتانے تو لگا تھا،تم نے سنا ہی نہیں۔''

''اب نہیں۔جب یہ سب شروع ہوا تھا۔''علی نے''شروع'' پر زور دیا۔

''شروع؟''ریان نے سوچا۔''ابھی تو ہوا تھا شروع۔''

''اب تو کیا چاہتا ہے؟''علی نے سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔میں گھر جانا چاہتا ہوں۔''پہلی بار اس نے کچھ نارمل انداز میں بات کی۔

علی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا،اور گاڑی کی چابی نکال کر اسے تھما دی اور اس وقت تک اس کا نگاہوں سے تعاقب کیا جب تک وہ اس کی کار میں بیٹھ کر اسے چلاتا ہوا نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد وہ اٹھا اور سست قدموں سے ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔ابھی اسے ریان کی غیر موجودگی کی''وضاحتیں''نہ صرف لوگوں بلکہ ماں باپ کے سامنے بھی پیش کرنا تھی۔

☆☆☆

اس کا آخری مہرہ بھی مات کھا چکا تھا اور شکست کے بعد وہ تھکی ہاری،روتی ہوئی اپنے گھر آئی تھی۔

اپنے بیڈروم کی کنڈی چڑھا کر اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا،بالکل ایسے جیسے بارہ سال پہلے اس سے فون پر ذلیل ہونے کے بعد کیا تھا۔اس وقت جو ٹھوکر لگی تھی اس پر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا کیونکہ اس کے پاس زندگی پڑی تھی اس سے انتقام لینے کو مگر آج وہ کیا کرے کہ انتقام کے منصوبے پر کی گئی بارہ برس کی محنت اکارت گئی تھی۔ویسا نہیں ہوا جیسا اس نے سوچا تھا،جیسا اس نے چاہا تھا۔

واللہ خیر المکرین

''اور اللہ سب سے اچھی چال چلنے والا ہے۔''

اور واقعی چالیں چلتے چلتے وہ جو خود کو اللہ پر ایمان رکھنے والی کہتی تھی،یہ بھول گئی کہ وہ بھی تو ہے جو اپنی چالیں چلتا ہے۔وہ انسان کو کوشش کرتا تو دیکھتا ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ اسے کامیاب بھی کر دے۔بارہ سال اس نے کوشش کی،بارہ سال بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ جس نے اسے بہت پہلے ٹھکرا دیا تھا۔آج بھی ٹھکرا چکا ہے بلکہ آج تو اس نے اسے کسی اور کے لیے ٹھکرایا ہے،رد کیا ہے۔

اللہ کی طاقت پر یقین الماس کو تھا،امل کو نہیں۔الماس اللہ پر بھروسہ کر کے اپنی بقا کے تحفظ کے لیے اپنے گھر سے نکلی تھی جبکہ امل نے رانیہ کا گھر اپنی بقا کے بجائے ایک اور انسان کو تباہ کرنے کے لیے چھوڑا تھا۔الماس ایک جاہل،اجڈ،گنوار اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی تھی۔امل،مہذب اور تعلیم یافتہ تھی جس نے الماس کے خوابوں کو حقیقت کا روپ دیا مگر اس بلندی پر وہ الماس کے خوابوں کے باعث نہیں انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی پہنچی تھی۔

طاقت ور دشمن کو مات کرنے کے لیے اس نے طاقت ور دوست بنانے شروع کر دیے مگر وہ یہ بھول گئی کہ سب سے زیادہ طاقت ور تو اللہ ہے۔اس نے اپنے انتقام کی تکمیل کے لیے اللہ سے زیادہ اپنی عقل اور ذہانت پر بھروسا کیا۔

ایک ''خود پسند'' شخص نے اسے فون پر باتیں سنائی تھیں، یہ کوئی اتنی بڑی وجہ تو نہ تھی کہ وہ اس پر اس طرح سے ری ایکٹ کرتی اس طرح اس شخص کو پاتال میں گرانے کی کوشش کرتی۔

انتقام جس سے لیا جائے اس کی تو زندگی تباہ ہوتی ہے مگر انتقام لینے والا خود اپنی پوری زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس کی کیفیت اس صحرا کے مسافر کی سی ہو رہی تھی جو میلوں دور کی مسافت طے کر کے بھی دشت کے وسط میں کھڑا تھا۔ بارہ سال سے نفرت کے الاؤ میں دہکتی امل اس کا تو بال بھی بیکا نہ کر سکی۔

نفرت؟ کیا وہ اس سے نفرت کرتی تھی؟ الماس تو اس سے بے پناہ محبت کرتی پھر امل؟ امل کیوں نہیں کرتی تھی۔

''میں کون ہوں؟ الماس یا امل؟ اس کا ذہن دو حصوں میں بٹنے لگا۔

امل نے انتقام کی خاطر الماس کی محبت کا گلا گھونٹنا چاہا مگر محبت مر نہیں سکتی۔ الماس کی محبت بھی نہیں مری تھی۔ امل کو لگا وہ آج بھی ریان سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی پہلے کرتی تھی۔

اسے یاد آیا۔ بارہ سال پہلے جب وہ اس طرح ہاری تھی تو اس نے اپنے اندر کی الماس کو ختم کر دیا تھا۔ توڑ کر رکھ دیا تھا مگر آج اس کے پاس توڑنے کو اور بہت کچھ تھا۔

کچھ سوچ کر وہ اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کی جانب بڑھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی تمام چیزوں کو اپنے عتاب کا نشانہ بنانے کے بعد وہ اپنی الماری کی جانب بڑھ گئی۔

وہ تمام چیزیں جن کی کبھی الماس نے خواہش کی تھی ان کو وہ تباہ کر رہی تھی۔ ان تمام مادی اشیاء کو ملیا میٹ کر رہی تھی جن سے اس نے خود کو نکھارنے کی کوشش کی تھی مگر آج اسے پتا چلا تھا کہ حسن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ سب تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں۔

وہ نڈھال سی ہو کر بستر پر گر گئی۔ اسکا دل چاہ رہا تھا وہ ان سب چیزوں کو آگ لگا دے۔ اس نے جتنا کمایا تھا وہ انہی چیزوں پر خرچ کیا تھا۔ یہ اس کی متاع عزیز تھی۔

اس نے اپنا جائزہ لیا اور اپنے جسم پر ''زیور'' نام کی کوئی شے ڈھونڈنا شروع کی مگر سوائے اس انگوٹھی کے وہ کچھ بھی پہن کر نہ گئی تھی۔ اپنے تھکاوٹ سے چور جسم کو بستر پر اسی طرح گرائے اس نے رونا شروع کر دیا۔

''میرے رب! مجھے کچھ نہیں چاہیے مجھے کوئی چیز نہیں چاہیے۔ مجھے صرف ریان حیدر چاہیے۔ مجھے ریان حیدر دے دو۔ مجھے صرف وہی چاہیے۔''

اسے یاد آیا بارہ سال پہلے اس نے ریان کے لیے بددعائیں کی تھیں اس کے بہتے آنسوؤں میں اور تیزی آ گئی تھی۔

☆☆☆

آواری سے گھر پہنچنے تک راستے میں وہ سات دفعہ ایکسیڈنٹ کرتے کرتے بچا تھا۔

پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے کافی دیر تک وہ اندر ہی بیٹھا رہا پھر بوجھل قدموں سے باہر نکل آیا۔ بارہ بجنے میں دو منٹ تھے اور دو منٹ بعد نیا سال شروع ہونا تھا۔

باورچی رمضان نے خوشی خوشی اس کے قریب آ کر اسے سلام کیا۔ وہ شاید ''نئی دلہن'' کی آمد کی توقع بھی کر رہا تھا۔

''میں اندر جا رہا ہوں اگر تم میں سے کوئی اندر آیا تو میں ٹانگیں توڑ کر ہاتھ میں تھما دوں گا۔'' سلام کا جواب دیے بغیر ہی وہ کرختگی سے کہتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آ گیا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور کرسٹل کا گل دان اٹھا کر زور سے زمین پر دے مارا۔ بے حد نرم و ملائم ایرانی قالین کے باوجود بھی وہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ شور کی آواز سن کر رمضان بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''ک......کیا ہوا صاب؟'' ٹوٹے ہوئے گلدان کو دیکھ کر حواس باختہ سا ہو کر پوچھنے لگا۔

''منع کیا تھا میں نے......نہیں آنا اندر......پھر؟ کیا تکلیف ہے تمہیں؟ دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔ گیٹ لاسٹ۔'' وہ اتنی زور سے دھاڑا کہ رمضان ڈر کے مارے کانپتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

کچھ دیر تک شہید ہونے والے کرسٹل واز کو دیکھنے کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ایئر فریشنرز اور گلاب کی پتیوں کی مسحور کن خوشبو دروازہ کھولتے ہی اس کے نتھنوں سے ٹکرائی اور اس کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر غصے اور طیش کے عالم میں سرخ گلاب کی لڑیوں کو توڑنا شروع کر دیا۔

اس نے کوٹ اتار کر وہیں بیڈ پر پھینک دیا اور شرٹ کے بٹن کھولنے لگا۔ شرٹ اور بنیان کو بھی اپنے جسم سے علیحدہ کرنے کے بعد وہ سائیڈ ٹیبل کے دراز میں سے نیند کی گولیاں ڈھونڈنے لگا مگر وہ اپنے پاس نیند کی گولیاں رکھتا ہی کب تھا؟

وہ اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر لاؤنج میں آ گیا۔ سرد ہوا کے جھونکے اس کے برہنہ سینے اور کمر سے ٹکرائے مگر اسے سردی نہیں لگ رہی تھی۔

وہ اوپر علی کے کمرے میں ہمیشہ کی طرح سلیپنگ پلز لینے گیا۔ کمرے میں انیہ کے کپڑے اور میک اپ کا سامان یونہی بکھرا پڑا تھا جسے وہ عجلت میں اندر رکھنا بھول گئی تھی۔

اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی پہلی دراز سے نیند کی گولیوں کی بالکل نئی شیشی نکالی۔

اس وقت وقتی طور پر ہی پرسکون ہونے کے لیے اسے نیند کی گولیوں کی اشد ضرورت تھی۔ وہ علی کے روم ریفریجریٹر کی جانب بڑھا اور اندر سے ایک عدد اورنج جوس کی ڈسپوزیبل بوتل نکال لی اور کمرے سے باہر آ گیا۔

باہر کھڑے کھڑے اس نے نیند کی ایک گولی نکالی اور جوس کے ساتھ نگل لی۔

''کیوں کر دیے میں نے نکاح نامے پر سائن؟'' گولی نگلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

''ہمیشہ ڈیڈ نے میرے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ علی کو ہمیشہ مجھ سے زیادہ پیار اور توجہ ملی۔ ہر بات میں اس کو فوقیت دی گئی۔'' اس کے ذہن میں صرف منفی خیالات کا ہجوم تھا۔

''اور مما......ان کو تو میں کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ انہوں نے مجھے اپنے دودھ سے محروم رکھا، جو میرا حق تھا اور ان کا فرض۔''

اس نے جوس کی بوتل ایک طرف رکھی اور آئینے میں موجود اپنے عکس پر نگاہ ڈالی۔
اس کی آنکھیں سرخ جبکہ چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔ اس ریان سے بالکل مختلف لگ رہا تھا جو ڈھائی گھنٹے پہلے اپنی شادی میں شرکت کرنے کے لیے علی کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔
چند ثانیے اپنے عکس پر نگاہیں مرکوز رکھنے کے بعد اس نے سر جھٹکنا چاہا مگر پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔
اس نے بے اختیار اپنی گردن پر ہاتھ رکھا۔
اس کو سانس کی پرابلم کبھی نہیں رہی تھی مگر اس وقت اسے لگا کہ اسے سانس بہ مشکل آ رہی ہو۔ کوئی اس کا گلا دبا رہا تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے گردن کو پکڑا اور سانس لینے کی کوشش کی مگر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ گھٹن بڑھتی چلی گئی۔ اس نے کھانسنا چاہا مگر اسے لگا کوئی اس کے پیٹ میں مکے رسید کر رہا ہو۔ اپنے بائیں ہاتھ کو جس میں اس نے گولیوں کی شیشی پکڑ رکھی تھی اپنے پیٹ پر رکھا مگر گولیوں کی شیشی کو دیکھ کر وہ گویا ساکت رہ گیا۔ علی کے کمرے سے شیشی لیتے وقت وہ بھری ہوئی تھی جب کہ اس وقت اس میں صرف دو موجود تھیں۔
اس نے بقیہ گولیاں کی تلاش میں اپنے قدموں کے اردگرد دیکھا مگر وہ وہاں نہیں تھیں اور تب اس پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام گولیاں نگل چکا ہے۔

☆☆☆

ان کو دشمن کے لشکر پر نگاہ رکھنے اور متوقع حملے سے بچنے کے لیے ایک ایسے مخبر کی ضرورت تھی جو دشمن کی فوجوں کی ان کی طرف پیش قدمی کی مخبری کر سکے۔ اس کام کے لیے ہدہد نے اپنی خدمات پیش کیں اور کہا۔
''اے سلیمان! میں زمین سے ہزاروں فٹ اوپر ہوا میں اڑتا ہوا بھی گھاس میں موجود ایک گندم کا دانہ دیکھ سکتا ہوں۔ میری تیز نگاہوں پر بھروسا کیجیے اور یہ کام میرے حوالے کر دیجیے۔
فطری حسد اور رقابت کی ماری چیونٹی نے فوراً جل کر کہا ''اے سلیمان! اس ہدہد سے پوچھیے کہ یہ ہزاروں فٹ نیچے موجود ننھا سا دانہ تو دیکھ سکتا ہے مگر اس کے اوپر بچھا شکاری کا جال کیوں نہیں دیکھ پاتا اور جال میں پھنس کیوں جاتا ہے؟''
حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ بات ہدہد سے دریافت کی تو اس نے کہا ''یہ چیونٹی ٹھیک کہتی ہے۔ واقعی میں گندم کا دانہ تو دیکھ پاتا ہوں مگر موٹے تاروں والا شکاری کا جال نہیں۔ اور اس جال میں پھنس جاتا ہوں مگر اے سلیمان! وہ میری تقدیر ہوتی ہے۔ جب میری موت آتی ہے تو قدرت مجھے اندھا کر دیتی ہے اور میں روزی کے حصول کے لیے دانے کی طرف لپک کر دراصل اپنی موت کے شکنجے میں پھنس جاتا ہوں کیوں کہ وہ میری تقدیر ہوتی ہے اور تقدیر اٹل ہے۔''
اور تقدیر واقعی اٹل ہے۔
وہ حیرت کے عالم میں ہاتھ میں پکڑی شیشی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے وہ گولیاں کب اور کیسے نگلیں اسے معلوم نہ تھا۔
گولیوں کی شیشی کو ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے اس نے سامنے پڑے فون کا ریسیور اٹھایا۔

آج تک زندگی میں جب بھی کوئی مسئلہ پیش آیا وہ ہمیشہ اپنی ماں سے یا پھر اللہ سے رجوع کرتا تھا۔
کانپتے ہاتھوں سے اس نے رانیہ کے موبائل کا نمبر گھمایا اور بیل کی آواز سننے لگا۔
''ہیلو'' رانیہ کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ جس کو زندگی ختم ہوتی دکھائی دے رہی تھی ایک دم پھر سے زندہ ہو گیا۔
''مما.... مما.... میں ریان....!'' وہ بہ مشکل بول رہا تھا۔ اس کا گلا بند ہو رہا تھا۔
''تمہارا باپ عزت کمانے میں چالیس سال لگاتا ہے اور تم اسے ڈبونے میں چالیس سیکنڈ بھی نہیں لگاتے ریان! گھر کیوں چلے گئے تم یوں شادی چھوڑ کر؟ دماغ خراب ہے تمہارا.... کیا سمجھا ہوا ہے تم نے زندگی کو.... پہلے تو تمہیں ریا (حاریہ) پر کوئی اعتراض نہ تھا، اب اچانک یہ اعتراضات کہاں سے نکل آئے ہیں؟'' ان کی غصیلی آواز سنائی دی تو اسے لگا وہ واقعی مرنے والا ہے۔
''مما....! پلیز ہیلپ.... می۔'' وہ رو دینے کو تھا۔
''فوراً واپس آؤ تم.... ہم لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے؟''
''مما.... !'' اس نے کہنا چاہا مگر سب بے کار تھا۔ وہ اس کی بات نہیں سنیں گی اسے معلوم تھا۔
اس نے ریسیور کریڈل پر رکھنا ہی چاہا تھا کہ وہ پھسل کر نیچے لٹک گیا۔ اس نے ریسور اٹھانے کی کوشش نہ کی بلکہ جوس کی بوتل اٹھا کر منہ سے لگا لی۔ ایک گھونٹ پینے کے بعد بھی اسے اپنی طبیعت مزید خراب لگی تو اس نے بوتل واپس رکھ کر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی حلق میں ڈال کر قے کرنے کی کوشش کی مگر قے نہ آئی۔
ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ سر بھاری بھاری ہو رہا تھا جب کہ ہر طرف گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔
اس نے سوچا کہ نوکروں کو بلا لے مگر ان کو تو وہ پہلے ہی منع کر چکا تھا پھر اس نے جوس کی بوتل اٹھائی جس میں بہ مشکل ایک دو گھونٹ ہی جوس بچا تھا اور منہ سے لگاتے ہوئے پیچھے ہٹا۔
اس نے دانہ دیکھا تھا، جال نہیں۔
پیچھے کی جانب ہٹتے ہوئے وہ یہ بھول گیا تھا کہ پیچھے ستائیس زینوں پر مشتمل سیڑھیوں کی گہرائی تھی۔
وہ سب سے اوپر والے زینے پر کھڑا تھا اور جس لمحے جوس پیتے ہوئے الٹے قدم چلا، اس کے قدم یک دم لڑکھڑائے دوا نے اس کے اعصابی نظام پر اس طرح حملہ کیا تھا کہ وہ سنبھل ہی نہ سکا۔
ریلنگ کو پکڑنے کے لیے جب ہاتھ بڑھائے تو وہ دونوں ہاتھوں میں بوتل اور شیشی ہونے کے باعث وہ ریلنگ پر گرفت نہ جما سکا اور نیچے کی جانب لڑھک گیا۔
ایک.... تین.... پانچ.... سات.... نو.... گیارہ.... بارہ.... اور پھر ستائیس....
جو پہلی چیز اوپر سے نیچے کی جانب گری تھی وہ نیند کی گولیوں کی وہ شیشی تھی جس میں محض دو گولیاں ہی بچی تھیں۔
جو دوسری چیز اوپر سے نیچے کی جانب گری تھی وہ جوس کی وہ بوتل تھی جس میں محض آدھا گھونٹ اورنج جوس

ہی رہ گیا تھا۔

اور جو تیسری اور آخری چیز بلندی...... بہت بلندی سے نیچے، پاتال کی پستی میں گری تھی وہ ریان عظیم حیدر کی زندگی تھی جس سے کئی اور لوگوں کی زندگیاں جڑی تھیں۔

وہ سر کے بل نیچے گرا تھا اور اپنے سر کے پچھلے سب سے نازک حصے سے نکلنے والے خون کا بہ خوبی احساس کرسکتا تھا۔ ہر گزرتے پل کے ساتھ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاتا جارہا تھا۔

ان رکتی، اکھڑتی سانسوں کے درمیان اس نے ہر اس شخص کو جس سے اس نے محبت کی تھی ڈیڈ، علی بیا، انیہ، ہیشم اور وہ انجان لڑکی سب کو بھلا کر صرف اور صرف اپنی ماں کو دل ہی دل میں پکارا تھا اور آنکھیں کھول کر منظر دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

اسے لاؤنج کی چھت پر لگا فانوس دکھائی دے رہا تھا اور جب اسے یقین سا ہوگیا کہ وہ اسے آخری دفعہ دیکھ رہا ہے اور شاید پھر کبھی نہ دیکھ سکے تو اس نے کلمہ پڑھنے کی کوشش کی تھی۔

کلمہ پڑھنے کے لیے جس وقت اس نے اپنا منہ کھولا اندر سے باہر آتے سفید جھاگ کے ریلے کے باعث وہ نہ اپنا منہ بند کرسکا اور نہ ہی کچھ پڑھ سکا۔ اور پھر جیسے ہر طرف اندھیرا چھا گیا اور اس نے آنکھیں موند لیں۔ بہت آہستہ سے اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

☆☆☆

''ریان کہاں ہے؟'' انیہ نے پہلی دفعہ اکیلی بیٹھی دلہن کو دیکھ کر ریان کی غیر حاضری کو محسوس کیا تھا۔

''گھر۔'' علی نے مختصراً جواب دیا۔

''وہ اس وقت گھر کیوں گیا ہے؟'' وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

''طبیعت صحیح نہیں تھی اس کی۔ میں سوچ رہا ہوں گھر جا کر اسے لے آؤں۔'' کچھ دیر بعد علی نے کہا۔

''میں چلوں تمہارے ساتھ؟'' انیہ نے فوراً کہا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے انیہ کا دل گھبرانے لگا۔

''علی! وہ ٹھیک تو تھا نا؟'' گاڑی اسٹارٹ کرتے علی سے اس نے کچھ پریشانی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' کار کو سڑک پر ڈالتے ہوئے اس نے بے نیازی سے کہا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' کسی نادیدہ خوف و خدشے کو زبان پر لاتے ہوئے وہ بولی۔

''کیوں؟'' اسے حیرانی ہوئی۔

''پتا نہیں۔'' انیہ الجھتے ہوئے بولی۔

پھر سارا راستہ دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ گھر کے دروازے پر ہی رمضان سے ملاقات ہوگئی۔

''ریان کہاں ہے؟'' انیہ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''وہ اندر ہیں جی۔ بیٹھے توڑ پھوڑ کر رہے ہیں۔'' رمضان پریشانی سے بتانے لگا۔ ''پہلے وہ شیشے کا پیالہ توڑ

دیا، میں اندر گیا تو مجھے ڈانٹنے لگ گئے کہ اب نہیں آنا۔ نہیں (نہیں) گیا۔ ابھی کافی دیر پہلے پھر کچھ توڑا ہے مگر میں اندر نہیں گیا۔''

انیہ اور علی تیزی سے اندر گئے۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی علی تو بغیر کہیں اور دیکھے ریان کے کمرے کی جانب بڑھ گیا جب کہ انیہ وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

اس کا رخ ریان کے کمرے کی جانب تھا۔ جوتے اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی ہمیشہ کی طرح اتار دیئے تھے اور اب ننگے پاؤں قالین پر کھڑی تھی۔

اس نے فطرت یا عادت سے مجبور ہو کر اپنی شال قالین پر گھسٹا پلو اٹھایا آہستگی سے جھاڑنا چاہا مگر یک دم ٹھہری گئی۔

یہ کیا؟ اس کی شال کے سرے پر خون کا دھبا موجود تھا۔

خون اور اس کے کپڑوں پر؟ کیوں؟

اور پھر، یک دم شال اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ کرنٹ کھا کر وہ مڑی اور پیچھے موجود منظر کو دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

بائیں جانب والے اسٹیئر کیس کے آگے، بالکل سامنے ایک ٹوٹی ہوئی بوتل، ایک ٹوٹی ہوئی شیشی اور چند قدم آگے ایک ٹکڑوں میں بکھرے کرسٹل واز کے قریب ہی اس کے بھائی کا سرد، نیلا پڑتا جسم پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون اور منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ خون کی ندی انیہ کے قدموں کے قریب ہی بہہ رہی تھی جس کے باعث اس کی شال خون آلود ہوئی تھی۔

چند لمحے تو وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے جوان بھائی کا خون میں لت پت وجود دیکھتی رہی پھر جیسے حواس جاگے تو اس نے زور زور سے ہذیانی انداز میں چلانا شروع کر دیا۔

علی جو ریان کے کمرے میں ٹوٹی، بکھری ہوئی گلاب کی لڑیاں دیکھ رہا تھا بھاگتا ہوا لاؤنج میں داخل ہوا۔

علی کو اپنے مختل حواسوں پر قابو پانے میں تھوڑا سا وقت لگا تھا اور جب ذہن نے ناقابل قبول منظر کو قبول کرنا شروع کیا تو وہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچا۔

''ریان......ریان......!''

علی نے اس کے ناک کے قریب ہاتھ لے جا کر اس کا تنفس چیک کرنے کی کوشش کی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔

☆☆☆

پچھلے سات گھنٹوں سے وہ اسی طرح، زانیہ کے کندھے پر سر رکھے بے آواز آنسوؤں کے ساتھ رو رہی تھی۔

تین گھنٹے پہلے ڈاکٹرز نے بتایا تھا کہ اس کا معدہ صاف کر دیا گیا ہے۔ اس کو یہ جان کر جھٹکا لگا تھا کہ ریان نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔

رانیہ اس کی طرح بے بسی سے آنسو نہیں بہا رہی تھیں۔ وہ بالکل خاموشی سے آنکھیں موندے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ ان کے لب مسلسل ہل رہے تھے۔

ہسپتال کے در و دیوار اتنے خاموش تھے کہ ان میں گونجنے والی انیہ کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

حارث یہ رخصت ہو کر ان کے گھر نہیں آئی تھی۔ رخصتی سے پہلے ہی ریان کے ہسپتال پہنچ جانے کی اطلاع میرج ہال پہنچ گئی تھی جس پر تمام پروگرامز منسوخ ہو گئے تھے وہ ابھی تک ہسپتال نہیں آئی تھی۔ داؤد ملک آئے تھے اور کافی دیر بیٹھنے کے بعد تسلی دے کر چلے گئے۔

ریان کی حالت بقول ڈاکٹرز کے ابھی تک خطرے میں تھی۔ وہ زندہ بچتا ہے یا نہیں اس بات کا انحصار اگلے چند گھنٹوں پر تھا اور ان سب کے لیے یہ وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔

یکم جنوری کی شام ساڑھے پانچ بجے ڈاکٹرز نے بتایا کہ وہ خطرے سے باہر آ گیا ہے۔ مگر وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ اسے آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا اور اس کو دیکھنے کی اجازت مل گئی۔

اس کا چہرہ زرد تھا اور وجود بالکل ساکن جیسے کوئی لاش ہو۔ انیہ کو بے اختیار رونا آ گیا تھا۔

''اسے کب ہوش آئے گا؟'' علی نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''ان شاء اللہ بارہ گھنٹوں کے اندر اندر۔'' ڈاکٹر نے تسلی دی تو وہ سب گویا مطمئن سے ہو گئے۔

پھر بارہ گھنٹے گزر گئے، چوبیس گھنٹے گزر گئے، 36 گھنٹے بھی گزر گئے تو انیہ آن ڈیوٹی ڈاکٹر سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہ تو ڈاکٹر طاہر بتائیں گے۔''

صبح ڈاکٹر طاہر نے ریان کو ایک بڑے ہسپتال میں شفٹ کرنے کو کہا تو وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ ''ریان کب اٹھے گا؟''

''جلد...... بہت جلد۔'' انہوں نے نرمی سے کہا۔ ''مگر میں حتمی وقت نہیں بتا سکتا۔''

''کیوں؟'' وہ ہراساں ہوئی۔

''کیونکہ وہ کومے میں چلا گیا ہے۔'' انہوں نے گویا اس کے سر پر بم پھوڑا تھا۔

''تو یہ کب کومے سے نکلے گا؟'' ایک ایک لفظ بہ دقت اس کے منہ سے نکلا تھا۔

''مسز علی! آپ کو پتا ہے کوما کیا ہوتا ہے؟''

اس نے نفی میں دھیرے سے گردن ہلا دی۔ کومے کے متعلق اس کی معلومات محض فلموں، ڈراموں یا کتابوں میں کسی کردار کے اس کا شکار ہونے تک محدود تھیں۔

''کوما دراصل ایک ایسی بے ہوشی کا نام ہے جس میں آپ کے تمام حواس ختم ہو جاتے ہیں۔ دماغ اور جلد میں بڑا فرق ہوتا ہے ہماری جلد پر چوٹ لگے تو وہ ٹھیک ہو جاتی ہے لیکن اگر دماغ کا کوئی حصہ damage ہو جائے تو وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ شاید ہو بھی جائے۔ یہ منحصر ہے اس پر کہ چوٹ یا زخم کتنا severe (شدید) تھا، اگر nerves

میں clotting ہو جائے یا کسی چوٹ کی وجہ سے nerves سوج جائیں تو ہم سوجن ختم کرنے کو دوائیں دیتے ہیں یا بعض اوقات دماغ کے اندر ہی bleeding ہو جاتی ہے جس سے انسان کی senses پر اثر پڑتا ہے۔ کوما بلی پی ہائی ہونے کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔

"تو اس کی کیا ہر sense ختم ہو جائے گی؟"

"میں نے کہا نا depend کرتا ہے اگر دماغ کا پچھلا حصہ متاثر ہوتا ہے تو نظر ختم یا کم ہو جاتی ہے۔ ماتھے پر سخت قسم کی چوٹ آنے سے یادداشت چلی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر چوٹ سخت قسم کی آئی ہے تو sense بالکل ختم ہو جائے گی تھوڑی ہلکی ہے تو بالکل زائل ہونے کی بجائے کچھ نہ کچھ رہے گی۔ ساری بات چوٹ کی شدت پر انحصار کرتی ہے۔"

"ریان کا کیس کیسا ہے؟" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ریان......! معلوم نہیں.....مگر ابھی اس کا سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی ہوگا۔ تب ہی اصل صورت حال معلوم ہوگی۔"

"کیا یہ کومے میں ہماری باتیں سن سکے گا؟"

"نہیں، نہیں، کومے میں بندہ کچھ نہیں سنتا عموماً۔"

"مگر میں نے تو فلموں میں دیکھا ہے کہ کومے کے مریض اپنے عزیز و اقارب کی باتیں سن رہے ہوتے ہیں۔" انیہ نے حیرانی سے کہا۔

"فلمیں اور ڈرامے حقیقت نہیں ہوتے اور آپ میری بات سمجھ نہیں رہیں۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ کچھ نہیں سنے گا۔ عموماً مریض کچھ نہیں سنتے مگر یہ سب چوٹ کی شدت پر منحصر ہے، ہوسکتا ہے اس کے دماغ کا مرکزی حصہ متاثر نہ ہوا ہو اور وہ باتیں سن لے مگر سننا ایک بات ہے اور سمجھنا دوسری۔"

"تو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وہ بات سمجھ رہا ہے؟"

"اگر اس کی تمام senses ختم ہوگئی ہیں تب تو وہ express نہیں کر سکے گا لیکن ہوسکتا ہے وہ آنسوؤں کے ذریعے اظہار کرے۔ میں نے کومے کے مریضوں کو سورۃ الرحمٰن سُن کر روتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ اس کے ہاتھ پر چٹکی لیں وہ فوراً ہلکا سا سسک کر اظہار کرے گا۔"

"ریان کرے گا؟"

"یہ تو اس کے ایم آر آئی کے بعد معلوم ہوگا کہ اس کی چوٹ کتنی Severe تھی۔" ڈاکٹر طاہر نے کوئی چھٹی دفعہ وہی بات دہرائی۔

"ڈاکٹر صاحب! کومے میں جانے کے بعد best کیا ہوتا ہے اور worst کیا ہوتا ہے؟" اس نے مدہم آواز میں پوچھا۔

"best یہ ہے کہ وہ چند دنوں میں ہوش میں آجائے اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہو worse یہ ہے کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد اپنی یادداشت یا کوئی اور حس یا ایک سے زیادہ حس کھو بیٹھے یعنی معذور ہو جائے اور worst یہ ہے

کہ اس کی ڈیتھ کومے میں ہی ہو جائے۔"

"مگر یادداشت تو واپس آجاتی ہے میرا مطلب ہے اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ یادداشت کھوئے شخص کو پرانی تمام باتیں یاد آجاتی ہیں۔"

"اکثر ہم کہاں دیکھتے ہیں؟ فلموں میں؟ تو بیٹا فلمیں فلمیں ہی ہوتی ہیں۔ اس طرح کسی کی یادداشت واپس نہیں آتی۔ اگر ایک ڈاکٹر مریض کو دیکھ کر اپنے تجربے اور علم کی بنا پر کہتا ہے کہ یہ کومے سے نہیں نکل سکے گا یا اپنی کھوئی ہوئی Sense کو regain نہیں کر سکے گا اور وہ مریض کسی دوسرے ڈاکٹر کے زیر علاج رہ کر ٹھیک ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلا ڈاکٹر جاہل تھا یا اسے اتنا پتا نہیں تھا۔ یہ معجزہ ہوگا اور میڈیکل سائنس معجزوں سے انکار نہیں کرتی۔ ہم آپ کو اپنے تجربات کی بنا پر بتاتے ہیں کہ یہ شخص ٹھیک ہو سکے گا یا نہیں۔"

"مگر ریان تو ٹھیک ہو جائے گا نا؟"

"آپ کو تسلی چاہیے یا سچ سننا ہے؟"

"سچ سننا ہے۔" وہ سادگی سے بولی۔

"بہت مشکل ہے۔ اگر وہ چند مہینوں یا سالوں میں ہوش میں آبھی جاتا ہے تب بھی میرا اپنا اندازہ ہے کہ وہ شاید معذور ہو جائے مگر معجزے اسی دنیا میں ہی ہوتے ہیں۔ آپ بس دعا کریں۔" انہوں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"آپ نے اتنی مشکل زبان بولی کہ آدھا تو میرے سر سے گزر گیا۔ آپ کومے کو صرف ایک فقرے میں Define کر دیں۔" انیہ نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

ڈاکٹر طاہر نے ایک سرد آہ بھری اور ترحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے

"A dark and silent grave"

☆☆☆

نیم مردہ ریان کو تین جنوری کی سرد شام میں آغا خان ہسپتال شفٹ کر دیا گیا۔

اس کے دماغ کا پچھلا حصہ اور spinal cord سب سے زیادہ متاثر ہونے کے باعث اس کا جسم مفلوج ہو گیا تھا۔

ریان کو آئی سی یو میں شفٹ کر دینے کے بعد اس کی ٹریٹمنٹ شروع ہوئی۔

فزیوتھراپسٹ ہر ایک گھنٹے بعد نرسوں کے ذریعے بے حس وحرکت پڑے ریان کی کروٹ بدلواتا تھا اگر کافی دیر مریض ایک ہی کروٹ میں لیٹا رہے تو جسم کا وہ حصہ جو بستر سے لگا ہوتا ہے اس کا source بستر بن جاتا ہے اور اس حصے (مثلاً کمر) کی جلد اترنا شروع ہو جاتی ہے یا وہ گلنے لگتا ہے۔

اس کے دانت صاف کرنا، بال برش کرنا، شیو کرنا، ناخن کترنا، یہ سب اسٹاف کی ذمہ داری تھی۔

اس کی فیملی کو ڈاکٹرز نے اس کے پاس بیٹھنے اور اس سے باتیں کرنے کی تاکید کی تھی۔

چار جنوری کی شام کو رانیہ جو پچھلے چار دنوں میں گھر نہیں گئی تھیں آئی سی یو میں ایک کرسی پر بیٹھی اپنے بیٹے کو

دیکھ رہی تھیں۔

یہ وہ ''ریسٹ لیس روئی'' تھا جسے پورا پاکستان سب سے زیادہ ایکٹو کپتان کہتا تھا۔ آج وہ ایکٹو کپتان کیوں اس طرح ان ایکٹو ہوکر پڑا تھا؟

دروازہ کھلنے کی آواز پر انہوں نے گردن موڑ کر اندر داخل ہونے والے عظیم کو دیکھا جن کی کمر جھکی ہوئی تھی اور چہرے سے تھکن عیاں تھی۔

ایک پچاس ساٹھ سالہ بوڑھا باپ جس کے جنازے کو بیٹوں نے سہارا دینا تھا، اپنے بیٹے کی جوان اور زندہ میت دیکھ رہے تھے۔

رانیہ ان چار دنوں میں عظیم کے سامنے نہیں روئی تھیں مگر اس وقت اپنے شوہر کو دیکھ کر ان کا ضبط جواب دے گیا۔

''عظیم......!'' انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''یہ بستر پر لیٹا شخص میرا بیٹا نہیں ہوسکتا۔ وہ تو بہت دیر بستر پر لیٹ نہیں سکتا تھا۔ وہ تو کہتا تھا مما! میری کمر دیر تک سونے سے درد کرتی ہے پھر یہ کیوں اس طرح چار دنوں سے ہے۔ اس سے کہو، یہ آنکھیں کھولے۔ اس کو اس کی وہ ماں بلا رہی ہے، جس سے یہ بے حد محبت کرتا ہے اور ساری عمر میرا بیٹا سمجھتا رہا، اس کی ماں کو اس سے محبت نہیں ہے۔ تم ایک دفعہ اٹھو تو سہی، میں تمہیں بتاؤں کہ میں نے تم سے کتنی محبت کی ہے۔'' وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

''عظیم! یہ میری بات سن رہا ہے نا؟'' انہوں نے گویا ان سے تائید چاہی تھی۔

''معلوم نہیں۔'' انہوں نے بہ مشکل خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''کہتا تھا، مما جب میں مر جاؤں تو آپ میری لاش کو کافی دیر تک دیکھتی رہنا۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹا اچھا لگوں گا نا؟ نہیں ریان! تم اس طرح لیٹے بالکل بھی اچھے نہیں لگتے۔ تم کہتے تھے نا کہ تمہاری ماں کتنی جوان ہے...... بیٹا! آج تمہاری ماں بوڑھی ہوگئی ہے اور ایک بوڑھی ماں اپنے جوان بیٹے کا جنازہ نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ بکھرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

گیارہ جنوری کی صبح سات بجکر دو منٹ پر ریان حیدر کے ای سی جی پر سیدھی لائن آنے لگی۔ اس کے دل کی دھڑکن بند ہونے لگی تھی۔

ایمر جنسی میں آئے ڈاکٹر نے جلدی سے اسے بجلی کے جھٹکے دینے شروع کیے۔ ہر شاک کے ساتھ اس کا بے ہوش جسم ایک انچ اوپر اچھلتا تھا اور اس کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز آتی تھی مگر اس کے چہرے سے تکلیف کے آثار نمایاں نہ ہونے کا مطلب تھا کہ وہ کچھ بھی محسوس نہیں کر سکتا۔

سات بج کر پندرہ منٹ پر اس کی دھڑکن بحال ہوگئی۔ آئی سی یو سے نکلتے ڈاکٹر نے بستر پر بے حس و حرکت جواں سال مرد کی جانب جن ملال بھری نگاہوں سے دیکھا تھا اگر وہ دیکھ پاتا تو شاید وہیں مر جاتا۔

اور پھر سات بجکر بیس منٹ پر ریان حیدر کا دماغ آہستہ آہستہ بیدار ہونا شروع ہوا۔

☆☆☆

وہ نہیں جانتا تھا وہ کون ہے، کہاں ہے اور کیوں ہے؟ اسے بس ایک شے کا احساس تھا کہ اس کے ہر طرف تاریکی ہے۔

اس نے اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر اسے لگا، اس کی آنکھیں وہاں نہیں ہیں۔ اپنا جسم اس کو محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ گردن سے نیچے یوں تھا جیسے کسی نے دھڑ کاٹ ڈالا ہو۔ ہاتھ، بازو، ٹانگیں، اس نے باری باری ایک عضو کو ہلانے کی کوشش کی مگر وہاں کچھ نہ تھا۔

وہ دیکھ نہیں سکتا تھا، ہل نہیں سکتا تھا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر نہ تو اس کے لب ہلے، نہ ہی زبان نے حرکت کی۔

وہ مفلوج ہو چکا تھا، اندھا ہو چکا تھا، گونگا ہو چکا تھا۔ اس نے فضا میں رچی بسی کسی بھی خوشبو کو سونگھنا چاہا مگر نتھنوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ جب اسے اپنی ہر حس ختم ہوتی محسوس ہوئی تو اس نے سننا چاہا مگر ہر طرف سناٹا تھا۔ کوئی آہٹ، کوئی آواز، کوئی چاپ اس کی سماعتوں سے نہ ٹکرائی۔

اسے لگا وہ قبر میں ہے جہاں اسے اپنی بھی خبر نہیں۔ اس کو اپنا آپ بھی بھول چکا تھا۔ وہ اس سناٹے اور تاریکی میں کیوں دھکیلا گیا ہے، وہ نہیں جانتا تھا۔

اس اندھیرے اور خاموشی میں اسے اپنا آپ پہچاننا تھا مگر اس کے ذہن میں اس حوالے سے کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے وہ خود کو یاد کر لیتا۔ اسے لگا وہ کسی بلیک ہول میں پہنچ گیا ہے۔

''Black holes aint so black'' اس کی سماعت سے فقرہ ٹکرایا تھا۔ کوئی اس کے آس پاس موجود ہے، کوئی بول رہا ہے؟ اس نے سننے کی کوشش کی مگر وہاں کوئی آواز نہ تھی یہ آواز جو اس نے سنی تھی، اسے یاد آیا، اس کے کان میں نہیں دماغ میں گونجی تھی۔ وہ جملہ اس سے اب نہیں بہت پہلے کہا گیا تھا، کس نے کہا تھا؟

اس کے دماغ میں ایک منظر بن رہا تھا۔ سیاہ سوٹ پہ اورنج ٹائی کے ساتھ چشمہ لگائے ایک ادھیڑ عمر شخص۔ وہ اس کو نہ پہچان پاتا اگر وہ اورنج ٹائی اسے یاد نہ آجاتی۔

وہ مضحکہ خیز اورنج ٹائی پروفیسر ملر لگاتا تھا۔ اس کا فزکس کا پروفیسر، پروفیسر ملر نے ہی انہیں ''بلیک ہولز'' پڑھائے تھے مگر وہ ''خود'' کون تھا؟

جس وقت پروفیسر ملر لیکچر دے رہا تھا اس کے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس لڑکی کے بے حد لمبے اور سیدھے بالوں میں تین شیڈز آتے تھے اور اس کا نام میری این فیونا کیلتھروپ تھا مگر وہ اس کو کسی اور نام سے پکارتا تھا۔ میرٹی این نہیں......وہ......وہ......اسے......میرین کہتا تھا لیکن وہ brunette کون تھی؟ اس کی دوست اور کزن۔

کزن؟ ہاں، وہ اس کی کزن تھی اور ایک اور کزن بھی تھی اس کی۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں اور بال لائٹ براؤن۔ وہ اس سے چھوٹی تھی اور......اور......اس کا نام......؟ اسے یاد نہ آسکا۔

اس نے دوبارہ پروفیسر ملر کو یاد کرنے کی کوشش کی مگر وہ شبیہہ جو کچھ دیر پہلے اس کے ذہن میں ابھری تھی اب معدوم ہو چکی تھی لیکن اسے میرین یاد آ گئی تھی اور پھر اسے ماں یاد آئی اور گویا سب کچھ یاد آ گیا۔

اس کا نام ریان عظیم حیدر تھا۔ اس کے باپ کا نام عظیم احمد اور دادا کا نام حیدر تھا۔

اس کا باپ بے حد امیر آدمی تھا۔ اس نے بہت بچپن میں اپنے ڈیڈ کے ساتھ ان کے بھائی ''ذوالفقار'' کو دیکھا تھا جنہیں سب زلفی کہتے تھے۔ اسے یاد آیا وہ سبز آنکھوں والی لڑکی اس کے چچا زلفی کی بیٹی تھی۔ اس کا نام انیہ تھا اور اس کے چچا کی ڈیتھ کے بعد اسے اس کے ڈیڈ نے پالا تھا۔

اسے مما یاد آئیں، اسے علی یاد آیا۔ اسے بیا یاد آئی تھی اسے ہیثم نہ یاد آسکا۔

ہیثم، ریان سے تیرہ برس چھوٹا تھا اور ریان ابھی خود کو بارہ سالہ لڑکا سمجھ رہا تھا جو پیرس کے ایک اسکول میں پڑھتا تھا۔

گیارہ سے تیرہ جنوری تک اسے اپنی زندگی کے اولین بارہ برس ہی یاد آسکے تھے۔ باقی اٹھارہ سال گویا اس کے ذہن کے پردے سے مٹ چکے تھے۔

☆☆☆

چودہ جنوری کی شام چار بج کر باؤن منٹ پر ریان کے دماغ کے کام کرنے کی رفتار پہلے سے کچھ زیادہ تیز ہوگئی۔ ماتھے پر کوئی چوٹ نہ کھانے کی وجہ سے اس کی یادداشت وقتی طور پر گئی تھی مگر آہستہ آہستہ اسے پرانی باتیں یاد آرہی تھیں۔

وہ اپنے ملک کی کرکٹ کا کپتان ہے مگر وہ کرکٹر کیسے بنا؟ اس نے آغاز سے یاد کرنا شروع کیا۔

وہ پیرس میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش نو ستمبر تھی اور اکثر مذاق سے لوگ اس کو 'ورگو' (Virgo) ہونے کے ناتے ورجن (کنوارہ) کہہ کر چھیڑتے۔

تاریک سناٹے میں اسے بہت کچھ یاد آرہا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ خود کو پہچان رہا تھا انیہ اور برمنگھم میں ملنے والی عائشہ کی باتوں کی وجہ سے پاکستان پلٹ کر آنا، انڈس ویلی سے گریجویشن کرنا، حبیب بینک کے لیے کھیلنا، اسے سب کچھ بہت یاد آیا تھا۔

نیشنل ٹیم کے لیے سلیکٹ ہونا، پہلی گیند پر وکٹ لینا، پہلا آٹوگراف دیتے وقت فون نمبر دینے سے انکار کرنا، ایک میچ میں جارحانہ بیٹنگ کے باوجود بھی دو تین رنز سے ہار جانا، اسے وہ سب کچھ بہت یاد آیا تھا۔

انٹرنیشنل ٹورز، کپتانی، انجریز مگر ایک عجیب سے احساس نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ قبر میں ہے، مر چکا ہے۔

جب پہلی دفعہ اس کا دماغ جاگا تھا، اس نے اٹھنے، دیکھنے اور بولنے کی سعی کرنے کے بعد سونگھنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت اس کی یہ حس کام نہیں کر رہی تھی۔

مگر اب کر رہی تھی۔ اسے بہت دھیمی دھیمی خوشبو آرہی تھی۔ وہ سونگھ سکتا تھا مگر اس خوشبو کی شناخت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ چاولوں کی خوشبو تھی۔

پھر ایک اور خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی اور وہ ایک لمحے میں پہچان گیا۔

وہ dunhill کی مہک تھی اور یہ پرفیوم علی کثرت سے لگاتا تھا۔ مگر وہ تو مر چکا تھا۔ پھر علی اس کے ساتھ.....؟
وہ سونگھ سکتا تھا یعنی وہ زندہ تھا لیکن زندہ ہونے کے باوجود وہ اپنی دیگر حسیات کا استعمال کیوں نہیں کر سکتا؟
اسے صرف اپنی گردن کے اوپر والا حصہ ''محسوس'' ہو رہا تھا۔ نیچے شاید کچھ بھی نہ تھا۔
اسے یاد آیا اس کی شادی ہو رہی تھی اور وہ سیڑھیوں سے گر گیا تھا۔ وہ شادی چھوڑ کر گھر کیوں روانہ ہوا تھا؟
اسے اتنی باریکیاں یاد نہ آئیں۔

☆☆☆

اپنی قوت شامہ کی واپسی کے بعد وہ اور اس کا دماغ گویا ایک دفعہ پھر نیند کی سی کیفیت میں چلا گیا۔
سولہ جنوری رات آٹھ بج کر سترہ منٹ پر اس کا ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہوا۔ سب سے پہلے اس کے نتھنوں سے ''Fluid'' کی خوشبو ٹکرائی۔ یہ پیا اور مما لگاتی تھیں لیکن اس دفعہ صرف خوشبو نہیں تھی بلکہ اسے ایک آواز بھی آ رہی تھی البتہ وہ اس کو سمجھ نہ پا رہا تھا۔
وہ آواز شروع میں بے حد ہلکی تھی مگر جیسے جیسے وہ اونچی ہوتی گئی اسے اپنے نیچے موجود بیڈ محسوس ہوتا گیا۔
پہلے اسے لگا بیڈ صرف اس کے پاؤں کے نیچے ہے، پھر ہولے ہولے، اسے اپنی ٹانگیں، کمر اور باقی جسم سوائے ہاتھ اور بازوؤں کے محسوس ہوا۔
اس آواز میں ایک طلسم تھا، ایک عجیب سحر تھا۔ وہ ابھی تک اس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی مگر وہ اس کو سن رہا تھا۔
اس کو اپنا آپ ''زندہ'' لگ رہا تھا۔ اپنے جسم کے ساتھ جوڑی گئی ٹیوبز اسے محسوس ہو رہی تھیں۔
اس آواز کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے لگا وہ آواز اس کو پکار رہی ہے۔

☆☆☆

سترہ جنوری کی دوپہر ٹھیک دو بجے اسے پھر ہوش سا آیا تھا جبہ وہی آواز تھی مگر اس دفعہ وہ اسے پہچان گیا تھا۔ وہ سورۃ الرحمٰن کی تلاوت و ترجمہ تھا۔
''زمین پر جتنے ہیں، سب کو فنا ہے اور باقی ہے تمہارے رب کی ذات عظمت اور بزرگی والا۔ تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔''
اس زمین پر موجود ہر شے کو فنا ہے، ہر عروج کو زوال ہے۔ میں، ریان حیدر، جو کرکٹ کی دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا جس کے متعلق ''جو ریان کہتا ہے ٹھیک کہتا ہے'' کہا جاتا تھا، آج کیوں اس طرح پڑا ہوں کہ مجھے اپنی ہی خبر نہیں؟
ہم جتنے آزاد اور خود مختار بن جائیں، ہم صرف اسی کے محتاج ہی رہیں گے، ہماری خود مختاری اس کے اختیارات کے آگے کوئی معانی نہیں رکھتی۔ وہ ہم سے ہر کام کرواتا ہے۔ ہم اس پر انحصار کرتے ہیں، ہم مجبور و معذور ہیں۔ ہم مفلوج ہیں۔
''اے جن و انسان کے گروہ! اگر تم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ، تو نکل جاؤ۔ جہاں نکل کر جاؤ گے، اسی کی سلطنت ہے۔ تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ عمر پر چھوڑ دی

جائے گی بے دھوئیں کی آگ کی لپٹ اور بے لپٹ کا کالا دھواں تو پھر بدلہ نہ لے سکو گے۔ تو تم اپنے رب کی کون کون کی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟"

میں، ریان عظیم حیدر جو اپنے سے پنگا لینے والے ہر شخص سے انتقام لینا اپنا فرض سمجھتا تھا، آج اپنی تباہی و بربادی کا بدلہ کس سے لوں گا؟ ان نیند کی گولیوں سے جو میں نے علی کے کمرے سے لی تھیں، ان سیڑھیوں سے جنہوں نے مجھے گرایا تھا یا اس اللہ سے جس نے مجھ سے وہ گولیاں نگلوائی تھیں ان ستائیس زینوں کو حکم دے کر مجھے نیچے پٹخا تھا؟

آج تم کس سے بدلہ لو گے ریان حیدر؟ آج تو تمہارے زوال کا سبب صرف اللہ ہے، وہ اللہ جس نے تمہیں ابھی تک زندہ رکھا ہوا ہے جس نے تمہیں گرانے کے باوجود تمہیں مارا نہیں ہے جو ابھی تک تمہیں رزق پہنچا رہا ہے، جو اس اندھیرے میں تمہارے ساتھ ہے جو تمہیں کبھی مشکل میں تنہا نہیں چھوڑے گا۔

تلاوت کی آواز آنا اب بند ہو چکی تھی مگر اس بار اس کے دماغ نے کام کرنا بند نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

انیس جنوری کو پہلی دفعہ ریان نے رانیہ کے چٹکی کاٹنے پر سسکاری لی۔ پھر اسی رات اس نے اپنی بیماری کے بعد پہلی بار اپنی ماں کی آواز سنی۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ اس کے قریب ہی ہیں۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر مسلسل بول رہی تھیں۔

"غزالہ کو کہنا کہ آئندہ یاد سے ہیشم کے کپڑے رات کو ہی پریس کر کے رکھے۔ جوتے اور ٹائی وغیرہ بھی رات کو ہی سیٹ کر کے رکھے۔ تم اس کو خود تیار کروانا۔ وہ بہت لاپروا ہے اور ناشتہ کروائے بغیر نہ جانے دینا۔ علی ناشتہ کر کے جاتا ہے؟"

وہ کسی سے مخاطب تھیں، اسے سمجھ میں نہ آیا کہ اس کمرے میں موجود دوسرا شخص کون ہے؟ اس نے سونگھنے کی کوشش کی۔

"اکساڈ!" انیہ کا پرفیوم۔

"کہاں؟ صبح صبح ہی نکل جاتا ہے آفس۔ دراصل ڈیڈ کے دوپہر میں ادھر ہاسپٹل آنے کی وجہ سے سارا کام اسے ہی سنبھالنا ہوتا ہے۔ رات کو یہاں سے گھر واپس آتا ہے تو رات دیر تک کام کرتا رہتا ہے۔ کہتا ہے کام کا لوڈ بہت زیادہ ہو گیا ہے۔" انیہ کی وضاحت کرتی آواز اسے سنائی دی۔ اس کی بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہسپتال میں ہے مگر اسے ہوا کیا ہے؟

"دوپہر کو کھانا ٹھیک سے کھاتا ہے؟" مما کی آواز میں پریشانی تھی۔ اسے یاد آیا، مما علی سے سب سے زیادہ پیار کرنے کی وجہ سے اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی تھیں۔

"غزالہ کہہ رہی تھی، کھاتا ہے۔" انیہ نے نوکرانی کا نام لیا۔ "لیکن رات کو صرف دودھ پی کر سوتا ہے۔"

"بیٹا! خیال رکھا کرو اس کی صحت کا۔" مما کے لہجے سے فکرمندی چھلک رہی تھی۔

"آپ ہی کہیں مما! ریان کی بیماری کے بعد سے آپ ایک دفعہ بھی گھر نہیں گئیں۔ آپ ایسا کریں، آج گھر چلی جائیں۔ رات میں رک جاؤں گی اس کے پاس۔"

''بیٹا! اگر میرے پیچھے وہ کومے سے نکل کر ہوش میں آ گیا، تو ماں کو نہ پا کر پریشان ہوگا۔ جب یہ چھوٹا تھا تو اگر رات کو کبھی جاگ جاتا اور مجھے نہ پاتا تو فوراً پریشان ہو کر ڈھونڈنے نکل پڑتا۔'' اسے لگا مما رو رہی ہیں۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا ریان؟''

وہ اب اسے پکار رہی تھیں۔ وہ جواب دینا چاہتا تھا مگر......

''مما مجھے نہیں لگتا، یہ سن رہا ہے۔'' انیہ نے تاسف سے کہا۔

''یہ سن رہا ہے اور مجھے پتا ہے کہ یہ پرسوں سے سننے کے قابل ہوا ہے۔ پچھلے 19 دنوں سے یہ نہیں سن رہا تھا مگر آج سن رہا ہے۔'' انہوں نے اتنے یقین سے کہا تو ریان کا دل کیا کہ وہ رو پڑے۔

''ڈاکٹرز کہتے ہیں میرا بیٹا آنسوؤں کے ذریعے ضرور اظہار کرے گا مگر پتا ہے انیہ ریان کبھی نہیں روتا تھا۔ میں نے آج تک اس کی آنکھوں میں آنسو گرتے نہیں دیکھے۔ میرا بچہ بہت صبر والا ہے۔ یہ اتنی بڑی مصیبت اور آزمائش پر بھی نہیں روئے گا۔ تم دیکھنا انیہ یہ نہیں روئے گا۔''

''مما......!'' انیہ نے ریان کی جانب اشارہ کر کے ماں کو اس طرف دیکھنے کو کہا۔ انہوں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا مگر اس کی بند آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔

☆☆☆

بیس جنوری کی رات کرسی پر بیٹھی رانیہ اپنے جواں سال خوب صورت بیٹے کو بستر پر زندہ لاش بنے دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کے بچپن میں کھو سی گئی۔ ریان ان کے تمام بچوں میں واحد ایسا تھا جسے صبر کرنا نہیں آتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی بے چین طبیعت کا مالک تھا۔ البتہ ایک بات رانیہ کو ہمیشہ حیران کرتی تھی۔ ریان روتا نہیں تھا۔ صبر اور برداشت کا عنصر نہ ہونے کے باوجود بھی وہ بہت بہت کم رویا تھا۔

اس کی پیدائش کے بعد رانیہ سخت بیمار پڑ گئی تھی اور انہوں نے علی اور ریان کو اپنی دیورانی (انیہ کی ماں) کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کو ٹھیک ہونے میں کافی عرصہ لگا تھا اور جب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو کر اپنے بچوں کو سنبھالنے کے قابل ہوئیں تو انہیں علم ہوا کہ ریان دو برس کا ہونے کے باوجود بھی نہیں بولتا۔

پھر ایک دفعہ ان کی دیورانی ریان کو اپنے گھر لے گئیں۔ تین دن تک وہ ان کے ساتھ رہا اور وہ تین دن اپنے بچے کے بغیر رانیہ کو تین ہزار صدیوں کے برابر لگے تھے اس کی واپسی ہوئی تو اس کی زبان کھل چکی تھی جو پہلا لفظ ریان نے بولنا سیکھا تھا وہ ''ماں'' تھا مگر وہ اس کو اس کی ماں نے نہیں، چچی نے سکھایا تھا۔

البتہ ایک دفعہ ''ڈھکن'' کھل جانے کے بعد ریان کی زبان ایسی چلی کہ رکے نہ رکی۔

وہ اور علی بچپن میں بے حد شیطان ہوتے تھے۔ اکثر دونوں آپس میں لڑ پڑتے ایک دوسرے کا سر پھوڑنے اور گریبان پھاڑنے پر تل جاتے اور چند ہی منٹ بعد ایسے پیار سے اکٹھے بیٹھے کھیل رہے ہوتے کہ دیکھنے والا یہ ماننے پر کبھی تیار نہ ہوتا کہ کچھ دیر پہلے یہ ہابیل قابیل کی عملی تفسیر بنے ہوئے تھے۔

ایک دفعہ علی کی سالگرہ پر ریان نے اسے خود ہاتھ سے بنا کر برتھ ڈے کا کارڈ دیا۔ اور اس پر لکھا تھا۔

''میرے پیارے بھائی کے لیے جو مجھے بے حد عزیز ہے۔ میں علی سے بہت محبت کرتا ہوں اور علی میرے لیے اللہ میاں کا تحفہ ہے۔ علی! تمہیں سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ (ان تمام باتوں کو اونچی آواز میں مت پڑھنا کمینے ذلیل انسان ورنہ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا)''

بجائے اس کو ڈانٹنے ڈپٹنے کے رانیہ یہ الفاظ پڑھ کر ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔

وہ اس وقت کوئی چھ برس کا تھا جب ایک پاکستانی قاری صاحب اسے اور علی کو قرآن پڑھانے گھر آتے تھے۔ ایک دن رانیہ لاؤنج میں بیٹھی کسی رسالے کی ورق گردانی میں مشغول تھیں جب ڈرائنگ روم سے آتی آوازیں ان کے کانوں میں پڑیں۔

''پڑھو لا الہ!'' قاری کی آواز آئی۔

''لا الہ!'' ریان نے دہرایا۔

''لا الہ!'' جب دوسری مرتبہ قاری صاحب نے وہی دو الفاظ کہے تو وہ قدرے تنگ کر بولا۔

''اب آگے بھی چلیں۔''

''اوں ہوں ...... الا اللہ ......'' وہ قدرے برہم ہو کر آگے چلے۔

''محمد رسول اللہ۔'' بجائے ان کے کلمات دہرانے کے وہ فوراً بولا تھا۔

''تمہیں کلمہ آتا ہے؟'' انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

''جی۔'' وہ جھٹ بولا۔ ''چھ کے چھ آتے ہیں۔ مما نے سکھائے ہیں۔''

ایک رات وہ رانیہ کے ساتھ سونے کے لیے لیٹا ہوا تھا، جب اچانک بولا ''مما! مجھے ایک لڑکے نے آج گالی دی۔''

''کیا؟'' چونک کر رانیہ نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

''کہا کہ تم ایس او بی (sob) ہو۔'' اس نے انگریزی کی مشہور گالی کا مشہور مخفف بتا دیا۔

''تو تم نے کیا کہا؟'' رانیہ کا خون کھول اٹھا تھا مگر خود کو کنٹرول کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے کہا۔'' وہ رکا اور لہک لہک کر گانے لگا

A bitch is a dog

A dog barks

Barks at the tree

Tree is nature

Nautre is beautiful

And that is my mom

اس نے وہ نرسری رائم پڑھی جو انگلینڈ کے ہر چھوٹے بچے کو آتی ہے۔

''یہ آخری جملہ خود لگایا ہے؟'' اس کے ماتھے پر آئے ڈارک براؤن بال پیچھے کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔

''یس۔'' اس نے اقرار کیا۔

''کہاں سیکھا؟''

''میری اینے نے سکھائی تھی، اس نے کہا تھا اگر کوئی تمہیں sob کہے تو آگے سے یہ کہنا'' وہ ہمیشہ سچ بولتا تھا۔

ایک شام وہ ہانپتا ہوا گھر آیا تھا اور آتے ہی صوفے پر نڈھال سا ہو کر گر گیا ''ہائے ماما......! مر گیا۔''

رانیہ جو کہ کچن میں تھیں بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئیں ''کیا ہوا؟''

''مما'' وہ منہ بسورتے ہوئے کہنے لگا ''وہاں باہر ایک بوڑھی خاتون سبزی سے بھری ٹرالی بمشکل دھکیلتی ہوئی لے جا رہی تھی، میں نے خوامخواہ ترس کھا کر اس کی ٹرالی دھکیلنے کی آفر کی۔ اس نے ٹرالی مجھے دے دی۔ میں تقریباً دو بلاک تک اس کی ٹرالی دھکیل کر لے گیا، پھر اس نے کہا، بس کر دو۔ میں نے کہا ''جانا کہاں تک تھا؟'' وہ کہنے لگی، جانا تو کہیں نہیں تھا، میں تو بس وزنی ٹرالی دھکیل کر ایکسرسائز کر رہی تھی۔''

ریان کی رونی صورت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ رانیہ کتنے ہی دن یہ بات یاد کر کے ہنستی رہیں۔

رانیہ کبھی بھی بچوں کی ضد کو خاطر میں نہیں لائی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ایک دفعہ بچے کی ضد کے آگے ہار مان جاؤ تو وہ سمجھے گا کہ من پسند شے حاصل کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے پھر وہ روز ضد کرنے لگے گا۔

رانیہ نے کئی مغربی عورتوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ بچوں کے ساتھ دوست بن کر رہو۔ رانیہ کو اس سے اختلاف تھا دوستوں پر ہم غصہ نہیں کرتے، دوستوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ بچوں پر رعب رکھنے اور انہیں درست راہ پر چلانے کے لیے بہتر تھا کہ وہ ان کی ماں بنتیں، دوست نہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رانیہ کو احساس ہوا کہ علی کافی بدلحاظ اور خود غرض واقع ہوا ہے۔ علی کو شروع سے ہی بے حد لاڈ پیار نے بگاڑ دیا تھا اور رانیہ اس بات سے ڈرتی تھی کہ کہیں ریان بھی ویسا نہ ہو جائے اور اسی لیے انہوں نے ریان پر تھوڑا ہاتھ سخت رکھا۔

علی ماں باپ کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس پر سختی کا مطلب سوکھی لکڑی کو موڑنے کی کوشش میں توڑنا تھا۔ ریان البتہ ابھی ہری اور نرم ٹہنی کی مانند تھا۔ انہوں نے علی کو تو مرضی کے مطابق امریکہ بھیج دیا، البتہ ریان کو اپنے پاس رکھا۔

ریان جب تک آٹھ نو سال کا تھا، وہ ماں کے قریب تھا، پھر آہستہ آہستہ اس کا زیادہ وقت اپنے کزنز کے ہمراہ گزرنے لگا۔

شروع شروع میں رانیہ کو بے حد ڈر لگتا تھا۔ اس کے بھانجے بھتیجیاں عیسائی تھے، وہ ڈرتی تھیں کہ کہیں ریان ان کے رنگ میں نہ رنگ جائے۔ لیکن جب ریان کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ کافی آگے نکل چکا تھا۔ اس نے انگلینڈ جانے کی ضد کی جسے انہیں ماننا ہی پڑا۔

بچپن میں ان کے بہت قریب رہنے والا ریان اب بہت دور چلا گیا تھا۔
پھر جیسے جیسے وقت گزرا، رانیہ نے محسوس کر لیا کہ وہ ایک عجیب سے احساس کمتری میں مبتلا ہے وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کی ماں کو اس سے کوئی خاص محبت نہیں ہے اس کے مقابلے میں وہ دوسرے بچوں سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔
وہ یہ بات اسے سمجھا نہیں سکتی تھیں کہ انہیں اس سے بے حد محبت ہے، ان کا خیال تھا وہ خود ہی سمجھ جائے گا۔
پھر آنے والے چند سالوں میں اس کے دوست بھی کم ہوتے گئے، میرین کی موت کے بعد تو وہ بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔
رانیہ نے آنکھیں کھولیں اور بستر پر بے حس وحرکت لیٹے ریان کی جانب دیکھا۔ وہ ایک منٹ میں ساٹھ دفعہ اس کی آنکھوں کی جانب اس امید پر دیکھتی تھیں کہ وہ شاید کھل گئی ہوں اور ہمیشہ ان کی نگاہیں ناکام و نامراد لوٹتی تھیں، مگر وہ مایوس نہیں تھیں۔
وہ اٹھیں اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے بستر پر جا بیٹھیں۔ اس کا بے جان ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر نرمی سے چوما۔ پھر ماتھے پر بکھرے سیاہ بال ہٹا کر اس کا ماتھا چوما۔
''میرا بیٹا بالکل ٹھیک ہو جائے گا'' انہوں نے خود کلامی کی تھی۔

☆☆☆

سولہ فروری کو اسے ایک اور آواز بھی سنائی دی جو اس ڈیڑھ ماہ میں سنائی نہیں دی تھی۔
رانیہ اس وقت اس سے اکیلی بیٹھی باتیں کر رہی تھیں یہ ان کی گویا عادت بن گئی تھی۔ وہ گھنٹوں بلا تکان اس سے اس کے بچپن کی باتیں کرتی رہتیں اور وہ سنتا رہتا۔
اس وقت بھی وہ اس کے ساتھ گفتگو میں محو تھیں جب دروازے پر دستک سنائی دی۔
''یہ آپ کے بیٹے کے لیے مسز عظیم!'' ایک مردانہ آواز آئی۔ وہ یقیناً کوئی بوکے وغیرہ لایا تھا، ریان نے سوچا۔
''تھینکس۔'' اسے مما کے لہجے میں سرد مہری سی محسوس ہوئی تھی۔
''میں...... مجھے بہت افسوس ہوا۔ ویل ڈونٹ وری۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہوتے ہیں، ہر کسی کو جانا ہوتا ہے۔'' مخاطب کی آواز میں تاسف تھا اور وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے کسی قبر پر فاتحہ پڑھنے آیا ہو۔
''میرا بیٹا زندہ ہے۔ آپ یہ ''جانے'' کا لفظ کیوں استعمال کر رہے ہیں؟'' وہ لتاڑنے والے انداز میں کہہ رہی تھیں۔
اور ایک دم اس کے ذہن میں ایک جھماکہ ہوا یہ آواز چیئر مین پی سی بی مرزا جاوید کی تھی۔
اسے یاد آیا چیئر مین صاحب سے اس کے کیسے اچھے تعلقات تھے۔ وہ اگر سلیکشن میں دخل دیتا تو چیئر مین صاحب ''جو ریان کہتا ہے ٹھیک کہتا ہے'' کہہ کر فوراً اس کے مشورے پر عمل کرتے۔
''میں آپ کے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں مسز عظیم!'' انہوں نے جذبات سے عاری آواز میں کہا۔
''نہیں آپ نہیں سمجھ سکتے۔'' مما نے درشتی سے اس کی بات کاٹی۔

''اگر آپ کو کرکٹ بورڈ کی کسی مرحلے پر ضرورت ہو تو پلیز ہمیں آگاہ کیجیے گا۔'' ریان نے نوٹ کیا تھا کہ انہوں نے اس کا حال احوال دریافت نہیں کیا۔

''ہمیں کیوں ضرورت ہوگی؟ ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت ہے۔ اور جہاں تک ریان کا تعلق ہے تو یہ چند دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میں نے ڈاکٹر سے پوچھا ہے، چند دن نہیں چند برس لگ سکتے ہیں۔'' ریان کا دل کسی نے برچھی سے کاٹا تھا۔

''شاید اسی لیے آپ اگلے گیارہ ماہ تک ارمغان کو کپتان بنا دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟'' مما کے لہجے میں طنز تھا۔ ''آپ کے خیال میں میرا بیٹا کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو آپ غلطی پر ہیں۔ میرے بیٹے کو ٹھیک ہونے میں زیادہ سے زیادہ دو تین ماہ لگیں گے، پھر یہ ٹیم میں کھیلنے کے لیے بالکل تیار ہوگا۔''

ریان کا دل چاہا وہ اپنی ماں کو بتائے کہ وہ اب کبھی بھی ٹھیک نہیں ہو سکے گا۔ وہ اسی طرح ساری زندگی بستر پر پڑا رہے گا۔

''تو آپ جذباتی ہو رہی ہیں مسز عظیم! آپ کا بیٹا...... ڈاکٹرز کہتے ہیں...... ٹھیک نہیں ہو سکے گا...... یہ جلد ٹھیک نہیں ہوگا۔ اسی لیے ہم اگلے سینٹرل کانٹریکٹ میں اس کا نام شامل نہیں کر رہے۔''

''کیوں ٹھیک نہیں ہوگا؟'' وہ زور سے بولی تھیں ''آپ کو کیا پتا؟ اللہ ہیں آپ؟ کیوں آپ ایسے بی ہیو کر رہے ہیں جیسے خدانخواستہ میرا بیٹا مر گیا ہو۔'' اسے لگا وہ رو رہی ہیں۔

''آپ اس کو زندہ کہتی ہیں؟'' وہ اکتاہٹ سے بولے۔ ''آپ کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا، کرکٹ بورڈ اس کو زندہ نہیں مانتا۔ آپ کا بیٹا ایک بے جان لاش ہے، نیم مردہ انسان!''

ریان کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہا ہے۔

''بہرحال، میں صرف سنٹرل کانٹریکٹ کا بتانے آیا تھا۔ مجھے اور بھی سو کام ہیں، چلتا ہوں۔'' چند لمحوں بعد کھٹکے کے ساتھ دروازہ بند ہوا، وہ جا چکے تھے۔

ریان کو بے حد تکلیف ہو رہی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے یہ وہ شخص تھا جو کبھی ریان کے بغیر پاکستان کرکٹ ٹیم کو ادھورا خیال کرتا تھا اور اب اس کی ضرورت ختم ہو گئی تھی۔

''چھوڑو بیٹا! مت روؤ۔'' رانیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''بھاڑ میں جائے یہ کرکٹ بورڈ۔ تم دیکھنا، جب تم دو ایک ماہ تک بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے نا تو یہ شہد کی مکھیوں کی طرح تمہارے اردگرد منڈلائیں گے۔'' وہ اس کو چپ کرانے کی کوشش میں خود بھی رو رہی تھیں۔ ''میں کافی ہوں اپنے بیٹے کے لیے ہمارے لیے ہمارا اللہ کافی ہے۔''

مگر وہ بدستور رو رہا تھا۔ کرکٹ اس کے لیے کیا تھی، اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ جس کرکٹ سے اس نے عشق کیا تھا، اب اسی کرکٹ سے کرکٹ بورڈ نے مکھن سے بال کی طرح اسے نکال پھینکا تھا۔

اس کا دل چاہا وہ مر جائے ابھی اسی وقت مر جائے۔

☆☆☆

اس کی سماعت سے دھیمی دھیمی سی ایک دھن ٹکرا رہی تھی۔ نیرہ نور کی خوبصورت آواز میں گائی جانے والی نظم رانیہ نے لگائی تھی۔

''کبھی ہم خوبصورت تھے۔''

اس نے کبھی اس نظم کو غور سے نہیں سنا تھا۔ کامران نے اسے ایک دفعہ یہ دے دی تھی اور اس نے ایسے ہی اسے اپنے کمرے میں رکھ دیا تھا۔ مگر اب ہسپتال کے اس کمرے میں تاریکی میں لیٹے پوری دنیا سے کٹ کر رہ جانے والے ریان کو اس فقرے نے نہ صرف چونکا دیا تھا بلکہ بہت کچھ یاد کرا دیا تھا۔

''کبھی ہم خوبصورت تھے۔''

اسے یاد آیا وہ کبھی انٹرنیشنل اسٹار ہوتا تھا۔ ایک اسٹائلش اور ہینڈسم کرکٹر جس پر ایک دنیا رشک کرتی تھی۔ اور آج وہ کس حالت میں ہسپتال میں پڑا تھا کہ اپنی مرضی سے پلک بھی نہیں اٹھا سکتا تھا ناک پر بیٹھی مکھی بھی نہیں اڑا سکتا تھا۔

''کتابوں میں بسی خوشبو کی مانند سانس ساکن تھی۔''

آج اس کی زندگی ٹھہر گئی تھی رک سی گئی۔ نہ منزل کا پتا تھا، نہ اپنی خبر تھی۔

''بہت سے ان کہے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے
پرندوں کے پروں پر نظم لکھ کر
دور کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے
جو ہم سے دور تھے لیکن
ہمارے پاس رہتے تھے۔''

اسے بے اختیار وہ دن یاد آئے تھے جب وہ پیرس میں Siene کے کنارے ایزل ٹکا کر اپنی مرضی سے کینوس میں رنگ بھرا کرتا تھا۔ جب وہ پرندوں اور تتلیوں اور پھولوں کی تصاویر بنایا کرتا تھا جب اسے اپنی فیملی سے زیادہ فرینڈز کا خیال ہوتا تھا۔

''نئے دن کی مسافت جب کرن کے ساتھ آنگن میں اترتی تھی۔
تو ہم کہتے تھے
امی.....تتلیوں کے پر بہت ہی خوبصورت ہیں''

جانے شاعر نے اس میں ''تتلیاں'' کسے کہا ہوگا مگر میری تتلیاں تو وہ اسٹارڈم تھا، کرکٹ کے میدانوں کی وہ رنگینیاں، وہ جذبہ، وہ خوشی جو اس وقت مجھے ہر جگہ دکھائی دیتی اور مجھے اس سے عشق تھا، اور اب.....اب مجھ پر کرکٹ کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ میری تتلیاں مجھ سے چھین لی گئی ہیں۔

''ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے

جگنوؤں کے

دیس جانا ہے“

اسے بھی واپس حقیقی دنیا میں جانا تھا، جہاں رنگ تھے، روشنیاں تھیں، خواب تھے، خوشبو تھی، پھول تھے، پرندے تھے، جہاں سب کچھ تھا۔

”ہمیں رنگوں کے جگنو

روشنی کی تتلیاں

آواز دیتی ہیں

نئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ کھڑکی سے بلاتی ہے۔

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو۔“

اسے بھی کرکٹ واپس اپنی جانب بلا رہی تھی، اسے اس کا قذافی اسٹیڈیم میں موجود چھوٹا سا کمرہ آواز دے رہا تھا، اسے اس کے برش اور پینٹس پکار رہے تھے اس کو روشنیاں اپنی جانب کھینچ رہی تھیں مگر وہ اس حد تک بے بس تھا کہ نہ آنکھیں کھول سکتا تھا۔ نہ لب۔ پاؤں کو حرکت دے سکتا تھا نہ ہاتھ کو۔

وہ جو ساری عمر نان اسٹاپ بولتا آیا تھا، اس کو آج اللہ نے سننے اور صرف سننے پر لگا دیا تھا۔

☆☆☆

”اب کیسا ہے؟ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟“

وہ فروری کی آخری سوگوار شام تھی جب اس کی سماعت سے ایک مردانہ آواز ٹکرائی جو اس کے لیے شناسا نہیں تھی۔

”ڈاکٹرز کو کیا پتا؟ اللہ تو نہیں ہیں وہ!“ مما جو اس کے قریب ہی تھیں تنک کر بولیں اور پھر اسے یاد آیا۔ یہ داؤد انکل تھے، اس کے سسر۔

”اوہ! میں شادی شدہ ہوں“ اس نے حیرت سے سوچا تھا۔ ”میں کیوں بھول گیا تھا اپنا اور ریا کا تعلق میں حاریہ کا شوہر ہوں، کتنی عجیب بات ہے۔“

”عظیم...... دیکھو، ڈاکٹرز تو اپنی جانب سے پوری کوشش کرتے ہیں اب یہ کب ٹھیک ہوگا، بظاہر تو اس میں کافی وقت لگ جائے گا!“ ریان کو لگا وہ تمہید باندھ رہے ہیں۔

”کھل کر کہو داؤد!“ انہوں نے بھی شاید محسوس کر لیا تھا۔

”میں بیٹی کا باپ ہوں عظیم! اب یہ ٹھیک ہوتا ہے یا نہیں ہوتا مگر...... میری بیٹی کی زندگی تو داؤ پر لگ گئی نا!“ ان کو کہنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ عظیم احمد آنکھیں سکوڑ کر انہیں تیکھی نظروں سے دیکھنے لگے۔

”دیکھو، اب پتا نہیں وہ کب ٹھیک ہو، کتنے سال لگ جائیں، میں...... میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔“

عظیم احمد خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے۔

''اگر تمہارے بیٹے کی، فرض کرو، دو تین سالوں بعد کومے میں ہی ڈیتھ ہوگئی تو میری بیٹی کیا کرے گی؟''

ریان نے نوٹ کیا تھا کہ انہوں نے ''خدانخواستہ'' نہیں کہا جو کہ انہیں کہنا چاہیے تھے۔

''فارگاڈ سیک، میں اپنی بیٹی کو کب تک تمہارے بیٹے کے نام پر بٹھا سکتا ہوں؟ تم ہی بتاؤ!''

''یہ ٹھیک ہو جائے گا داؤد!'' عظیم احمد کو ان کی بات سے سخت صدمہ ہوا تھا۔

''کب عظیم! دس سال بعد، پندرہ سال بعد؟ کب اور کیا اتنی دیر میری بیٹی گھر بیٹھی رہے؟ اس میں میری بیٹی کا کیا قصور ہے؟''

''حاریہ کو خلع چاہیے۔'' اب کے داؤد صاحب قدرے مدھم لہجے میں کہنے لگے۔

''وہ تمہارے سامنے پڑا ہے۔ بستر پر...... مانگو اس سے خلع۔'' عظیم احمد چیخے۔ ''دو ماہ برداشت نہیں کر سکی تمہاری بیٹی۔''

''وہ کیوں برداشت کرے، اس کا کیا قصور ہے؟''

''تو ریان کا قصور کیا تھا؟''

''مجھے نہیں پتا مگر میں اب حاریہ کی شادی کہیں اور کرنا چاہتا ہوں۔'' داؤد صاحب نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''وہ جب تک ہوش میں نہیں آئے گا، طلاق نہیں دے سکتا۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں داؤد بھائی!'' رانیہ نے مداخلت کی۔

''مجھ پر میری بیوی اور بیٹی کا بہت پریشر ہے بھابھی! آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' وہ شکستہ لہجے میں بولے۔

''انکل ایک کام ہو سکتا ہے۔'' علی نے زبان کھولی جس سے ریان کو پتا چلا کہ وہ بھی کمرے میں موجود ہے آپ کچھ عرصہ انتظار کریں اور اس دوران ریا کے لیے رشتہ بھی تلاش کرنا شروع کر دیں۔ سال ڈیڑھ سال تک یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر جیسے ریان اور ریا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔''

''میں سوچوں گا۔'' داؤد صاحب نے نیم رضامندی سے کہا۔

اسے اس بات پر دکھ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ واقعی اسے چھوڑنا چاہتا تھا مگر پھر بھی داؤد انکل کے منہ سے یہ سب اتنی سفاکی اور بے رحمی سے سن کر اس کو بہت دکھ ہوا تھا۔ اس نے ہر روز کی طرح آج بھی خاموشی سے یہی دعا مانگی تھی کہ وہ اسی طرح کومے میں مر جائے تاکہ حاریہ آزاد ہو جائے اور اس کی دعا آج بھی رد کر دی گئی تھی۔

☆☆☆

وہ کون تھی؟

ایک روز یونہی اس کے ذہن میں ایک سوچ ابھری۔

وہ لڑکی کون تھی جسے میں نے کئی جگہوں پر اپنے پیچھے دیکھا ہے، وہ ہر جگہ میرا سایہ، میرا گارڈین اینجل بن

کر موجود رہتی تھی، وہ کوئی کریزی فین نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو کم از کم آٹو گراف ضرور لیتی یوں خاموشی سے ایک کونے میں کھڑی رہ کر وہ کیا تاثر دینا چاہتی تھی؟ کیا وہ صرف مجھے دیکھنے آتی تھی۔ یا پھر کچھ دکھانے؟ یہ آخری بات ٹھیک ہے۔'' اس نے پورے وثوق سے سوچا۔ ''وہ اپنا آپ دکھانے آتی تھی۔''

''اگر وہ کوئی فین ہے تو ...... تو یوں اتنے سال میرا پیچھا نہ کرتی۔ کاش میں ایک دفعہ اس سے پوچھ لیتا، صرف ایک دفعہ کہ تم کون ہو؟ اور کیوں بار بار میرے راستے میں آجاتی ہو۔ کاش وہ مجھ سے میری شادی کے دن سے پہلے ملتی اور مجھ سے بات کرتی۔'' اسے یاد آیا اس نے اس روز بھری محفل میں محض ایک لڑکی کے باعث انکار کرنا چاہا تھا۔

وہ کیوں اس کی وجہ سے انکار کرنا چاہ رہا تھا۔ جس کے نام تک سے اسے واقفیت نہیں تھی۔

شاید وہ اس کا عادی ہوگیا تھا۔ ہر جگہ اسے لگتا وہ اس کا پیچھا کرتی ہوئی آئے گی۔

وہ اس کا ''انتظار'' کیوں کرتا تھا۔ عین شادی کے موقع پر کیوں انکار کرنے والا تھا اور اگر حاریہ کی جگہ ''وہ'' اس کی زندگی میں شامل ہو جاتی تو اسے خوشی کیوں ہوتی؟ ان سب سوالوں کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

''شاید وہ مجھے بہت پسند تھی، شاید...... شاید مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی۔'' اس پر ایک عجیب سا انکشاف ہوا تھا۔

جب بھی وہ لڑکی ریان کو دکھائی دیتی، ریان کو حقیقتاً خوشی ہوتی تھی۔ وہ خوشی محض اس بات پر نہیں ہوتی تھی کہ کوئی اسے پسند کرتا ہے وہ خوشی دراصل اس حقیقت کی بنیاد پر تھی کہ وہ اسے پسند کرتا تھا۔

اسے نہیں معلوم کب وہ انجانے میں اس کی محبت کا شکار ہوگیا۔

''یہ نہیں ہوسکتا، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔'' اس نے اپنے واہمے کو دل سے نکالنے کی سعی کی مگر اب یہ اتنا آسان نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

رانیہ نے بہت احتیاط سے نرس کے ساتھ مل کر ریان کا منہ کھلوا کر ٹوتھ برش کروایا پھر برش نکال کر منہ اندر سے دھلوا کر صاف کیا۔ اس کے بعد ہونٹوں پر خاص قسم کے ڈراپس ڈالے تاکہ فنگس نہ ہو۔ پھر چہرہ دھلوایا، اسے نہلایا جا چکا تھا۔ اس لیے بال گیلے تھے۔ انہوں نے نہایت نرمی سے نرس کے ساتھ مل کر اس کی کروٹ بدلی اور کنگھی کرنے لگیں پھر کروٹ دوسری جانب کر کے کنگھی مکمل کی اور چادر اس کے جسم پر ٹھیک طریقے سے ڈالی۔

وہ اس وقت بالکل ایسے بچے کی مانند لگ رہا تھا جو اسکول جانے سے پہلے ماں کے ہاتھوں سے تیار ہوتا ہے۔

نرس نے ریان کے بازو پر سے کپڑا ہٹا کر انجکشن لگایا۔ ریان کے منہ سے ''سس'' کی ہلکی سی آواز نکلی۔ یہ آواز اس کے لبوں پر ہر دفعہ تکلیف پر نکلتی تھی۔

رانیہ اس کے بستر پر بیٹھ گئیں اور اس کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگیں۔

''میری بات سن رہے ہو ریان؟'' انہوں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ خاموشی سے آنکھیں موندے یونہی لیٹا رہا۔

''پتا ہے ریان! جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو ہم گھر میں ایک گرینڈ پارٹی کریں گے اور اس میں مرزا جاوید اقبال اور داؤد حیات کو بھی مدعو کریں گے۔ پھر دیکھنا، تمہیں صحیح سلامت دیکھ کر شرمندگی اور خفت سے ان کے چہرے سرخ

پڑ چکے ہوں گے۔'' ڈاکٹر نے کہا تھا، وہ زیادہ سے زیادہ اس سے باتیں کیا کریں وہ جانتی تھیں کہ ریان کو ان دونوں مذکورہ شخصیات پر بے حد دکھ ہوگا، اسی لیے اس طرح ان کا ذکر کر رہی تھیں۔

''اصل میں بیٹا! لوگ بے حد جیلس ہوتے ہیں، کسی شخص کو آگے بڑھتا دیکھ کر بہت جلتے ہیں اور اگر وہ شخص بیچ راہ میں گر جائے تو ان کی تو مراد بر آتی ہے، ناراض نہ ہوا کرو۔ ایسے لوگوں پر ترس کھایا کرو۔''

ترس تو وہ خود پر کھاتا تھا، کیسے ماں کو بتاتا کہ ترس کھانے کے قابل تو وہ خود ہے۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر جہاں ریان چونکا، وہاں رانیہ نے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''آ گئیں؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی۔'' انیہ نڈھال سی دوسری کرسی پر بیٹھی۔ ہیثم ہاتھ میں کی رنگ پکڑے اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

''مما! یہ انتہائی...... انتہائی...... انتہائی فضول آدمی ہے۔'' اس نے ہیثم کی جانب اشارہ کر کے شکوہ کیا۔

''یقین کریں، یہ سنڈے مارننگ کے باعث خالی سڑکوں کا فائدہ اٹھا کر ایک سو بیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی اڑاتا ہوا مجھے یہاں لے کر آیا ہے۔ اس سے ابھی اور اسی وقت چابی ضبط کریں۔''

''چھوڑیں مما! آپا پاگل ہیں۔'' ہیثم نے ہنستے ہوئے دوسری کرسی سنبھالی۔

''ہاں ہاں، آپا پاگل ہی ہیں جو تمہارے ساتھ آئیں۔'' انیہ نے دانت کچکچائے۔

''پانی پیو اور غصہ ٹھنڈا کرو انیہ!'' مما نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

''جی اچھا۔'' انیہ نے کہہ کر ہیثم کو دیکھا ''شکل کیا دیکھ رہے ہو میری؟ پانی پلاؤ۔ فٹافٹ۔'' وہ مصنوعی تحکم سے بولی۔

''دیکھ رہا ہوں آپ میک اپ کے بغیر کیسی لگتی ہیں۔ سچ...... سچ...... بھائی صحیح کہتے ہیں، میری بیوی کی خوبصورتی میں ننانوے فیصد کمال میک اپ کا ہے۔'' اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے ایک گلاس پانی کا بھرا اور خود پی لیا۔ پھر دوسرا بھرا اور وہ بھی خود پی لیا۔ انیہ نے قدرے تلملا کر اسے دیکھا اس نے بالآخر تیسرا گلاس پانی سے بھر کر انیہ کو تھمایا۔

غٹاغٹ پانی پی کر اس کی گویا توانائی بحال ہوئی اس نے ریان کو دیکھا۔

''اور رونی کیسے ہو، کیا حال ہے؟'' وہ بشاشت سے پوچھنے لگی۔

''ریان بھائی! مزے کی بات بتاؤں، رات انیہ آپا نے ابلتا ہوا سالن آپ کی نینسی پر گرا دیا اور اس بے چاری کی فر جل گئی۔''

''الو کے بھائی کے سوا کچھ لگتے...... نینسی کی فر کب جلی تھی ہاں؟ صرف سالن ہی گرا تھا۔'' اس نے آخری فقرہ قدرے شرمندہ ہو کر کہا۔

''سالن گر گیا؟ واقعی؟'' مما نے مداخلت کی۔

''جی، پورا پتیلا۔''

''جھوٹے! صرف ایک ڈونگا گرا تھا۔''

اور ان سب کی زندگی سے بھر پور گفتگو سن کر ریان کو پہلی دفعہ فیملی کی قدر و قیمت کا احساس ہوا تھا۔
اس نے بھی اپنی فیملی کا خیال نہیں کیا تھا، فرینڈز کا کیا تھا یا کرکٹ کا۔ دونوں کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ دونوں نے اسے غیر اہم سمجھ کر بھلا دیا تھا۔ ضرورت تو اس کے گھر والوں کو بھی اس کی نہیں تھی، مگر وہ پھر بھی اس کے ساتھ تھے۔ ہر لمحہ، ہر پل۔

مما نے کہا تھا، سب چھوڑ جاتے ہیں۔ دوست، عزیز و اقارب، گھر والے حتیٰ کہ باپ بھی، مگر ماں نہیں چھوڑتی۔
مما کی پہلی دونوں باتیں درست نکلی تھیں۔

☆☆☆

انسان جتنا بڑا ہوتا ہے، موت اتنی ہی حقیر ملتی ہے۔ گرتا تو وہی ہے جو بلندی پر ہوتا ہے، بڑے بڑے سورما کیڑے مکوڑوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔

لیونارڈ یوڈونچی، دنیا کا وہ عظیم ترین مصور جو مونا لیزا کا خالق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سائنسدان اور musician بھی تھا۔ جو بیک وقت دونوں ہاتھوں سے تصویریں بنا سکتا تھا۔ اس کے فن پارے شاہکار تصور کیے جاتے ہیں۔ وہ ڈونچی ایک روز فالج گرنے کے باعث ساکت ہو کر رہ گیا۔ وہ آنکھوں کے علاوہ کسی شے کو حرکت نہ دے سکتا تھا۔

مارلن منرو کی شہرت اور نام دیکھ کر کس نے سوچا تھا کہ اسے ایسی موت آئے گی؟
فرعون کو پانی نے مارا تھا۔ نمرود کی موت ایک مچھر کے ہاتھوں آئی تھی۔
یہ تمام نامور لوگ تھے، اپنے اپنے کاموں میں انہوں نے نام کمایا تھا۔
اور ان سب کا انجام کتنا حقیر ہوا۔
اور زوال تو بس عروج ہی کو ہوتا ہے۔

وہ بھی عروج پر بیٹھا شخص تھا جسے اللہ نے 27 زینوں سے نیچے پھنکوا کر گویا موت اور زندگی، آسمان اور زمین کے درمیان معلق کر رکھا تھا۔ وہ نہ زندوں میں سے تھا نہ مردوں میں اور اس حالت میں اس کا رب اسے اب تک رزق پہنچا رہا تھا۔ اس نے اسے اب تک زندہ رکھا ہوا تھا۔

☆☆☆

''مما! وہ مسز علیم نہیں تھیں۔'' انیہ نے رانیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''آخری اطلاعات کے مطابق تو تھیں اب کیا ہوا؟'' رانیہ کے بجائے علی نے جواب دیا تھا اور کہہ کر دوبارہ عظیم احمد سے باتیں کرنے لگا۔
''ان کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے، نیکسٹ منتھ۔''
''اچھا۔'' رانیہ نے مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے جواب دیا۔ وہ سب اس رات ہسپتال ریان کے پاس

آئے ہوئے تھے۔

''کس کے ساتھ؟''

''ہاشمی انکل کے بیٹے کے ساتھ.....'' انیہ نے بتا کر مٹھی میں موجود تمام مونگ پھلیاں منہ میں ڈال لیں۔

''کس کی شادی؟'' عظیم احمد نے غالباً سنا نہیں تھا، اسی لیے پوچھنے لگے۔ وہ اور علی کافی دیر سے کچھ اور ڈسکس کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

''ہاشمی انکل کے بیٹے ابراہیم سے مسز علیم کی بیٹی نتاشہ کی شادی ہو رہی ہے۔ نیکسٹ منتھ۔'' چونکہ انیہ کا منہ بھرا ہوا تھا اسی لیے بیہ نے بتایا۔

''ابراہیم، وہ جس کی شکل چوہے جیسی ہے؟'' ہیثم نے بے ساختگی سے کہا۔

''ایسے نہیں کہتے۔'' رانیہ نے فوراً تنبیہہ کی۔

''انیہ! ریان کی کروٹ چینج کرو۔'' علی نے کہا تو وہ فوراً مونگ پھلی کا لفافہ ہیثم کو تھما کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیانے اس کے ساتھ مل کر ریان کی کروٹ بدلی۔

رانیہ نے دیکھا کہ اس کے منہ سے لعاب نکل رہا ہے، وہ جلدی سے اپنی نشست چھوڑ کر اٹھیں اور اس کے لب صاف کیے۔ وہ دونوں اس وقت تک واپس بیٹھ چکی تھیں۔

وہ سب اداس تھے، ان کے چہروں پر گہرے دکھ کی پرچھائیں تھیں مگر وہ اپنی باتوں میں زندگی اور رنگینی بھر کر ریان کو اچھا تاثر دینا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی پژمردہ باتیں سن کر وہ دکھی یا مایوس ہو۔

''ہیثم! میں نے تمہیں مونگ پھلی کا لفافہ دیا تھا کدھر ہے؟'' اس نے ہیثم کو مخاطب کر کے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

''یہ لیں۔'' ہیثم نے لفافہ جس میں محض چھلکے ہی رہ گئے تھے اس کے حوالے کیا۔

''مونگ پھلی کہاں ہے؟'' انیہ نے لفافے میں جھانکتے ہوئے حیرت سے کہا۔

''مجھے کیا پتہ۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''سیدھی طرح نکالو۔'' انیہ نے اسے لتاڑا، ورنہ میں علی کو بتاتی ہوں۔''

''اچھا، لے لیں۔'' اس نے جلدی جلدی ساری مونگ پھلی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ علی والی دھمکی ہمیشہ کارگر ثابت ہوتی تھی۔

''انیہ!'' علی نے اسے پکارا۔ وہ اور ڈیڈ قدرے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ ''ہاشمی انکل کے بیٹے کی شادی کا کارڈ آیا ہے، جو نیکسٹ ویک ہے؟''

انیہ نے ''ہوں'' کہتے ہوئے اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ علی نے نیکسٹ منتھ کی بجائے نیکسٹ ویک کہا ہے۔

اس وقت ان سب کی گفتگو سنتے ہوئے ریان کا بے انتہا دل چاہا تھا کہ وہ علی کی بات کاٹ کر تصحیح کرے۔ بات کاٹنا اس کی پرانی عادت تھی، اس نے اپنی تمام تر ول پاور ہونٹ کھولنے میں صرف کر دی مگر اس کے ہونٹ جنبش

بھی نہ کر سکے۔
کافی دیر تک مسلسل کوشش کے بعد جب وہ ناکام ہوگیا تو بے اختیار وہ رونے لگا۔اس کی بند آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اس کے چہرے پر بہنے لگے۔
ایک دم اطراف میں خاموشی چھا گئی۔اسے لگا کسی نے اس کا ہاتھ تھاما ہے۔
''ریان!'' وہ علی کی تحیر بھری آواز تھی۔''کیوں رو رہے ہو؟ فار گاڈ سیک رونی! تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے، پلیز مت روؤ دیکھو، ہم ہیں نا تمہارے ساتھ۔تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' علی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا کرے۔
وہ بدستور روتا رہا، بیا بار بار اس کے آنسو پونچھتی رہی، جو بار بار پلکوں کے بند توڑ کر بہہ نکلتے۔
علی نے بے چارگی اور بے بسی سے رانیہ کی جانب دیکھا۔وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ریان کے پاس قدرت نے تاثر دینے کی بس ایک طاقت چھوڑی تھی اور وہ تھی آنسوؤں کی۔

☆☆☆

جب تک رانیہ بولتی رہتیں، اسے تنہائی کا احساس قدرے کم ہوتا، مگر جب وہ سو جاتیں تو اسے اپنے اردگرد چھائے اندھیرے میں اضافہ ہوتا ہوا محسوس ہوتا۔اس تنہائی میں وہ بہت سوچتا تھا اور روز موت کی دعا مانگا کرتا تھا۔
پھر ایک دن وہ موت مانگتے مانگتے تھک گیا، تو اس نے زندگی، ایک مکمل اور بھرپور زندگی کی دعا مانگنا شروع کی مگر یوں لگتا تھا اس کی دعا میں سے اثر ختم ہو گیا ہے۔
ہر انسان مصیبت کے وقت اپنا کوئی ایسا گناہ کوئی ایسی خطا یاد کرتا ہے جو اس سے سرزد ہوئی ہو اور جس کے نتیجے میں اسے آزمائش میں مبتلا کر دیا گیا ہو۔
اس نے یاد کرنے کی سعی کی۔اس نے زندگی میں کب کس کا دل دکھایا؟ کب کس کا برا چاہا جو اس کے ساتھ ایسا ہوا؟
اور پھر ایک دم ہی اسے یاد آ گیا۔وہ دبلا پتلا سا لڑکا جس کے کپڑوں کو برف پر پھنکوا کر اس نے اسے دو تین گھنٹے وہاں کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔شاید اس لڑکے نے اسے بددعا دی ہو مگر نہیں...... اس نے تو اس کو اگلے جمعہ بلا کر بلے میں کاسٹ بھی کر لیا تھا۔کیا اس نے اس لڑکے کو فیور دے کر معاملہ برابر نہیں کر دیا تھا؟
''آنسلی ریان! آج ایک بات تو مجھ پر بالکل کلیئر ہوگئی ہے۔'' انیہ نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔''یہ کہ تمہارا بھائی پاگل ہے۔ایک دم پاگل!'' اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔وہ بالکل ابھی ابھی آئی تھی۔
ریان کو اس کے انداز پر ہنسی آئی تھی مگر وہ ہنس نہیں سکتا تھا۔اب اس سے مسکراہٹ اور قہقہے چھین کر اس کو صرف آنسو بخش دیئے گئے تھے۔
''کیوں کیا ہو گیا؟'' رانیہ نے سیب کاٹتے ہوئے انیہ سے استفسار کیا جو ابھی ابھی آئی تھی۔
''مما! آپ اس کو پاگل پن نہیں کہیں گی تو اور کیا کہیں گی؟ میں کہاں اتنا سوتی ہوں، رات دس بجے سوتی ہوں اور صبح نو بجے اٹھ جاتی ہوں، لو بھلا ہے کوئی تک؟''

''نہیں ....نہیں۔ یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ علی واقعی پاگل ہے۔'' انہوں نے ہمدردی سے کہا۔

انیہ نے ہاتھ بڑھا کر سیب کی ایک قاش اٹھائی اور منہ میں رکھتے ہوئے کہنے لگی ''اور سناؤ ریان ! کیا حال چال......'' یک دم وہ خاموش ہوگئی۔ ریان کو اس کی خاموشی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

''مما......!'' چند لمحوں بعد انیہ کی تحیر بھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''ریان کے......ریان کے بال......''

''شش......'' مما نے اسے ٹوکا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا تو وہ خاموش ہوگئی۔

وہ اس کے بالوں کے متعلق کیا کہہ رہی تھی۔ کیا ہوا اس کے بالوں کو؟

اس کو اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہوئی۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور علی نے اندر قدم رکھا۔ وہ انیہ کو گاڑی سے اتار کر خود اسے پارک کر رہا تھا، اسی لیے دیر ہوئی تھی۔

''السلام علیکم مما!'' وہ بیٹھنے کے بجائے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔

''وعلیکم السلام۔'' مما نے جواب دیا تو اس نے ریان کو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جواب نہیں دے گا، سلام کیا۔

''مما......! یہ......'' وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ انیہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کو کہا تو وہ جیسے سمجھ کر بات بدل گیا۔

''بیا بہت ضد کرتی ہے، اس کے ایگزامز چل رہے ہیں مگر وہ چاہتی ہے کہ روز ریان کے پاس آئے۔ دو دن بعد اس کا پیپر ہے مگر وہ مجھے صبح سے کہہ رہی ہے کہ رات کو اسے ایک چکر لگوالاؤں۔ ابھی تو نہیں لایا، رات کو لے آؤں گا۔'' علی بتا رہا تھا۔

ریان کو یاد آیا اس کے پاس اپنی فیملی کو دینے کے لیے وقت بہت کم ہوتا تھا اور جہاں تک ہیشم اور بیا کا تعلق تھا تو ان دونوں کو وہ ابھی تک بچہ خیال کرتا تھا۔ ایج ڈفرنس ہونے کے باعث اس کی ان دونوں سے اتنی خاص دوستی نہ تھی اور آج وہی بہن بھائی اس کے لیے تڑپ رہے تھے۔

''میں کتنا بدقسمت انسان ہوں، جن کی ساری زندگی میں نے قدر نہیں کی وہ آج میرے کتنے کام آرہے ہیں۔'' اس نے آزردگی سے سوچا تھا۔

☆☆☆

''بھائی! ذرا اٹھ کر دیکھیں تو کون آیا ہے؟''

شام کو علی، بیا کو لے کر آیا تھا اور وہ یقیناً اپنے ہمراہ کسی اور کو بھی لائی تھی۔

''بھائی پلیز! آنکھیں کھولیں نا!'' اس نے آگے بڑھ کر ریان کا ہاتھ تھاما اور دھیرے سے ہلایا، گویا وہ اسے نیند سے اٹھا رہی ہو۔

ریان نے اس وقت بے حد شدت سے اس کومے کے ٹوٹنے کی دعا کی تھی۔

"ریان!" کسی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ریان اس آواز کو پہچان نہیں پایا تھا۔

"ہاؤ آر یو ریان؟" وہ دوبارہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ریان کو وہ آواز بالکل بھی یاد نہ تھی۔

"بتاؤ تو سہی تم کون ہو؟" مما نے ہلکی سے سرگوشی میں بولنے والے کو کہا۔

"میں... میں......جبرائیل ہوں ریان!" اس نے اردو میں کہا اور ریان کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔

"جبرائیل، میرین کا بیٹا!" اسے میرین بے حد یاد آئی۔

"بھائی! آپ ضرور حیران ہو رہے ہوں گے کہ جبرائیل کو اردو کس نے سکھائی ہے۔ ہے نا؟" بیانے دبے دبے جوش سے پوچھا۔

"میں بتاتی ہوں، میں نے سکھائی ہے۔" انیہ فوراً ہی بول اٹھی۔

"خیر تمہارا کیا ہے، تم تو سالن میں چمچہ ہلا کر کہتی ہو میں نے بنایا ہے۔" علی نے انیہ کو چڑانے والے انداز میں کہا۔

"جی نہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "بے شک جبرائیل سے پوچھ لو۔ جبرائیل تمہیں اردو کس نے سکھائی ہے؟"

"مجھے خود آتی تھی......!" جبرائیل نے بے حد اطمینان سے جواب دیا۔

"مائی گڈنیس" اس نے حیرت سے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ "کتنے دن سے میں تمہاری اردو پہ لگی ہوں اور تم، انتہائی انتہائی، انتہائی جھوٹے ہو۔" وہ اب فرنچ میں اس پہ غصے ہو رہی تھی۔

"کیا کروں، تم پر گیا ہوں۔" جبرائیل نے سنجیدگی سے کہا تو علی کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا تھا۔ ریان نے نوٹ کیا تھا وہ سب سے "تم" کہہ کر مخاطب تھا۔

"یہ دوسرا ریان ہے۔" انیہ نے حتمی لہجے میں کہا۔

"آہم۔" جبرائیل نے مصنوعی غرور سے گردن اکڑائی۔ کہیں سے نہیں لگتا تھا، وہ ایک ساڑھے چار سالہ بچہ ہے۔ وہ واقعی دوسرا ریان تھا۔

"ریان! جبرائیل ادھر دو ہفتے کے لیے آیا ہے، چھٹیوں پہ" باقی سب اپنی باتوں میں مگن ہو بھی جاتے تو بھی رانیہ کو ہمیشہ ریان کا خیال رہتا۔

یہ وہ ماں تھی جس کے متعلق وہ کتنا بدگمان تھا، سمجھتا تھا کہ انہیں اس سے محبت نہیں ہے۔ اسے اپنے رویے اور سابقہ خیالات پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

"جبرائیل، روئی کرسٹینا وغیرہ کے بارے میں بتاؤ وہ سب کیسے ہیں، کیا کر رہے ہیں؟" مما اب اس سے مخاطب تھیں۔

"کرسٹینا ہمیشہ کی طرح موٹی ہے، اس کا شوہر ہمیشہ کی طرح سوکھا سڑا ہوا ہے، اور اس کے بچے ہمیشہ کی طرح بدھو ہیں۔ باقی رہا امریکہ تو پچھلے چند ماہ میں وہاں بھی خاص فرق نہیں آیا۔ میرا اسکول بھی فضول سا ہے، ٹیچر تو اور بھی پاگل ہیں، انیہ سے بھی زیادہ پاگل ہیں۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے بتایا اور ریان کو لگا وہ جبرائیل نہیں ہے وہ

پچیس چھبیس برس پرانا ریان حیدر ہے۔

''میں تمہیں پاگل لگتی ہوں؟'' انیہ نے غصے سے اس کو گھورا۔

''لگتی؟ نہیں، مجھے تو یقین ہے۔'' اس کی سنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔ وہاں سب اس کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اس کی آواز سنتے ہوئے ریان کو بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ اسے وہ بات آج سمجھ میں آ گئی تھی جو اس کے ماں باپ نے اسے بہت پہلے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

ڈیڈ کہتے تھے اللہ نے بغیر کسی مجبوری کے غیر مسلموں سے دوستی رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کو آج سمجھ میں آئی تھی کہ وہ صحیح کہتے تھے۔

اینجلینا بچپن میں بہت کھاتی تھی اور ریان کو کافی کثیر تعداد میں پاکٹ منی ملتی تھی۔ اینجلینا نے اس سے دوستی صرف اسی وجہ سے کی تھی جب وہ آزاد اور خود مختار ہو گئی تو اسے اس کی ضرورت نہ رہی۔

ڈینئل کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، وہ ریان سے اکثر کتابیں مانگ کر لے جاتا تھا۔ شاید ہی اس نے کبھی اس کی کوئی کتاب واپس کی تھی۔ وہ اکثر پیسے بھی اس سے ادھار لیتا تھا مگر لوٹاتا نہیں تھا۔ اس نے تو ان دونوں سے دوستی صرف ''دوستی'' کی غرض سے کی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اسے چھوڑ دیں گے۔

رنگ نسل، مذہب معاشرت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، کبھی وہ یہ سوچا کرتا تھا۔ رنگ، نسل مذہب، معاشرت کی کتنی اہمیت ہوتی ہے، تہذیبوں کا تصادم کیا ہوتا ہے، اسے آج علم ہوا تھا۔

جبرائیل کی آواز سن کر اس نے دل ہی دل میں پختہ ارادہ کر رکھا تھا وہ ٹھیک ہوتے ہی اس کو ایڈاپٹ کر لے گا۔ اس نے بہت سے ایسے کام سوچے تھے جو وہ کومے سے نکل کر ہی کر سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ نرس کے ہمراہ ریان کی شیو اور بالوں کی کٹنگ کرا رہی تھیں جب کہ انیہ قدرے فاصلے پر بیٹھی یکسوئی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر تو وہ یونہی ان پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی پھر یونہی کچھ سوچ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

''مسز علی! کوئی پرابلم؟'' ڈاکٹر طاہر، ریان کے ڈاکٹر نے اس کو وہاں دیکھ کر قدرے تشویش سے پوچھا۔

''اوہ نو، نتھنگ۔'' وہ زبردستی مسکرائی۔ ''میں بس ویسے ہی دیکھ رہی تھی۔ آپ کے ہسپتال میں کومے کے مریض اور بھی ہیں کیا؟'' بلا ارادہ وہ پوچھ بیٹھی۔

''جی کئی ایک ہیں۔'' وہ کھڑے کھڑے بتانے لگے۔

''آپ مجھے وزٹ کرا سکتے ہیں؟''

''شیور وائے ناٹ۔'' وہ رسانیت سے گویا ہوئے۔

وہ اسے لے کر پرائیوٹ رومز کی جانب آگئے۔ پہلے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے اور اسے اندر آنے کو کہا۔قدرے جھجکتے ہوئے اس نے اندر قدم رکھا۔

''اس کا نام سفیان ہے، یہ جب دس سال کا تھا تو کوما میں گیا تھا۔آج یہ سترہ سال کا ہے، مگر اسے ہوش نہیں آیا۔ یہ بائیسکل چلاتے ہوئے گرا تھا، پھر اٹھ نہیں سکا۔ یہ کومے میں بالکل ریان کی طرح باتیں سنتا ہے، روتا بھی ہے مگر خدا ہی جانتا ہے کہ یہ کب ہوش میں آئے گا۔''

بستر پر بے سدھ لیٹا لڑکا بہ مشکل سولہ سترہ برس کا لگتا ہے۔ وہ پچھلے سات سال سے اس عذاب کا شکار تھا جس کا ریان پچھلے ساڑھے چھ ماہ سے تھا۔

''اس کے بہن بھائی ملنے آتے ہیں اس سے؟'' اس پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر انیہ نے سوال کیا۔

''یہ اکلوتی اولاد ہے، خاندان کا واحد لڑکا ہے اس کے ماں باپ روز آتے ہیں۔ روز صبح اور شام۔ پچھلے سات برس سے وہ آرہے ہیں۔اس کا باپ مایوس ہو چکا ہے مگر ماں نہیں ہوئی۔''

انیہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔اس کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔

''آئیں، چلیں۔'' ڈاکٹر کی آواز پر وہ چونکی اور پھر سر ہلا دیا۔

دوسرے کمرے میں بستر پر ایک لڑکی لیٹی تھی، اسکا رنگ سانولا مگر چہرہ پرکشش تھا۔

''یہ عالیہ ہے۔پچھلے بارہ برس سے کومے میں ہے، اب اس کی عمر ستائیس برس ہوگی۔ یہ سمندر میں زیادہ آگے چلی گئی تھی، ڈوبنے لگی تھی لوگ اسے بچا کر لے آئے۔ مگر ایک بات ہے، یہ سنتی نہیں ہے نہ ہی رو کر اظہار کر سکتی ہے۔''

''بس......پلیز چلیں یہاں سے۔'' وہ گھبرا کر ان کے ہمراہ باہر آگئی۔ ڈاکٹر طاہر کا شکریہ ادا کر کے وہ واپس ریان کے کمرے میں آئی۔

''مما!'' اس وقت تک نرس جا چکی تھی اور رانیہ کرسی پر بیٹھی تھیں۔

''ہوں......کیا ہوا؟'' انہوں نے اس کی شکل دیکھی تو قدرے فکر مندی سے پوچھا۔اس کا رنگ اڑا اڑا سا تھا۔

''مما ریان کبھی ہوش میں نہیں آئے گا۔''

''انیہ!'' انہوں نے حیرت اور صدمے سے اسے دیکھا۔

''مما! ہم سات سال، بارہ سال یہاں بیٹھے رہیں گے اور یہ ہوش میں نہیں آئے گا۔ مما! یہ کبھی ہوش میں نہیں آئے گا۔'' وہ رونے لگی تھی۔

''انیہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ کیوں ہوش میں نہیں آئے گا؟'' انہوں نے انیہ کے قریب جا کر اس کو کندھوں سے تھاما۔

''مما!'' وہ روتے ہوئے بتانے لگی۔''میں نے یہاں ایسے پیشنٹ دیکھے ہیں جو سات سال اور بارہ سال سے ہوش میں نہیں آئے، یہ بھی نہیں آئے گا اور ہم......ہم ساری زندگی اس کی کھلی آنکھیں دیکھنے اور آواز سننے کی خواہش لیے تڑپتے رہیں گے۔ ماما! اللہ نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔''

''انیہ! ایسے نہیں کہتے۔''

''تم کیوں نا امید ہوتی ہو؟ میں اتنی دعا کرتی ہوں اس کے لیے اللہ ماؤں کی دعا ہمیشہ سنتا ہے۔''

انیہ نے بے یقینی سے انہیں دیکھا اور آنسو پونچھنے لگی۔

☆☆☆

آج پہلی دفعہ رانیہ اس کو چھوڑ کر گھر گئی تھیں پیچھے نرس اس کے پاس بیٹھی رہی تھی۔

سننا، محسوس کرنا اور سونگھنا، اپنی ان تینوں حسیات کے باعث اس نے اپنے اردگرد لوگوں کو پہچاننا شروع کر دیا تھا۔ قدرے کرخت ہاتھوں والی نرس شگفتہ تھی جبکہ چھوٹے اور نرم ہاتھوں والی شمائلہ تھی۔ یہ دونوں اس کی نرسیں تھیں۔

اس وقت چونکہ رانیہ نہیں تھیں، اسی لیے ایک نرس اس کے پاس بیٹھی تھی۔ پھر دروازے کھلنے کی آواز آئی۔

غالباً دوسری نرس اندر آئی تھی، پہلی نرس شگفتہ جو ریان کے ناخن کاٹ رہی تھی، آنے والی سے بولی۔

''یہ نیل کٹر لے لیں، آپ کاٹ لیں ناخن۔'' اور اس نے نیل کٹر دوسری والی کو تھما دیا۔

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اسے احساس ہوا کہ نرس شگفتہ جا چکی ہے۔

اس کے ہاتھ کو ایک نرم ہاتھ نے اپنی گرفت میں لے لیا اور بڑی آہستگی سے وہ ناخن کاٹنے لگی۔

یہ لمس ریان کے لیے نیا تھا۔ اس نے پہلے کبھی اس ہاتھ کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اس نے پہچاننے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔

اس کے ناخن کاٹ کر اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نرمی سے سہلایا۔

ریان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اس کے ساتھ کون ہے، کیوں ہے؟ وہ ان سوالات کا جواب جاننا چاہتا تھا۔

وہ اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں لیے کافی دیر تک بیٹھی رہی پھر اسے اپنے ہاتھ پر نمی کا احساس ہوا اور اسے جھٹکا لگا تھا۔

وہ رو رہی تھی۔

وہ کون تھی، وہ کیوں رو رہی تھی، وہ نہیں سمجھ سکا۔

☆☆☆

''یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے ریان!'' اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی۔ مگر وہ اس آواز کو نہیں پہچانتا تھا۔

''تم تو شاید بھول بھی چکے ہو کہ میں کون ہوں، مگر میں نہیں بھولی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' وہ رندھی ہوئی آواز اسے بتا رہی تھی۔ ''میں الماس ہوں۔ تمہاری مما کے بوتیک پر کام کرتی تھی۔ شاید تمہیں یاد ہو۔ ایک دفعہ تم نے فون کیا تھا اور میڈم گھر پر نہیں تھیں اور میں نے فون اٹینڈ کیا تھا۔ تم بور ہو رہے تھے اور چاہتے تھے کہ میں تم سے بات کروں اور میں نے کی تھی۔ پھر کتنے ہی دن ہم فون پر بات کرتے رہے تھے۔ ہم نے کتنی باتیں شیئر کی تھیں، تم پاکستان آئے تو تم نے مجھے ایک رنگ گفٹ کی جس پر اسپنش میں I love you لکھا تھا۔ ہر بات میں پہل تمہاری

طرف سے ہوئی تھی ریان، پھر بھی چند دنوں بعد تم نے مجھے اتنی باتیں سنا کر میری ذات کو نشانہ بنا کر مجھے چھوڑ دیا۔ تم بھلے مجھے چھوڑ دیتے مگر اتنی باتیں تو نہ کہتے، میرے وجود کو کچوکے تو نہ لگاتے اور اسی وقت میں نے سوچا تھا اس دن میں بے بس تھی تو کبھی تم بھی ہو گے۔ میں نے تمہارے لیے اتنی بددعائیں کی تھیں، پھر اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ میں نے تمہارے خلاف پورا ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا۔

تم کرکٹ ٹیم میں میری سفارش سے سلیکٹ ہوئے تھے، پھر تمہارے خلاف اخبارات میں خبریں میں نے لگوائی تھیں۔ میں نے بہت کچھ کیا، میں ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوتی تھی، تم نے مجھے نوٹ بھی کر لیا تھا۔ یہی میں چاہتی تھی مگر کبھی کبھی ہر منصوبہ خاک میں مل جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔

میں تمہاری شادی پر تمہیں اسی طرح ذلیل کروانا چاہتی تھی جیسے تم نے کبھی مجھے کیا تھا، مگر قسمت الٹ گئی۔ تمہارا نکاح ہو گیا اور گویا سب کچھ ختم ہو گیا۔

میں ہار گئی، میں قسمت سے نہ جیت سکی، میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ پھر اگلے دن مجھے نیوز کے ذریعے تمہارے متعلق علم ہوا مجھے لگا میری بددعا قبول ہو گئی ہے تمہیں میری آہ لگ گئی ہے مگر بدلہ لینے والے کبھی خوش نہیں رہتے میں بھی خوش نہیں ہوں۔ میں نے تمہارے لیے بددعا کی، مگر میں نے یہ کبھی نہیں چاہا تھا کہ تمہاری یہ حالت ہو۔ تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا تھا، میری روح تک چھلنی کر دی تھی۔ میرا ردعمل فطری تھا مگر آج تمہیں اس حال میں دیکھ کر میں بہت دکھی ہوں میں سب کچھ بھول گئی ہوں، اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

ریان کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے ترحم سے ان آنسوؤں کو دیکھا۔

''تم مت روؤ ریان! تم میری وجہ سے اس مصیبت کا شکار ہوئے ہو نا، میں تمہارے لیے دعا کروں گی، تم ان شاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' وہ رکی اور اپنے آنسو پونچھے۔ ''ایک امانت تھی میرے پاس تمہاری۔''

اس نے اپنی انگلی سے وہ سلور رنگ اتاری ''یہ میں تمہیں واپس کر رہی ہوں۔'' اس نے وہ انگوٹھی ریان کے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنا دی۔

چند لمحے وہ اس کا چہرہ تکتی رہی پھر دھیرے سے بولی تھی۔ ''تم سے نفرت کی ہی نہیں جا سکتی ریان!''

آگے بڑھ کر قدرے جھکتے ہوئے اس نے اس کے ماتھے پر اپنے ہاتھ رکھے اور نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''خدا حافظ ریان!'' وہ کہہ کر مڑی اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

ریان کا دماغ جو ایک عجیب سی سوتی جاگتی کیفیت میں تھا، اسی لمحے بیدار ہوا تھا۔ صرف اس لڑکی کو روکنے کے لیے اس کی پلکیں جو پچھلے ساڑھے چھ ماہ سے بند تھیں اس وقت ایک دوسرے سے جدا ہوئی تھیں۔

جس لمحے اس کی آنکھوں نے تاریکی سے روشنی کا سفر کیا۔ وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے جا چکی تھی۔

اس نے پلکیں جھپکائیں اور روشنی و رنگوں سے سجی ''حقیقی'' دنیا کو دیکھنے کی سعی کی۔

وہ ساڑھے چھ ماہ بعد کومے سے نکل کر، تاریکی کے پردوں کو چیر کے روشنی میں آیا تھا مگر وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ٹھیک سے کھل نہیں رہی تھیں اور منظر دھندلا سا رہا تھا۔

کمرہ خالی تھا اور وہ جا چکی تھی۔
اس نے چیخنا چاہا، بالکل ایسے جیسے ساڑھے چھ ماہ قبل سیڑھیوں کے دہانے پر، زمین پر گرے خون میں لت پت ہوئے چلانا چاہا تھا مگر آواز نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ آواز نے آج بھی اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

اس دفعہ جب اس کا ذہن تاریکی سے نکلا تو وہ سوتی جاگتی کیفیت گویا ختم ہی ہوگئی۔ وہ پوری طرح بیدار ہو کر آنکھیں کھول رہا تھا۔
''ریان!'' کوئی اسے پکار رہا تھا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں تو منظر بالکل صاف تھا۔
وہ ہسپتال کا ایک وسیع اور کشادہ پرائیویٹ روم تھا۔ اس کے بیڈ کے کنارے ایک لڑکی بیٹھی تھی، اس کی آنکھوں کو کھلتا دیکھ کر وہ خوشی سے بے حال ہوتی اس کی جانب بڑھی۔ کرسی سے اٹھ کر ایک دوسری عورت بھی اس کی طرف لپکی تھی۔
ریان ان دونوں کو نہیں جانتا تھا۔
''ریان کیسے ہو؟ ٹھیک ہو؟'' لڑکی نے والہانہ انداز میں اس کا ہاتھ دبایا۔
''بیٹا! تم ٹھیک ہو نا، بتاؤ نا۔'' دوسری عورت کے چہرے سے بھی بے پایاں خوشی چھلک رہی تھی۔
وہ خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا۔
''ریان بولو۔'' اس لڑکی نے ہمت بندھانے والے انداز میں کہا۔
''جاؤ ڈاکٹر کو بلاؤ۔'' دوسری عورت نے لڑکی کو مخاطب کیا تو سر ہلاتے ہوئے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈاکٹر کو بلانے چل دی۔
''میں کہتی تھی نا کہ میرا بیٹا ضرور ہوش میں آجائے گا۔ مجھے اللہ پر یقین تھا۔'' وہ عورت اس کے چہرے پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی۔
اتنے میں وہ لڑکی ڈاکٹر کو لے آئی۔
''ریان! آپ کو دکھائی دے رہا ہے؟'' ڈاکٹر طاہر نے اس سے دریافت کیا۔ وہ اسی طرح خالی خالی نظروں سے ان کو تکتا رہا۔
''ریان بولو بیٹا۔'' اس کو خاموش پا کر اس عورت نے کہا۔
ریان نے لب کھولے ''مے...... مے......ما...... ما'' اس منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔
''یہ ایسے کیوں بول رہا ہے؟'' لڑکی نے پریشانی سے ڈاکٹر سے پوچھا اور اس وقت اسے یاد آیا کہ وہ لڑکی انیہ ہے اور وہ عورت اس کی ماں تھی۔
''یہ میرا خیال ہے ابھی ٹھیک سے بول نہیں پائے گا لیکن ہوسکتا ہے کہ اسپیچ تھراپی کے بعد بولنے لگے۔''
''یہ اپنے جسم کو حرکت دے سکے گا نا؟'' رانیہ نے فکرمندی سے استفسار کیا۔ ڈاکٹر نے ریان کو دیکھا۔

''ابھی یہ حرکت نہیں کر سکے گا مگر فکر مت کریں اللہ بہتر کرے گا۔'' ڈاکٹر نے انہیں تسلی دی پھر نرس کو چند ہدایات دے کر کمرے سے چلے گئے۔

''ریان! میں کون ہوں، مجھے پہچانتے ہو؟'' انہوں نے دھیرے سے اس کا بایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پیار سے چوما۔

وہ تھکی تھکی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

وہ پہلے سے بے حد کمزور ہوگئی تھیں ان کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے اور کافی لکیریں ریان کو بغیر وقت کے دکھائی دے رہی تھیں۔

''بولو بیٹا! بات تو کرو۔'' انہوں نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

''م......مم......غ......غا۔'' وہ بول نہیں پا رہا تھا۔اس کے جسم کی بہترین شے اس سے چھن گئی تھی۔ اس نے زخمی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

''ریان! یہ تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟'' انیہ نے اس کے ہاتھ میں موجود انگوٹھی ی جانب اشارہ کیا ''پہلے تو یہ نہیں تھی۔'' وہ آگے بڑھی اور اس کا دایاں ہاتھ تھام کر بغور وہ انگوٹھی دیکھی، پھر اسے اتارنے لگی۔

ایک دم ہی ریان چیخنے لگا۔ اور زور زور سے سر نفی میں ہلانے لگا۔انیہ نے حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھا وہ زور زور سے چیخ رہا تھا اس کے منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکل رہی تھیں۔

''نہیں اتارتی، نہیں اتارتی، پلیز چپ ہو جاؤ۔'' اس نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی۔

وہ بڑی مشکل سے چپ ہوا مگر ابھی تک خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مرزا جاوید نے اسے ٹھیک ''لاش'' کہا تھا وہ واقعی ان چلتے پھرتے، ہنستے بولتے انسانوں کے درمیان ایک لاش ہی تھا۔اس نے آنکھیں بند کر لیں، وہ کسی کو دیکھنا کسی کو سننا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹرز اور نرسوں نے بمشکل پٹیوں سے جکڑ کر اسے ایک تختے نما شے کے ساتھ لگا کر کھڑا کیا تھا تا کہ اس کا جسم لڑھک نہ جائے۔تقریباً پچاس سیکنڈ اسے کھڑا رکھا گیا، پھر واپس بستر پر لٹا دیا گیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا تھا معائنہ پر آئے فزیشن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ پر بٹھایا، اور گنتی کرنے لگا۔ بمشکل پانچ سیکنڈ بعد ہی ریان کے چہرے پر تکلیف کے آثار دکھائی دیے تو انہوں نے آہستگی سے اسے دوبارہ لٹا دیا۔

ڈاکٹرز چلے گئے تو نرس نے اس کا دایاں بازو اٹھایا اور اسے ورزش کرانے لگی۔

''ڈاکٹرز کہتے ہیں۔تم ہمت کرو تو بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' رانیہ نے مسکراتے ہوئے گویا اسے تسلی دی۔

دوسری نرس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے دبیز پردے سرکائے۔سورج کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑی، اس نے ''سس'' کی آواز کے ساتھ قدرے گھبرا کر چہرہ ایک طرف کو کیا روشنی کی تپش بہت تیز تھی۔

''کیا ہوا، روشنی بری لگ رہی ہے؟'' رانیہ نے محبت سے گندھے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے چہرے کو

دیکھا، جو روشنی کے باعث بے حد سنہری لگ رہا تھا۔ ریان نے بچوں کی سی معصومیت سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

انہوں نے اٹھ کر پردے برابر کیے۔

کمرے میں پھیلی پیلی پیلی روشنی یک دم ہی معدوم ہوگئی تو ریان کو احساس ہوا کہ اس نے اس روشنی کو کتنا مس کیا تھا۔

''م......مم......آ......آ......'' اس نے ماں کو متوجہ کرنا چاہا، رانیہ نے اسے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''آ......آ......او۔'' اس نے نگاہوں سے دیکھا۔

''آ......آ......او۔'' اس نے آنکھوں سے کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ انہوں نے کھڑکی کو دیکھا۔

''اب بھی روشنی آ رہی ہے؟''

''نا......نا......'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آ......آ......او......'' وہ کہنا چاہتا تھا کہ پردہ سامنے سے ہٹاؤ۔

''روشنی تنگ کر رہی ہے؟'' انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ ''آ......ہا......''

''پردہ ہٹاؤں؟''

''آ......آ......'' اس نے فوراً اثبات میں گردن ہلائی۔

نرس نے آگے بڑھ کر دوبارہ پردے ہٹا دیے، روشنی ایک دفعہ پھر اس کے چہرے پر پڑی تھی مگر اب اسے وہ اتنی بری نہیں لگ رہی تھی۔

''بیٹا! تمہارا بایاں ہاتھ تو کام کرتا ہے نا، تم تو ہو بھی لیفٹی، پھر لکھ کر بتا دیا کرو۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، وہ بائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔

اس نے اپنے بائیں ہاتھ کو دیکھا، جس کی اب نرس ورزش کرا رہی تھی۔ رانیہ نے پین اور پیپر نکال کر اس کے سامنے کیا۔ اس نے پین بائیں ہاتھ میں لیا اور کاغذ کے ساتھ لگایا تاکہ لکھنا شروع کرے۔

چند لمحے تک وہ یونہی پین پکڑے کاغذ کو دیکھتا رہا مگر ہاتھ کو حرکت نہ دی۔

''ریان، لکھو نا!'' وہ حوصلہ افزا انداز میں کہنے لگیں۔

ریان نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اس کی نگاہوں میں ایک عجیب بیگانگی اور وحشت تھی۔

''لکھ کیوں نہیں رہے؟'' وہ پوچھنے لگیں۔

وہ اسی طرح ان کے چہرے پر نگاہیں جمائے رہا۔ وہ ان کو کیسے بتاتا کہ وہ لکھنا بھول چکا تھا۔ اسے ہر زبان بھول چکی تھی۔

''کیا ہوا رونی! لکھتے کیوں نہیں؟'' ان کے چہرے پر فکر مندی کے آثار واضح طور پر اسے دکھائی دیے۔

اس نے نفی میں سر ہلا کر پین چھوڑ دیا۔ پین نیچے گر گیا۔ وہ چند ثانیے یونہی اپنے ہاتھ کو دیکھتا رہا پھر رونے لگا۔

''ریان! نہیں۔'' مما نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگیں مگر وہ روتا رہا۔

وہ ہیرو سے زیرو پہ پہنچ گیا تھا۔ اسے چار زبانیں آتی تھیں اور اب وہ سب بھول گیا تھا۔ وہ نہ لکھ سکتا تھا، نہ پڑھ سکتا تھا۔ کیوں ہوا تھا اس کے ساتھ یہ سب؟

☆☆☆

اسے یاد آیا تھا مما ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ "ہر نماز کے بعد دعا کیا کرو کہ اللہ ہمیں کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔" اور اسے یاد آیا اس نے کبھی یہ دعا نہیں کی تھی۔

"بھائی!" بیہ کی آواز پر چونکا۔

"کون سا چینل لگاؤں؟" وہ ہاتھ میں ریموٹ لیے پوچھ رہی تھی۔ ریان کو یاد نہیں آیا کہ وہ کب آئی تھی۔ اس کی یادداشت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ شاید وہ صبح آئی تھی، جب انیہ اور مما گھر گئی تھیں۔

"نیوز لگا دوں؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ بیہ نے نیوز لگا دی اور چپس کا پیکٹ کھول کر کھانے لگی۔

اس کو وہ کرچ کرچ کی آواز بے حد بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ بیہ بہت لکی تھی کیونکہ اس کے پاس کھانا کھانے کی وہ "صلاحیت" تھی جس سے ریان محروم تھا۔

اس نے بھی بیہ کی طرح اپنی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر مرکوز کر دیں۔ عین اسی وقت اسپورٹس نیوز آنے لگیں۔ اس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی۔

نیوز کاسٹر کی زبانی یہ سن کر کہ پاکستانی ٹیم دورہ انگلینڈ میں، تین ٹیسٹ میچوں کی سیریز تین صفر سے ہار گئی ہے اسے بہت افسوس ہوا اگر وہ کپتان ہوتا تو شاید ٹیم اتنی بری طرح نہ ہارتی۔

"ارمغان مرزا کی خراب پرفارمنس اب سلیکٹرز کے لیے سوالیہ نشان بن کر رہ گئی۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ دسمبر میں ہونے والی سیریز کے لیے پاکستانی کرکٹ ٹیم کے حتمی کپتان کا اعلان نومبر میں کر دیا جائے گا۔" نیوز کاسٹر اب ٹینس کے متعلق بتانے لگی تھی مگر ریان کے دماغ کی سوئی بس ایک جگہ اٹک گئی تھی۔

"دسمبر میں...... دسمبر میں دسمبر میں...... کپتانی...... کپتانی......" اس نے ذہن میں حساب لگانا شروع کیا۔

کافی دیر تک وہ خاموشی سے اسکرین پر نگاہیں مرکوز کیے رہا، پھر بالآخر اس نے دل ہی دل میں ایک ارادہ کیا۔

چار ماہ میں ایک سو بیس دن ہوتے ہیں اور ایک سو بیس دن اس کو کافی لگ رہے تھے۔

☆☆☆

ایک بات نے آنے والے دنوں میں رانیہ کو حیران کر کے رکھ دیا۔

ریان کا رویہ اچانک ہی بدل گیا تھا۔ وہ ورزشوں میں حصہ لینے لگا تھا بولنے کی کوشش کرتا، مسکراتا اس کے اندر آئی یہ تبدیلی رانیہ کے لیے جہاں حیران کن تھی وہاں حوصلہ افزا اور خوشگوار بھی تھی۔

ڈاکٹر بہت خوش تھے، ان کا خیال تھا کہ اگر اسی طرح ریان خود ہمت کرے تو وہ ٹھیک ہو سکتا تھا۔

تقریباً تین ہفتے بعد اسے ان نالیوں سے چھٹکارا مل گیا جن کی مدد سے وہ کھانا کھاتا تھا۔ وہ خود کھانے کے

قابل ہو گیا۔ رانیہ اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتیں، بالکل ایسے جیسے وہ بچپن میں کھلاتی تھیں۔ ایسے وقت میں انہیں ریان کی وہ ''معصوم اور بچکانہ'' خواہش بہت یاد آتی تھی جو اس نے ایک ٹی وی انٹرویو میں کی تھی۔

''میرا دل چاہتا ہے میرا بچپن لوٹ آئے، جب مما مجھے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی تھیں۔ جب وہ میرے بالوں میں کنگھی کرتی تھیں۔''

ہم بھی خدا سے جانے کیا کیا مانگ بیٹھتے ہیں۔ مانگتے وقت یہ بھی نہیں سوچتے کہ یہ دعا ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔

ستمبر کے پہلے ہفتے میں وہ اٹھ کر بیٹھنے لگا، مگر بہت تھوڑی دیر کے لیے اور اس کا دایاں ہاتھ بھی کچھ کچھ کام کرنے لگا تھا۔

مگر وہ بول نہیں سکتا تھا۔

یہ ستمبر کے پہلے ہفتے کی ہی بات ہے کہ نیورو لوجسٹ اور فزیشنز کی ٹیم اس کے معائنہ پر آئی تھی۔ نیورولوجسٹ ڈاکٹر رضا، ریان سے اس کی طبیعت کے متعلق استفسار کر رہے تھے اور ریان ''ہوں......ہاں'' میں جواب دے رہا تھا۔ جب اچانک وہ خاموش ہو گیا۔

''ریان!'' ڈاکٹر نے اسے مخاطب کیا۔

ریان مسلسل آنکھیں جھپک اور مسل رہا تھا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر گویا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ پہلے اسے لگا کمرے کی لائٹس آف ہو گئی ہیں مگر پھر اسے احساس ہوا کہ اس کی بینائی چلی گئی ہے۔

وہ ہراساں ہو کر زور زور سے چلانے اور رونے لگا۔ اسے نرسوں اور رانیہ نے کندھوں سے تھام لیا مگر وہ اور زور سے چلانے لگا۔

ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگایا۔

آٹھ گھنٹے بعد جب وہ ہوش میں آیا تو اس کی آنکھیں ٹھیک کام کر رہی تھیں۔

پھر یہ اکثر ہونے لگا۔

شروع شروع میں اس کی بینائی چلی جاتی مگر رفتہ رفتہ آنکھوں کے آگے دھندلاہٹ چھانے لگی پھر آہستہ آہستہ یہ بھی ختم ہو گئی اور اس کی آنکھیں ٹھیک سے کام کرنے لگیں۔

اپنے دونوں ہاتھوں، بازوؤں، گردن اور کمر کے علاوہ وہ جسم کا کوئی اور حصہ باوجود علاج کے واپس نہ پا سکا۔ لیکن ستمبر کے تیسرے ہفتے میں وہ اسے وہیل چیئر پر بٹھانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

☆☆☆

اس نے دھیرے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور منظر دیکھنے کی سعی کی۔

بیڈ کے دائیں جانب دیوار سے لگے کاؤچ پر بیٹھے رانیہ اور عظیم احمد اپنی طرف دیکھتے نظر آئے تھے۔

''اٹھ گئے؟'' اس کو جاگتا دیکھ کر رانیہ کے چہرے پر ایک شفیق سا تبسم بکھر گیا۔

''ہوں۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

انہوں نے اس کے ماتھے پر آئے بال پیار سے ہٹائے اور نرمی سے چہرے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگیں۔

''کچھ کھاؤ گے؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور پھر ڈیڈی کی جانب دیکھا۔ اسے وہ پہلے سے زیادہ بوڑھے لگے تھے۔ اسے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ کہنے لگے۔

''ریان ہم تمہیں گھر لے جائیں؟'' انہوں نے پیار سے پوچھا۔

''کیا ایسا ممکن ہے؟'' ریان نے حیرت سے سوچا۔

''کیا ہم اسے لے جاسکتے ہیں؟'' مما نے اس کے دل کی بات کر دی تھی۔

''میں ڈاکٹر سے پوچھوں گا۔''

''چلو بھئی ریان! اب تمہاری دوائی کا ٹائم ہے۔'' شائلہ کمرے میں داخل ہو کر گرمجوشی سے مسکراتے ہوئے بولی اور ہاتھ میں انجکشن پکڑے اس کے قریب آگئی۔

ریان بے اختیار مسکرا دیا۔ اسے وہ نرس بہت اچھی لگتی تھی۔ مما نے اس کی آستین اوپر کی اور سسٹر شائلہ نے وہ انجکشن اس کے بازو میں چبھو دیا۔ ایک سسکاری اس کے لبوں سے نکلی تھی۔

''سسٹر! ہم سوچ رہے ہیں، ریان کو گھر لے جائیں۔'' رانیہ نے کہا تو اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''ہوں..... آپ لے جا تو سکتے ہیں مگر ساتھ میں آپ کو چوبیس گھنٹے کی مسلسل لک آفٹر کے لیے نرس بھی رکھنی پڑے گی۔''

''مم..... ما.....'' اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے قریب بیٹھی رانیہ کا گھٹنا ہلایا۔ ''آ..... آ.....'' اس نے نرس کی جانب اشارہ کیا۔

''کیا؟'' وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

''ا... اسے [illegible] ..... وہ [illegible] سسٹر کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔

''میم، میرا خیال ہے یہ چاہتا ہے کہ میں اس کے گھر پہ بھی اس کا خیال رکھوں، ہے نا ریان؟'' شائلہ نے مداخلت کی۔

''آں..... آں.....'' ریان نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چلو ٹھیک ہے، ہم شائلہ کو بھی ساتھ لے چلیں گے، او کے؟'' رانیہ نے مسکراتے ہوئے ریان کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکنے لگے تھے۔ اس نے بچوں کی طرح مسکراتے ہوئے گردن کو جنبش دی۔

☆☆☆

سترہ ستمبر کو ریان کو ڈسچارج کر دیا گیا۔
اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر جب کمرے سے باہر لایا گیا تو وہ ایک دم ہی گھبرا گیا۔ اس نے ہراساں ہو کر ماں کو دیکھا، جو اس وقت علی اور عظیم احمد کے ہمراہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات پر انہوں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔
وہ انہیں ''وہ'' نہیں سمجھا سکتا تھا جو وہ محسوس کر رہا تھا۔ ساڑھے نو ماہ وہ ایک کمرے میں محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ ساڑھے نو ماہ بعد وہ اس جیل سے نکلا تھا، اسے رہائی ملی تھی اور اتنے طویل عرصے کے بعد حقیقی، چلتی پھرتی، بھاگتی دوڑتی، دنیا کو دیکھ کر اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے کیا مس کر دیا ہے۔
وہ حیرت سے لوگوں کو چلتے پھرتے دیکھ رہا تھا۔
دنیا تو ویسی ہی تھی۔ اس نے ادھر اُدھر نگاہیں دوڑا کر وہ ''دکھ'' محسوس کرنے کی سعی کی، وہ ''فرق'' جانچنے کی کوشش کی جو اس کی معذوری سے دنیا میں آیا تھا مگر اسے اس تلخ حقیقت کا ادراک کرنا ہی پڑا کہ چھ ارب کی دنیا میں سوائے اس کے گھر والوں کے کسی کو اس کی فکر نہیں تھی۔
لیکن دنیا بہت تبدیل ہو گئی تھی۔ اسے سب کچھ بہت فاسٹ لگ رہا تھا۔
پلیٹ فارم پر کھڑے شخص کو گاڑی کی رفتار ہمیشہ بہت تیز لگا کرتی ہے اس شخص کی نسبت جو گاڑی میں سوار ہوتا ہے۔
تمام انسان ریل گاڑی میں سوار ہوتے ہیں مگر بعض لوگوں کو قدرت نیچے پٹری پر پھینک دیتی ہے۔ ریان حیدر بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔

☆☆☆

اپنے وسیع و عریض اور عالی شان گھر میں داخل ہوتے ہوئے وقت اسے نو ماہ پیچھے لے گیا۔ اسے گھر کی ہر چیز نو ماہ پیچھے لے کر جا رہی تھی۔ لان، پورچ، بیرونی دروازے کے کناروں پر لگے شیشوں پر بنا گلاس ورک، علی کی بی ایم ڈبلیو۔ ہر شے اسے بہت کچھ یاد کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ بیرونی دروازے پر انیہ موجود تھی۔
''کیسے ہو رونی؟'' وہ آگے بڑھ کر اس سے ملی۔ ریان کو لگا وہ رو رہی ہے۔ ''اوہ ہیلو سسٹر۔'' اس نے سسٹر شائلہ کو دیکھ کر مصافحہ کیا اور پھر ریان کی وہیل چیئر پیچھے سے تھام لی اور اسے لے کر آگے بڑھنے لگی۔
لاؤنج میں آ کر جو چیز سب سے پہلے ریان کی نگاہوں کی زد میں آئی تھی وہ سیڑھیاں تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر سیڑھیوں، علی کے کمرے کے دروازے، دروازے کے قریب تپائی پہ دھرے ٹیلی فون سیٹ اور قد آور آئینے کو دیکھتا رہا۔ اور جب تک انیہ اسے اس کے کمرے میں نہیں لے آئی وہ وہاں سے نگاہیں ہٹا نہیں سکا۔
''یہ تمہارا کمرہ ہے، دیکھو بالکل ویسا ہی ہے۔'' انیہ بتانے لگی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، اس کا بیڈ، پردے، کارپٹ، دیواروں پر لگے کرکٹرز کے پوسٹرز، ایک کونے میں دھرا اس کا کٹ بیگ...... ہر شے ویسی ہی تھی، البتہ آخری دفعہ جب اس نے یہ دیکھا تھا تو وہاں گلاب کی لڑیوں سے...... وہ اس سے آگے نہ سوچ سکا۔

اسے بے اختیار حاریہ اور داؤد انکل، اور ان کی باتیں یاد آئی تھیں، جو اس نے تاریکی میں سنی تھیں، اور اس نے بے اختیار سوچا تھا۔" جانے انہیں میرے بارے میں معلوم بھی ہوگا یا نہیں۔"

☆☆☆

کہنے کو تو نرس، ریان کی دیکھ بھال کے لیے چوبیس گھنٹے اس کے پاس ہوتی تھی مگر رانیہ نے جس طرح ریان کے چھوٹے چھوٹے کام سنبھالے ہوئے تھے نرس کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

روز ریان کے ڈاکٹرز اس کا چیک اپ کرنے آتے، فزیشن اسے ایکسر سائز کراتے، اسپیچ تھیراپسٹ اس کو بلوانے کی سرتوڑ کوششیں کرتی مگر امپرو ومنٹ کچھ خاص نہ تھی۔ وہ بیساکھی کے سہارے چل نہیں سکتا تھا، نہ اپنا بوجھ اپنے قدموں میں ڈال سکتا تھا، نہ ہی اس کی قوت گویائی واپس آئی تھی۔

اس روز بھی ڈاکٹر عائشہ کافی دیر اس سے سر کھپاتی رہیں مگر اس کا موڈ خراب ہوگیا تھا..... واپسی پر انہوں نے رانیہ کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا اور ہر ممکن طور پر اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی استدعا کی۔

ان کے جانے کے بعد رانیہ اس کے پاس گئیں۔ وہ وہیل چیئر کو قد آور فرنچ ونڈوز کے قریب لے جا کر باہر لان کی جانب نگاہیں مرکوز کیے بیٹھا تھا۔

"ریان....." وہ اس کے قریب چلی آئیں اور پیچھے سے اس کی وہیل چیئر تھام لی، "کیا ہوا ہے میرے پیارے سے بیٹے کو؟"

پھر انہوں نے پردے مکمل طور پر ہٹا کر کھڑکیوں کے پٹ کھول دیے۔

شام کی قدرے نم آلود اور ٹھنڈی ہوا ایک دم ہی اندر داخل ہوئی تھی۔ ریان کے ماتھے پر آئے بال بکھر سے گئے تھے۔

ہوا کی سرسراہٹ میں گھروں کو لوٹتے پرندوں اور اس نیلی چڑیا کی چہچہاہٹ بھی شامل تھی۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا اور آج کل ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔

"اگر تم کوشش کرو تو بول سکتے ہو۔ بیٹا کوشش تو کرو۔" وہ ہمت بندھا رہی تھیں۔

ریان نے اس بار رخ نہیں پھیرا تھا بلکہ اسی طرح انہیں خفگی سے گھورتا رہا۔

"تم کوشش تو کرو۔"

ریان نے سختی سے لب بھینچ کر سر جھٹکا۔

"میں ماں ہوں تمہاری، تمہارے لیے غلط تو نہیں کہوں گی نا۔" وہ جھنجلا کر بولی تھیں۔ "تم اگر..... ہمت کرو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

انہیں اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی سرخی دکھائی دے گئی تھی۔

"ریان!" انہوں نے آہستہ سے اسے پکارا۔ وہ نیچے دیکھتا رہا۔

رانیہ کا دل جیسے کسی نے نشتر سے چیرا تھا۔

''ریان! تم ٹھیک نہیں ہونا چاہتے؟'' انہوں نے بے حد آزردگی سے پوچھا تھا۔ اور اسے پتا نہیں کیا ہوا وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''ریان! مت روؤ۔ تم روتے ہو تو میرا دل دکھتا ہے بیٹا۔'' وہ جلدی سے اس کے قریب آئی تھیں۔ ''تم تو بہت بریو تھے۔ بڑا حوصلہ تھا تم میں۔ پلیز مت روؤ۔''

انہوں نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگا لیا، بالکل ایک چھوٹے معصوم بچے کی طرح۔

کچھ دیر بعد وہ ان سے الگ ہو کر آنسو پونچھنے لگا۔ اس کے ہاتھ اب ٹھیک سے کام کرتے تھے مگر پہلے جیسے نہیں۔ رونے کے بعد جیسے اندر سے کچھ ڈھل گیا تھا۔

''یوں رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اپنی بقاء اپنی زندگی کی جنگ انسان کو خود لڑنا پڑتی ہے۔ کوئی دوسرا ہمارا ہتھیار نہیں بنتا۔ شاباش، اب روؤ نہیں ہمت کرو۔ کرو گے نا؟'' انہوں نے گویا یقین دہانی چاہی تھی۔

ریان نے نم آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔ پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

رانیہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

☆☆☆

''مم......مم......ما'' اس نے تھک کر ایک گہری سانس اندر کو کھینچی اور پھر آہستہ سے اسے خارج کیا۔

''ما......ماں......'' وہ دھیرے سے مسکرایا، انتہائی زخمی مسکراہٹ، جس میں فتح کا کوئی جوش نہ تھا اور نقاہت بھری نگاہوں سے رانیہ کو دیکھا۔

رانیہ کے لیے یہ ان کی زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا کیونکہ آج ریان نے ''ماں'' کہنا سیکھ لیا تھا۔ وہ خوشی سے دمکتے چہرے کے ساتھ ریان کو دیکھ رہی تھیں۔

ان کے اس روز کے لیکچر کا ریان پر خاصا اثر ہوا تھا۔ اس نے دل جمی سے تھیراپی میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا، جس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔

لیکن آج اس کی اپنی کوشش کا اثر تھا یا قدرت کا معجزہ، وہ یک دم ''ماں'' بول اٹھا تھا۔ اکتوبر کے مہینے کے ساتھ آتی خزاں اس کے لیے گویا بہار کا پیام لائی تھی۔

''ماں۔'' اس نے دوبارہ کہا مگر اس دفعہ شاید ماں کو خوش دیکھ کر اس کی آنکھوں کے دیے بھی جل اٹھے تھے۔

''میں عظیم کو بتاتی ہوں۔'' وہ اسے وہیں لان میں سوئمنگ پول کے کنارے چھوڑ کر اندر کی جانب بھاگیں۔

ان کی بے تابی دیکھ کر ریان کے لبوں پر خود بخود ہی ایک مسکان بکھر گئی پھر اسے خود پر بھی حیرانی ہوئی کہ وہ مسکرا رہا تھا۔

آخری دفعہ وہ کب مسکرایا تھا، اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ شاید اپنی شادی کے دن۔

اسے یاد آیا وہ زندگی میں پہلی بار اپنی شادی کے دن ہی رویا تھا، جب ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں علی سے باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

شادی کے متعلق سوچتے ہوئے اسے حاریہ یاد آئی تھی۔ وہ ایک بار بھی اس سے ملنے نہیں آئی تھی۔ حاریہ سے اس کی کوئی جذباتی وابستگی نہ تھی مگر اسے دکھ ہوتا جب وہ اس کی بے اعتنائی اور یوں اسے یکسر فراموش کر دینے کے بارے میں سوچتا تو......آخر کو وہ اس کی منکوحہ تھی۔

لیکن ریان کو اس سے کوئی گلہ، کوئی شکایت نہ تھی اس نے کسی معاملے میں بھی حاریہ یا داؤد انکل کو قصور وار نہیں ٹھہرایا تھا۔ اسے تو اس سیاہ آنکھوں والی بے وقوف لڑکی سے بھی کوئی شکوہ نہ تھا۔

اس نے اس سب کو اپنی قسمت سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔

☆☆☆

''اس پھول کو کیا کہتے ہیں؟'' رانیہ نے سرخ گلاب کو اس کی لمبی ٹہنی سے پکڑ کر اس کے سامنے کیا۔

''ووز'' وہ تمام ہمتیں مجتمع کر کے بولا۔

''بچ۔'' مما نے گہری سانس لی۔ ''ووز نہیں روز ..... بولو روز (rose)''

وہ دونوں اس وقت لش گرین گھاس سے ڈھکے لان میں پھولوں کی کیاری کے قریب موجود تھے۔ دن کا وقت تھا مگر موسم قدرے ٹھنڈا تھا۔ دھوپ اگرچہ سنہری اور چمکیلی تھی مگر حدت سے پاک تھی۔

ریان اپنی وہیل چیئر پر تھا جبکہ وہ اس کے سامنے گھاس پر دو زانو ہو کر بیٹھی تھیں۔

''ووز......ووز'' اس نے اپنے تئیں زور لگایا تھا۔

''نہیں بیٹا، رے بولنے کی کوشش کرو۔''

ریان نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں سکیٹریں، تیکھی نگاہوں سے ان کو دیکھا اور اپنے پرانے انداز میں بولا۔ ''گلاب۔''

رانیہ ہکا بکا، منہ کھولے اسے دیکھنے لگیں۔

''دوبارہ کہو۔'' انہوں نے بے یقینی سے کہا۔

''گولاب۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ وہ مسکراہٹ جو اس کے لبوں پر سجی تھی اسی پرانے ریان حیدر کی تھی جو وہ کسی بھی شخص کو تیکھا سا جواب دینے کے بعد اپنے چہرے پر سجایا کرتا تھا۔

''ریان!'' رانیہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

''اچھا اس کا کلر کیا ہے؟'' انہوں نے دوبارہ ٹیچر بنتے ہوئے استفسار کیا۔

''رے رے ے ڈ'' وہ ''ریڈ'' کو کافی کھینچ کر بولا۔

مما نے ایک گہری سانس بھر کر نفی میں سر ہلا دیا اور کہنے لگیں۔

''تم کوشش کرو، میں آ رہی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور گھر کے اندرونی حصے کی طرف جانے کے لیے بڑھیں۔

ریان نے بغور پہلے سرخ گلاب کو پھر دور جاتی مما کی پشت کو دیکھا۔

''ماں......ماں......''اس نے ان کو پکارا اور ابھی وہ مڑنے بھی نہیں پائی تھیں کہ وہ بولا''ماں...... ریڈ۔''
وہ یکدم پوری گھومی تھیں ان کی آنکھیں حیرت سے وا تھیں۔
''ماں......ریڈ۔''ریان نے پھول کی جانب اشارہ کر کے کہا''ریڈ......ریڈ۔''
وہ الٹے قدموں دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی تھیں۔''پھر بولو۔''
انہوں نے اتنی بے ساختگی سے کہا تھا کہ وہ ہنس پڑا۔ بہت عرصہ ہوا تھا اسے کھل کر ہنسے ہوئے۔
''اچھا اب بتاؤ اس کا کلر کیا ہے؟''انہوں نے جوش جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں گلابی پھول کی جانب اشارہ کیا۔
''وین۔''وہ اپنے تئیں پنک کہہ رہا تھا۔
''پنک۔''انہوں نے گویا تصحیح کی۔
''گلابی، ماں!''وہ برجستہ بولا۔
''تم فراڈیے، بول سب لیتے ہو، بس میرے سامنے ڈرامے کر کے مجھے تنگ کرتے ہو۔ گلابی کے بچے۔''
وہ بے طرح ہنستے ہوئے اسے لتاڑ رہی تھیں۔
''ناں ماں......میں......آپ......باچا ہوں۔''(نہیں مما، میں آپ کا بچہ ہوں) وہ انتہائی سنجیدگی سے بولا مگر زیادہ دیر اس سنجیدگی کو قائم نہیں رکھ سکا اور ان کے قہقہوں میں شامل ہو گیا۔
کتنے عرصے بعد انہوں نے ریان کی ہنسی کی جھنکار اور اس کا برجستہ انداز گفتگو دیکھا تھا اور انہوں نے ان دنوں کو کتنا مس کیا تھا، اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا تھا۔
ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ انہوں نے ہتھیلی کی پشت سے انہیں رگڑ کر صاف کیا اور ریان کو دیکھا۔
''چلو۔ آج کے لیے بہت ہو گیا۔ اب چلتے ہیں، ٹھیک؟''انہوں نے اس کی وہیل چیئر کی پشت تھام لی اور اسے اندرونی دروازے کی جانب موڑ دیا۔
''اف ریان! میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں آج کتنی خوش ہوں۔ اللہ نے بہت کرم کیا ہے۔ دیر سے ہی سہی مگر تم بولنے تو لگے ہو نا! تم دیکھنا تم اسی طرح ایک دن چلنے بھی لگو گے پھر تم دوبارہ کرکٹ کھیلو گے۔''اس کی وہیل چیئر چلاتے ہوئے وہ مسلسل بولے جا رہی تھیں اور ریان تو کہیں کھو سا گیا تھا۔
کرکٹ اس کا خواب، اس کی دنیا، اس کی زندگی کا سب سے بڑا عشق......وہ جو یہ سب کچھ کر رہا تھا، ٹھیک ہونے کی مسلسل سعی کر رہا تھا تو یہ سب کچھ کرکٹ کے لیے ہی تو تھا۔
وہ واپس کرکٹ کی دنیا میں جانا چاہتا تھا، رنگوں، خوشبوؤں، جگنوؤں اور تتلیوں کے اس دیس کی جانب پلٹنا چاہتا تھا جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اور ذات کا سب سے بڑا حصہ رہ چکا تھا۔
وہ دن گن رہا تھا۔ آج تیرہ اکتوبر تھی اور اس نے خبروں میں سنا تھا کہ دسمبر کے وسط میں حتمی کپتان کا

اعلان کر دیا جائے گا۔ وہ روز کیلنڈر پر تاریخوں کے اوپر نشان لگاتا تھا، دسمبر ابھی کافی دور تھا۔

''تم ادھر ہی بیٹھو، میں ذرا کچن دیکھ لوں۔'' مما کی آواز اسے کسی اور دنیا سے کھینچ کر واپس حال میں لے آئی تھی۔

وہ اس کی وہیل چیئر کو لاؤنج میں لا کر خود کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا اور ایک نیوز چینل دیکھنے لگا۔

خبروں سے بور ہو کر وہ ٹی وی بند کرنے ہی لگا تھا کہ یکا یک اس کی انگلیاں تھم گئیں۔

اسکرین پر قذافی سٹیڈیم میں کچھ دیر پہلے وقوع پذیر ہونے والی پی سی بی کے چیئرمین کی پریس کانفرنس دکھائی جا رہی تھی۔

مرزا جاوید کے ساتھ والی نشست پر سبز ٹوپی جس پر سنہرے رنگ کا ستارا بنا تھا، پہنے ہوئے ارمغان مرزا بیٹھا تھا۔ وہ اوپنر بیٹسمین اور لیفٹ آرم اسپنر ہونے کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب کا بیٹا بھی تھا۔

''پاکستان کرکٹ بورڈ کے چیئرمین مرزا جاوید نے آج قذافی اسٹیڈیم میں پریس کانفرنس کے دوران اگلے سال کے اختتام تک کے لیے پاکستان کرکٹ ٹیم کے حتمی کپتان کا اعلان کر دیا ہے۔ ارمغان مرزا اب اگلے چودہ ماہ کے لیے پاکستانی ٹیم کی قیادت کریں گے۔''

ریان کے ہاتھ سے ریموٹ نیچے گر گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ جس ایک لمحے کا اس نے پچھلے کئی ہفتوں سے انتظار کیا تھا وہ ایک مہینہ پہلے آ چکا تھا۔ دسمبر کا کہہ کر اکتوبر میں اعلان کر دیا گیا تھا اور اسے لگا کہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔

اس نے نفی میں سر ہلایا اور پھر زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس کا جسم کانپنے لگا تھا اس کا سر چکرا رہا تھا اور وہ مسلسل سر ہلا رہا تھا۔

ایسا نہیں ہو سکتا، پی سی بی ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کی جگہ کسی دوسرے کو نہیں مل سکتی، کوئی اور اس کی کیپ، اس کا بلیزر نہیں پہن سکتا، اس کا مقام اس سے نہیں چھینا جا سکتا..... کوئی اس کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔

''نو......نو......'' وہ یک دم ہی چیخنے لگا۔ اس کے لبوں سے عجیب وغریب آوازیں نکل رہی تھیں، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ چیخ رہا تھا۔ غصے سے، غم سے، دکھ سے۔

مما اور انیہ بھاگتی ہوئی کچن سے آئی تھیں، ریان کو یوں چیخیں مار مار کر روتا دیکھ کر وہ دونوں گھبرا گئی تھیں۔

''ریان! کیا ہوا ہے؟'' انیہ نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ مگر وہ جواب دینے کی کیفیت میں ہی نہیں تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

انیہ کی نظر اس کے قدموں میں گرے ریموٹ پر پڑی اس نے چونک کر ٹی وی اسکرین کو دیکھا۔ نیوز میں ایسا کیا تھا جس نے ریان کی یہ حالت کر دی تھی۔ اس سوال کا جواب انیہ کو نیلی پٹی پر چلتی نیوز فلیش پڑھ کر ہی مل گیا تھا۔

''ارمغان مرزا کو قومی ٹیم کا کپتان مقرر کر دیا گیا ہے۔''

اس کو معاملہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے ایک تاسف بھری نگاہ ریان پر ڈالی۔

''ریان کچھ نہیں ہوتا، ایک سال کی ہی تو بات ہے، دیکھنا پھر تم ہی کیپٹن بنو گے۔'' مگر کرکٹ ریان عظیم حیدر کے لیے کیا تھی، یہ کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ جو کچھ عرصہ پہلے تک اس کے بے بس ولاچار وجود میں جینے کا عزم، انگڑائی لینے لگا تھا، ویران، وحشت زدہ آنکھوں میں زندگی کی جانب لوٹنے کی امید دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ اب بالکل ہی ختم ہو چکی تھی۔

اس کے اندر کچھ بہت زور سے ٹوٹا تھا اور ایسا ٹوٹا کہ اس کی کرچیوں نے ریان عظیم حیدر کے پورے وجود کو لہولہان کر دیا تھا۔

یہ اتفاق تھا یا پتا نہیں کیا، اس نے ہوش میں آنے کے بعد سے اب تک آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ڈریسنگ روم اور باتھ روم سے مما نے آئینے اتروا دیے تھے۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ریان اپنا عکس دیکھے۔

ان ہی دنوں اچانک ایک شادی آن پڑی۔ مما، رانیہ اور انیہ کی شرکت ناگزیر تھی۔ نرس بھی جا چکی تھی۔ وہ رانیہ کے بغیر تنہا تھا۔ پہلے تو وہ شادی میں شرکت کے حوالے سے پس و پیش کا مظاہرہ کرتی رہیں مگر نوکروں کی فوج اور بہ ذات خود عظیم احمد کی موجودگی کے باعث وہ بے فکر ہو گئیں۔

ان کے جانے کے بعد ریان یونہی اپنی وہیل چیئر گھسیٹتا ہوا لاؤنج میں لے آیا۔ پھر وہاں سے لان میں یہ جانے ہی لگا تھا کہ دفعتاً اس کی نگاہ صوفے پر دھرے آئینے پر پڑی۔

انیہ اپنی تیاری کو آخری ٹچ لاؤنج میں ہی دے رہی تھی اور وہ غالباً آئینہ واپس رکھنا بھول گئی تھیں۔

کوئی مقناطیسی طاقت سی تھی جو ریان کو صوفے کی جانب کھینچ لائی۔ اس نے معمول کی سی کیفیت میں بے پروائی سے رکھا گیا وہ آئینہ اٹھایا اور اس میں اپنا آپ دیکھنے کی سعی کی۔

دس ساڑھے دس ماہ پہلے اس نے علی کے کمرے کے قریب دیوار پر نصب آئینے میں آخری بار خود کو دیکھا تھا اور جو اپنا آخری عکس اسے یاد تھا وہ اس ریان حیدر سے قطعاً مختلف تھا جسے وہ اب دیکھ رہا تھا۔

یہ وہ نہیں تھا۔ یہ وہ ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ یہ کوئی اجنبی تھا، یہ ریان عظیم حیدر نہیں تھا۔

وہ بہت ہینڈسم نہیں تھا مگر اتنا بدصورت بھی نہ تھا جتنا اس وقت شیشے میں نظر آ رہا تھا۔

اس کی آنکھیں ویسی ہی بھوری تھیں اور شاید یہ وہ واحد شے تھی جو ''ویسی'' ہی تھی۔

وہ اکتیس برس کا تھا، بھرپور جوان مرد، مگر لگ پچاس کا رہا تھا۔ وہ اکتیس برس کی عمر میں بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد ہلکی ہلکی لکیریں پڑ گئی تھیں، ایسی ہی جھریاں اس کے ہونٹوں کے اطراف میں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اس کا چہرہ حیران کن حد تک پتلا ہو چکا تھا۔ جبکہ جلد کا رنگ سرخ و سفید سے کملا کر زرد سا ہو گیا تھا مگر جو اس کے اندر سب سے بڑی تبدیلی آئی تھی جس نے اسے گنگ کر دیا تھا وہ اس کے بال تھے۔

ایک دفعہ کومے کی حالت میں اس نے انیہ یا بیہ کو مما سے اس کے بالوں کے متعلق استفسار کرتے سنا تھا اور

اس کا خیال تھا کہ اس کے بال شاید گر گئے ہیں، کینسر کے مریضوں کی طرح۔

مگر اس کے بال گرے نہیں تھے بلکہ سفید ہو گئے تھے جگہ جگہ سے۔

کتنی ہی دیر وہ اپنے عکس کو دیکھتا رہا، اپنے سامنے موجود ''بوڑھے شیر'' کو دیکھتا رہا پھر اس نے آئینہ آہستگی سے میز پر رکھ دیا۔

وہ رونا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی بھی رونا نہیں چاہتا ہے مگر آنسو نکل آتے ہیں۔ بے بسی کے، لاچاری کے، مجبوری کے......

☆☆☆

وہ سر وہیل چیئر کی پشت سے ٹکائے آنکھیں موندے باہر لان میں بیٹھا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ سرد خنک ہوا ہلکی ہلکی چل رہی تھی۔ فضا میں گھر لوٹتے پرندوں کی چہکار سنائی دے رہی تھی۔

''ٹھک......ٹھک......''

ریان نے قدرے جھنجلا کر آنکھیں کھولیں۔ یہ مسلسل آتی ''ٹھک......ٹھک'' کی آواز اس کی سماعت پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

اس نے بے زاری سے اردگرد نگاہ دوڑائی، اس سے چند گز کے فاصلے پر ہیثم کھڑا بال سے کھیل رہا تھا۔ وہ فٹ بال نہیں، سیاہ ٹیپ سے لپٹی ٹینس بال تھی۔ ٹیپ کے باعث وہ وزنی اور سخت ہو گئی تھی اور زمین پر لگنے سے ''ٹھک......ٹھک'' کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔

ریان بلیو جینز اور گہرے سرمئی رنگ کے سویٹر میں ملبوس ہیثم کو چند ثانیے یونہی تکتا رہا۔

''ٹھک!'' گیند زمین پر زور سے لگ کر فضا میں بلند ہوئی تھی۔

ریان کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔ اسے ان تمام مایہ ناز بیٹس مینوں کی وکٹیں یاد آئی تھیں جو اس نے اپنی باؤلنگ کی جادوگری سے زمین سے اکھاڑ پھینکی تھی۔

''ٹھک......ٹھک......''

ہیثم نے ہتھیلی سے گیند کو دوبارہ نیچے پھینکا اور اس کے زمین سے ٹکرانے سے زوردار آواز بلند ہوئی تھی۔

اس کو وہ تمام شاٹس اور باؤنڈریز یاد آئی تھیں جو اس نے کبھی لگائی تھیں۔

وہ زخمی نگاہوں سے سیاہ ٹیپ میں جکڑی گیند کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس کے ہاتھوں میں بھی ایک سرخ گیند ہوتی تھی۔ کبھی اس کی انگلیاں بھی نہایت مہارت سے گیند کراتی تھیں۔

اس نے بے اختیار اپنے کمزور اور بے حد پتلے ہاتھوں کو دیکھا تھا۔

''ٹھک......ٹھک......ٹھک......''

ایک پگھلا ہوا سیسہ سا تھا جو ریان کے کانوں میں انڈیلا جا رہا تھا۔ اسے لگا کہ وہ مزید وہاں بیٹھا رہا تو شاید اپنے حواس کھو بیٹھے گا یا اس کے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی۔

اس نے مرے مرے ہاتھوں سے وہیل چیئر کا رخ اندر کی جانب موڑا۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے الماری کھول کر اس میں سے سبز رنگ کا کٹ بیگ نکالا اور اس کی زپ کھول کر اندر موجود تمام اشیاء بستر پر پلٹ دیں۔

''ری بیک'' کا بیٹ addidas کی اپسانکس، تھائی پیڈز، پی سی بی کے گولڈن ستارے اور پیپسی کے لوگو والی شرٹ اور اسی رنگ کے ٹراوزر، سرخ گیند، گولڈن ستارے والی ہیلمیٹ اور گہری سبز کیپ۔ یہ اس کی متاع عزیز تھی۔

کولمبو کی گرمی، کینڈی کی بارشیں، بنگلور کی مرطوب فضا، لارڈز (لندن) کی ٹھنڈ اور کیریبئن کی سمندری پانیوں سے لبریز ہوائیں اسے سب یاد آ رہا تھا۔

''ریان!''

وہ بری طرح چونک کر مڑا تھا۔ انیہ جانے کب اس کے عقب میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

ریان نے جواب میں اسے انتہائی دکھی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ وہ خاموش سی ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''رونی! اگر تم سمجھتے ہو کہ اس واقعے نے تمہاری زندگی، تمہاری دنیا بدل ڈالی ہے تو تم غلط ہو۔ تم ایک دفعہ ٹھیک ہو کر واپس جاؤ، دیکھنا سب کیسے تمہارے آگے پیچھے پھریں گے۔'' وہ رسانیت سے کہہ رہی تھی۔

''سب بدل گیا ہے.........ا.........نیہ.....'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ بہت دن بعد وہ بول رہا تھا۔

''But you can change it all'' وہ جوش سے بولی۔ ''تم ایک بار ٹھیک ہو جاؤ تو تم وہی کرنے کے قابل ہو جاؤ گے جو تم ساری زندگی کرتے آئے ہو۔''

''ک.....کیا؟'' ریان نے الجھن سے اسے دیکھا۔

انیہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔ ''بدلہ.....تم ہمیشہ بدلہ لیتے آئے ہو۔ برابر کا بدلہ.....اب بھی وہی کرو جنہوں نے تمہیں بے وقعت کیا ہے، تمہیں غیر اہم جانا ہے، ان سے بدلہ لو۔ چیئر مین پی سی بی سے بدلہ لو۔ اپنی اہمیت ان پر ثابت کرو۔ انہیں بتا دو کہ تم کمزور نہیں ہو، اپنی بقا کے لیے لڑو ریان!'' وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ منت کے سے انداز میں اس کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔

''بقا کی جنگ ہمیشہ خود لڑنا پڑتی ہے۔''

ریان خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لب بھینچے ہوئے تھے مگر وہ پوری توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔

اس رات اس نے صرف انیہ کی باتوں کو سوچا تھا۔ بدلہ لینا اس کی عادت نہیں، فطرت تھی اور انسان لاکھ کوشش کر ڈالے اپنی فطرت بدل نہیں پاتا۔

بدلہ لینے کی پلاننگ کرتے ہوئے اس کے دل و دماغ کی جو حالت ہوتی تھی جو چنگاریاں سی آنکھوں میں بھر آتی تھیں، آج بھی اس کے ساتھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ جلد از جلد ٹھیک ہو جانے کی کوشش کرے گا لیکن اس کی صحت یابی مکمل طور پر اس کی

Will Power پر انحصار نہیں کرتی تھی۔ وہ کب اور کیسے ٹھیک ہوتا ہے اس کا فیصلہ صرف ایک ذات کے ہاتھ میں تھا۔

جلد پر زخم آئے تو بھر جاتا ہے دماغ پر آئے تو کبھی نہیں بھرتا۔

میڈیکل سائنس معجزوں سے انکار نہیں کرتی اور کئی دفعہ میڈیکل ہسٹری میں ایسا ہوا ہے کہ اعصابی نظام بری طرح متاثر ہونے کے بعد بھی مریض چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے البتہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انسان برین انجری کے بعد ''پہلے جیسا'' ہو جائے۔

ریان کا زخم بہت زیادہ مہلک نہیں تھا۔ اسے پاکستان کے بہترین نیورولوجسٹ اور فزیشن کی ٹیم ملی تھی۔ وہ خود بھی اپنی تمام تر ول پاور بروئے کار لا رہا تھا اور سب سے بڑھ کر وہ ایتھلیٹ رہا تھا۔ ان تمام پلس پوائنٹس کے باوجود اس کی جسمانی حالت بحال ہونے میں ڈھائی سال لگے تھے۔

انیہ کا لیکچر سننے کے ٹھیک ایک برس اور دو ماہ بعد وہ بیساکھی کے سہارے چلنے کے قابل ہوا تھا اور مجموعی طور پر ڈھائی سال میں وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت حاصل کر چکا تھا۔

یوں سیڑھیوں سے گرنے کے ساڑھے تین برس بعد اس کو اس کا جسم تو واپس مل چکا تھا مگر اس کی زبان میں لکنت آ گئی تھی۔

''تو کیا ہوا؟ موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں بھی تو لکنت تھی۔'' وہ سوچا کرتا تھا۔

وہ اس بات پر شکر ادا کرتا تھا کہ اس نے کم از کم اسے اس کا باقی سب کچھ تو لوٹا دیا تھا اور اس پر وہ جتنا شکر ادا کرتا کم تھا۔

☆☆☆

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں مما! ہم انسان بہت ناشکرے ہوتے ہیں۔ شر کو ایسے مانگتے ہیں جیسے خیر کو مانگنا چاہیے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں اٹک اٹک کر کہہ رہا تھا۔

مما نے اپنی گود میں سر رکھے ریان کو دیکھا اور نرمی سے اس کے بال سہلائے۔

''پتا ہے ریان! ناشکری انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ صحت یاب ہو کر کبھی طبیب کی یاد نہیں آتی۔ اس کی کشتی طوفان میں پھنس جائے تو اسے صرف خدا یاد آتا ہے۔ پھر وہ خدا اپنے مجبور و بے کس بندے کو سمندر سے نکال کر خشکی پر لے آتا ہے تو بندہ یک دم سب کچھ فراموش کر دیتا ہے۔ اللہ ان کو زیادہ عزیز رکھتا ہے جو سکھ میں بھی عاجزی اختیار کیے رہتے ہیں۔''

''مجھے یاد ہے مما! آپ بچپن میں ک...... کہا کرتی تھیں کہ ہمیشہ یہ د...... دعا کیا کرو کہ اللہ، ہمیں ک...... کسی کام ...... محتاج نہ کرے اور م...... میں نے ک...... کبھی یہ دعائیں نہیں کی، کبھی امپورٹینٹ ہی ن...... نہیں جانا۔'' وہ آنکھیں موندے کہہ رہا تھا۔

''بیٹا! ہمیشہ دعا صحیح مانگنا چاہیے۔ کبھی یہ مت مانگنا کہ اللہ صبر عطا کر۔ صبر کی دعا کبھی مت کرنا۔''

''کیوں؟'' ریان کو حیرت ہوئی تھی۔

''کیوں کہ صبر انسان مصیبت میں کرتا ہے جو شخص اپنے لیے صبر مانگتا ہے اللہ اس پر مصیبتیں نازل کرتا ہے۔ ہمیشہ دعا کیا کرو کہ اللہ آزمائشوں سے محفوظ رکھے اور اگر آزمائش آئے بھی تو گھبرانا نہیں چاہیے۔ حضرت علیؓ نے کہا تھا جس شخص پر ایک برس تک کوئی مصیبت نہ آئے وہ سمجھ لے کہ اس کا رب اس سے ناراض ہے۔''

ریان نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور انہیں دیکھا پھر گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔''کم از کم میرا رب مجھ سے ناراض نہیں ہے۔''

''جو شخص بیمار ہوتا ہے اس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ بیماروں سے دعا کروانی چاہیے ان کی دعا جلدی قبول ہوتی ہے اور بعض لوگ بیماری میں دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ موت دے دے۔ چچ۔''انہوں نے تاسف سے سر جھکا۔

''مما! میں نے کافی عرصہ ہوا، اس ایکسیڈنٹ سے پہلے ایک خواب دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ مجھے میرے بھائیوں، بہنوں اور باپ نے قبر میں اتار دیا ہے مگر ماں ان میں شامل نہیں تھی۔''

''وہ اس لیے کہ جب تمہیں کومے میں گئے چھٹا ماہ ہو گیا تھا تو سب تمہاری طرف سے مایوس ہو گئے تھے سوائے تمہاری ماں کے۔ صرف میں تھی جو کہتی تھی کہ میرا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔''وہ مسکراتے ہوئے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھیں۔

''مما''وہ چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لیے پوچھ رہا تھا۔

''یہ ماں اتنی پرامید کیوں ہوتی ہے؟''

''ریان! تم ماں کی کیمسٹری نہیں سمجھ سکتے۔''انہوں نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا تھا۔

''سمجھ سکتا ہوں۔''ریان نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔

''ماں اور خدا، وہ ہستیاں ہیں، جن کی محبت، رحمت اور شفقت بے حساب ہوتی ہے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی روز نافرمانی ہوتی ہے، لوگ اس کی ذات کو ماننے سے انکاری ہوتے ہیں مگر کیا وہ انہیں روزی دینا بند کر دیتا ہے؟ کیا چشمے سوکھ جاتے ہیں؟ کیا اناج کا قحط پڑ جاتا ہے؟ نہیں نا! وہ اپنے نافرمان بندوں کو بھی رزق دیتا ہے۔ خدا جب بھی کسی بات کو واضح کرنا چاہتا ہے وہ انتہائی خوب صورت تشبیہات کا استعمال کرتا ہے۔ قرآن میں جنت وجہنم، عذاب وثواب، ہر شے کو مثال دے کر واضح کیا گیا ہے مگر جب بات آتی ہے بنی نوع انسان سے محبت واضح کرنے کی وہ فوراً کہتا ہے میں ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والا ہوں۔

اللہ کسی اور کی مثال دیتا، شوہر کی محبت، بھائی کی محبت، بہن کی محبت، بیوی کی محبت، دوستوں، قرابت داروں کی محبت سے اپنی محبت کا موازنہ کرتا مگر نہیں اس نے ماں کی مثال دی کیوں کہ دنیا میں سب سے زیادہ بے غرض، بے لوث اور قابل اعتبار محبت ماں کی ہے۔

''ماما!''چند لمحوں بعد وہ دھیرے سے بولا۔''آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے، اپنا آپ قربان کر دیا ہے میں تو......مم......میں تو آپ کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔''

''میں نے جو کیا وہ ہر ماں کرتی ہے۔ بس اولاد کو احساس نہیں ہوتا۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو شروع کے تین

چار برس ہر ماں وہی کرتی ہے جو میں نے پچھلے ساڑے تین برس کیا مگر بچے اس وقت شعور کی منزل پر نہیں پہنچے ہوتے۔ جس وقت وہ باشعور ہوتے ہیں انہیں ماں کی جو سروس نظر آتی ہے وہ چوبیں گھنٹے ڈیوٹی کرنے والی ایک نوکرانی کی سی ہوتی ہے۔ ہر وقت ایک گھن چکر بنے رہنا، مگر اولاد چونکہ اس فیز سے نکل چکی ہوتی ہے جب ماں صرف ان کے لیے سب کچھ کرتی تھی تو انہیں فیل نہیں ہوتا۔

بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور ماں باپ بوڑھے۔ بچے اپنی دنیا میں مگن ہو جاتے ہیں رہائش الگ کر لیتے ہیں اور اس وقت یہ نہیں سوچتے کہ ان کے پاس تو مصروف رہنے کے لیے کئی دلچسپیاں ہیں مگر ان کے والدین کی واحد ''دلچسپی'' تو وہ خود تھے اور جب ان کی اولاد بڑی ہو کر دنیا کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہے تب انہیں دو بوڑھے وجود یاد آتے ہیں مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔''

''لیکن مما! آج...... جس عمر میں میں نے آپ کی م...... محبت کی گرمائش محسوس کی اور آپ کی مشققتیں دیکھی ہیں مجھے اپنا وجود آپ کے احسان تلے دبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔'' اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا ''پتا ہے مما! مجھے کیا لگتا ہے؟ مجھے ل...... لگتا ہے کہ میں تو کبھی آپ کے سامنے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کر سکوں گا۔ میں کتنا غلط سوچتا تھا کہ آپ مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔''

''اتنا منفی نہیں سوچو ریان!'' انہوں نے پیار سے تنبیہہ کی۔

''منفی!'' اس نے زیر لب دہرایا اور اپنا سر ان کی گود سے نکال کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''میں کل حاریہ کی طرف جاؤں گا۔''

''حاریہ کی طرف؟'' مما نے بھنویں سکیڑیں۔ ''کیوں؟''

داؤد صاحب نے شروع کا پورا سال طلاق کا مطالبہ جاری رکھا تھا مگر جیسے جیسے ریان کی حالت میں بہتری آتی جارہی تھی انہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

''بس ایسے ہی۔ بہو ہے وہ اس گھر کی۔ اسے واپس آنا چاہیے نا!'' وہ مبہم سے انداز میں دیواروں کو گھورتے ہوئے بولا۔

''ہاں، ٹھیک ہے، اچھا ہے۔'' وہ خوش ہو گئی تھیں۔

''مما! آپ نے کبھی کتے کی دم دیکھی ہے؟''

''کیا؟'' انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں۔'' وہ کچھ سنبھل کر بولیں۔

''وہ سو سال بھی نلکی میں پ...... پڑی رہے تو و...... ویسی ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔'' جیسے کھوئے کھوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ رانیہ الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

مسلسل ہوتے ہارن پر رحیم دین نے جھنجھلا کر پانی والا پائپ جس سے وہ کیاری میں پانی دے رہا تھا

گھاس پر پھینکا اور اپنی ٹوپی درست کرتے ہوئے گیٹ کی جانب بڑھا۔
باہر ایک سیاہ رنگ کی لیانہ کھڑی تھی۔ رحیم دین کو دیکھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے ہارن سے ہاتھ ہٹایا اور اشارے سے گیٹ کھولنے کو کہا۔ اس کے انداز میں ایسا تحکم اور تمکنت تھی کہ رحیم دین نے بغیر کچھ پوچھے حکم کی تکمیل میں عافیت جانی۔
گیٹ کھلتے ہی سیاہ چمکتے شیشوں والی کار زن سے اندر داخل ہوئی اور ڈرائیو وے سے گزرتے ہوئے پورچ میں کھڑی تین گاڑیوں کے پیچھے پہنچ کر رک گئی۔
دروازہ کھول کر جو شخص باہر آیا تھا رحیم دین اس سے واقف نہ تھا۔ وہ ایک اونچا لمبا آدمی تھا جو گہرے سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے ٹائی نہیں باندھی تھی اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھایا ہوا تھا۔
رحیم دین جلدی سے اس کی جانب لپکا۔
''داؤد صاحب ہیں؟ گو کہ پورچ میں موجود تین گاڑیاں ان سب کے گھر میں موجود ہونے کی چغلی کھا رہی تھیں اس کے باوجود اس نے پوچھا تھا۔
''جی صاب...... وہ ناشتہ کر رہے ہیں۔''
''ہوں!'' اس نے سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا۔''ڈائننگ روم، لاؤنج سے دائیں طرف ہے نا!'' وہ اچانک رحیم دین سے پوچھنے لگا۔
''جی نہیں، بائیں طرف ہے۔'' رحیم دین نے اچنبھے سے جواب دیا۔ اس نے اس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا پھر بھی اس کا چہرہ شناسا لگ رہا تھا۔
''اوہ اچھا۔'' اس نے گہری سانس لی۔
وہ اندر جانے کو مڑا اور جب تک رحیم دین اسے روکتا وہ اندر جا چکا تھا۔
وہ آخری دفعہ اس گھر میں کب آیا تھا اسے ٹھیک سے یاد نہ تھا، نہ ہی وہ یاد کرنا چاہتا تھا۔
ذہن میں جمع ہر طرح کے خیالات کو جھٹک کر وہ لاؤنج میں سے ہوتے ہوئے ڈائننگ ہال میں چلا آیا اور دروازے کو ہلکا سا بجا کر گویا اپنی آمد کی اطلاع دی۔
ڈائننگ ہال اور ڈرائنگ روم کے درمیان نفیس جالی دار پردے سے پارٹیشن کیا گیا تھا۔ آبنوسی لکڑی کی بنی خوب صورت ڈائننگ ٹیبل کے اردگرد اسی طرح کی چھ کرسیاں رکھی تھیں جن میں سے تین پر گھر کے افراد جلوہ افروز تھے۔
آہٹ پر داؤد صاحب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور پھر منہ تک جاتا فورک (کانٹا) جس پر توس کا ٹکڑا لگا تھا واپس پلیٹ میں آ چکا تھا۔ آخری بار وہ ریان سے چار ماہ پہلے ملے تھے۔
مگر ریان دیکھ رہا تھا وہ حارنیہ کا چہرہ تھا۔ وہ کچھ حیران کچھ پریشان و بے یقینی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔
''ریان!'' داؤد صاحب استقبال کے لیے اٹھے تھے ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی۔ آخر کو ریان ان کا داماد تھا جو کبھی بیمار سہی مگر اب بالکل ٹھیک تھا۔

وہ آگے بڑھے اور اس سے معانقہ کیا، ان کے انداز میں گرم جوشی تھی۔ ریان بھی اسی گرم جوشی سے ان سے اور دردانہ آنٹی سے ملا جن کے فیشل زدہ چہرے پر ایک میٹھی سی مسکراہٹ تھی۔

''آؤ بیٹھو بیٹا۔'' وہ اسے ہمراہ لیے ڈرائنگ روم میں آگئے۔

''میں ذرا جلدی آگیا شاید......چھٹی کا دن تھا، اس لیے۔'' وہ وضاحت سے کہتے ہوئے صوفے پر نہایت تکلف سے بیٹھ گیا۔

حاریہ بھی کچھ جھجکتے ہوئے اس کے مقابل صوفے پر ٹک گئی۔ وہ ریان کو دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ یہ اس کی شکل سے ظاہر تھا۔

''اٹس او کے۔ ہم بس ناشتہ ہی کر رہے تھے۔'' پھر کچھ سوچتے ہوئے پوچھنے لگے۔ ''تم نے ناشتہ کیا؟''

''جی!'' اس نے نگاہوں کا رخ حاریہ کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی مگر اس کو اپنی طرف دیکھتا پا کر فوراً اپنے ناخنوں کی جانب متوجہ ہوگئی۔

''کیسے ہو تم بھئی؟ طبیعت ٹھیک ہے نا! بس اللہ کا بڑا کرم ہے، مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' داؤد صاحب بڑی اپنائیت سے کہہ رہے تھے۔

ریان کے لبوں پر ایک مسکراہٹ رینگ گئی۔

''جی...... یہ تو آپ کا بڑا پن ہے کہ آپ کو میرے ٹھیک ہونے کا یقین تھا ورنہ لوگ تو مجھ سے چھٹکارا پانے کی تمنا کر رہے تھے۔''

''لوگوں کی باتوں پر مت جایا کرو۔'' دردانہ آنٹی فوراً بولی تھیں۔ ''اچھا، کیا لو گے؟ اپنا گھر ہے بے تکلف ہو کر بتاؤ۔''

'کولڈ ڈرنک، اگر لیمن اسپرائٹ ہے تو وہ۔'' دردانہ آنٹی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ واقعی بے تکلف ہو کر بتا دے گا لیکن ان کو اس کے انداز پر خوشی ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئیں۔

''اب آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟'' عظیم اور رانیہ کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد وہ استفسار کرنے لگے۔

''جس کام کو دل کیا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''ویسے بیٹا! ہمیں تو تمہارا بہت انتظار تھا، کوئی اور ہوتا تو بیٹی کو نہ بٹھائے رکھتا، کورٹ چلا جاتا، مگر ہم نے تمہارا انتظار کیا اور مجھے تو پکا یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔''

ریان نے ایک اچٹتی سی نظر حاریہ پر ڈالی۔ ''جی۔'' وہ رسان سے گویا ہوا۔ ''یقین ہونے کے باوجود آپ نے ریا کو خلع دلوانے کی کوشش تو کی تھی نا!''

''وہ تو......'' داؤد صاحب نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''وہ تو حماقت تھی۔'' وہ بہ مشکل بول پائے تھے۔

''کس کی؟'' ریان نے سنجیدگی سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''م......میری بیوی کی۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ یہ عورتیں کتنی احمق اور ناسمجھ ہوتی ہیں۔'' وہ صفائی پیش

کر رہے تھے۔

''مگر میں تو احمق نہیں ہوں، میں نے حاریہ کو طلاق نہیں دی۔''

''یہ تو تمہاری عقل مندی اور نیکی ہے کہ تم نے دردانہ کا فضول اور بے جا مطالبہ نہیں مانا۔'' داؤد صاحب دوسروں کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانے کے عادی تھے۔

''جی ہاں۔'' وہ حاریہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''ریا تو ایسا بالکل نہیں چاہتی تھی۔'' وہ اس کا دل بیٹی کی جانب سے صاف کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''اچھا، واقعی۔'' ریان نے اس کی جانب دیکھ کر تائید چاہی تھی۔ حاریہ نے باپ کو دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مگر میں نے تو سنا تھا کہ آپ نے میرے کومے سے نکلنے سے پہلے ریا کی پسندیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے لیے ایک عدد لڑکا تلاش کر لیا تھا مگر میرے ہوش میں آنے کے بعد آپ کو میرے ٹھیک ہونے کا یقین ہونے لگا تھا۔ کیا ایسا ہوا تھا؟''

داؤد صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی تھی۔ ریان نے نظروں کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

''اچھا، مجھے غلط فہمی ہوئی تھی شاید۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا'' دراصل جب کومے میں تھا تو بھانت بھانت کی بولیاں سماعت سے ٹکراتی تھیں لوگوں کو ان کی آوازوں سے پہچانتا تھا۔ ایک صاحب حاریہ، میرا طلاق، خلع'' وغیرہ کا ذکر کر رہے تھے۔ ان کی آواز پہ آپ کا گمان ہوا تھا۔ اب آپ کہہ رہے ہیں ظاہر ہے آپ سچ ہی کہہ رہے ہوں گے۔''

اس نے لاپروائی سے مگر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چھوڑو ماضی کی باتوں کو دہرانے کا کیا فائدہ۔'' وہ گفتگو کا رخ کسی اور طرف موڑنا چاہ رہے تھے۔

''میں کوئی کاروباری شخص تھوڑی ہوں جو فائدہ نقصان دیکھوں؟'' اس نے ناک پر سے مکھی اڑائی'' ویسے ریا'' اس نے دوسرے صوفے پر بے چینی سے پہلو بدلتی ریا کو نظروں کے حصار میں لے کر کہنا شروع کیا۔''تمہاری تو شکل ہی بھول گئی تھی۔''

وہ ساڑھے تین سال تک اس کے نکاح میں ہونے کے باوجود اس سے ملنے نہیں آئی تھی۔

جواباً ریا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''بس وہ......آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' وہ شرمندہ تھی، اسی لیے جلدی سے بات بدلی۔

''فائن! تم کیسی ہو؟'' وہ بڑی سرد و سپاٹ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''بیٹا! آپ لوگ بیٹھ کر باتیں کرو میں ذرا چینج کر آؤں۔'' وہ منظر سے ہٹنا چاہ رہے تھے۔

''کبھی چکر نہیں لگایا تم نے؟'' ان کے جانے کے بعد وہ دوبارہ وہی بات دہرانے لگا۔

''وہ۔ دراصل آپ بیمار تھے۔ بہت افسوس ہوتا تھا۔ میں...... میں دل کی بہت کمزور ہوں، یوں لگتا تھا کہ اگر آپ کو دیکھ لیا تو خود پر شاید قابو نہیں پاسکوں گی۔'' اپنے تئیں ریا نے کافی اچھی وضاحت دی تھی۔

ریان اس دن بہت اچھا لگ رہا تھا اس کو ریا نے پہلی بار تھری پیس سوٹ پہنے دیکھا تھا گو کہ اس کے گھرے براؤنش بالوں میں کہیں کہیں سفید بال جھلک رہے تھے مگر وہ اس کے نکھرے نکھرے، اجلے اجلے چہرے کو کافی سافٹ لک دے رہے تھے۔ اس کی صورت میں وہ پہلے جیسی بات تو نہیں رہی تھی مگر یہ حقیقت تھی کہ اگر پہلے وہ ہینڈسم تھا تو اب گریس فل ہوگیا تھا۔

''اچھا!'' ریان نے ایک طویل سانس اپنی اندر کھینچی۔ ''بہت ڈراؤنا ہوگیا تھا نا میں بیماری کے دوران؟ اب بھی کافی مضحکہ خیز سا ہوں...... بوڑھا بوڑھا سا۔'' وہ زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

ریا نے سر اٹھا کر کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر اس کے تاثرات دیکھ کر رک گئی۔

''تم نے شاید اسی لیے طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔ ٹھیک مطالبہ تھا تمہارا۔ میں تمہاری خواہش کو Justify کرتا ہوں، تم ایک معذور انسان کے ہمراہ تو نہیں رہ سکتی تھیں نا!''

''مگر اب تو تم بالکل ٹھیک ہو۔'' اس کے لبوں سے پھسلا۔

''اب کی بات کون کر رہا ہے میں تو ماضی کی بات کر رہا ہوں۔'' جانے کیوں آج وہ ہکلا نہیں رہا تھا۔

''ماضی دہرانے سے کیا فائدہ! ہم ماضی کے بجائے مستقبل کی بات کر لیتے ہیں۔''

''مستقبل کی کیوں؟''

''کیونکہ...... جو ہو چکا، سو ہو چکا۔ اسے بھول جاؤ۔''

''بھول جاؤں؟'' اس بار وہ ہکلایا تھا'' ک...... کاش کہ یہ اتنا آسان ہوتا۔''

''زندگی کی...... نئی زندگی کی شروعات کرتے وقت پرانی باتوں کو بھلا دیا کرتے ہیں ریان!'' وہ نرمی سے سمجھانے والے انداز میں بولی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب میں ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہا ہوں۔ میں واقعی ماضی کو بھلانا چاہتا ہوں۔ میں سب کچھ بھلانا چاہتا ہوں۔''

''ویٹس گریٹ۔'' وہ کھل کر مسکرائی مگر وہ اسی طرح اسے دیکھتا رہا۔

''ریا! میں تمہارے گھر تمہارے لیے ایک تحفہ لے کر آیا ہوں۔ تم نے اسے مجھ سے بہت پہلے مانگا تھا، اس ٹائم دینے کا حوصلہ نہیں تھا، اب ہے۔'' اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک خاکی لفافہ نکال کر میز پر رکھا۔

''پہلے تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ اس میں ڈائیورس پیپرز کے علاوہ حق مہر کا چیک اور مزید نان نفقہ وغیرہ کی رقم بھی موجود ہے۔ یہ تمہاری خواہش تھی میں نے پوری کر دی۔ امید ہے تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی نہ ہی مجھے تم سے ہے۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بغیر کچھ کہے، ساکت بیٹھی حاریہ کو وہیں چھوڑ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔
وہ کتے کی دم کی طرح تھا، جو کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔ بدلہ لینا اس کی فطرت تھی، وہ چاہنے کے باوجود اسے نہیں بدل سکتا تھا۔

☆☆☆

''ریان!'' دروازے کی ناب کی جانب بڑھتا اس کا ہاتھ یک لخت رک گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ جب بھی فوراً مڑتا تھا اس کی کمر میں ایک ٹیس اٹھتی تھی۔
''آ گئے!'' رانیہ اس کی جانب بڑھتے ہوئے بشاشت سے کہنے لگیں۔ ''ریا سے ملے؟''
''ہوں۔'' اس نے مختصراً کہہ کر سر ہلا دیا۔
''پھر؟'' وہ غالباً تفصیلات جاننا چاہتی تھیں۔
''پھر کیا مما جب میں مم...... مر رہا تھا تت...... تو وہ مجھے پوچھنے تک نہیں آئی۔ ہم د...... دونوں بھلا ک...... کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ چل سکتے ہیں؟''
''کیا مطلب؟'' انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ان کا خیال تھا وہ ریا کو لینے گیا تھا مگر وہ تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔
''مما! میرا ظرف اتنا بڑا نہیں ہے کہ میں وہ تت...... تمام باتیں بھول جاؤں...... جج...... جو میری بے ہوشی کے دوران لوگوں نے کہی تھیں...... کک...... کتنی بار مطالبہ کیا تھا ریا لوگوں نے طلاق کا!'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔
''تو تم نے کیا کہا اس سے؟'' انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔
''کہنا کیا تھا میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔'' وہ رسانیت سے گویا ہوا۔
''ریان!'' وہ شاکڈ رہ گئیں۔ انہیں کم از کم اس سے یہ توقع نہ تھی۔
''سوری مما! مگر میرا اتنا ظرف نہیں ہے، میں اسے معاف کر دیتا تب بھی شاید اس کے ساتھ چل نہ پاتا۔ یہ تو وہ عورت ہے جس نے میرے سیڑھیوں سے گرنے پر میرا ساتھ چھوڑ دیا، اب جب کہ میں دوبارہ سیڑھیاں چڑھنے کے قابل ہوا ہوں تو وہ میرا ساتھ...... قبول کرنے کو تیار ہے؟ کل کو میں پھر اپاہج ہو گیا تو وہ مجھے پھر چھوڑ جائے گی'' وہ دوٹوک انداز میں کہہ رہا تھا۔
''لیکن ریان۔ تم مجھے بتاتے تو سہی۔''
''بتا دیتا تو آپ مجھے منع کر دیتیں اور میرے اندر آپ کی بات ٹالنے کا حوصلہ نہیں ہے مما! اف...... فارگاڈ سیک مما! میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔'' وہ شکستگی سے کہنے لگا۔
رانیہ نے اسے تاسف سے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''ریان تم اس لڑکی کی جگہ خود کو رکھ کر سوچو، وہ جوان، خوبصورت لڑکی تھی وہ بھلا کس طرح......''
''مم...... میں نے یہ سب سوچا ہے مما۔'' وہ تیزی سے بولا۔ ''مم...... مگر میں اس نن...... نتیجے پر پہنچا ہوں

کہ دنیا میں کتنی ہی عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن...... جن کے شوہر معذور ہو جاتے ہیں تو کیا وہ ان کو چھوڑ جاتی ہیں؟
نن...... نہیں مما! ہر کوئی نہیں چھوڑتا! بس ریا جیسی لڑکیاں چھ...... چھوڑ دیتی ہیں۔"

"اچھا تم یہ بتاؤ، تم ڈپریسڈ تو نہیں فیل کر رہے اپنے فیصلے پر؟" انہوں نے جانچتی نگاہوں سے ریان کا چہرہ دیکھا۔ جواباً وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

"میں بالکل مطمئن ہوں مما! آئی ایم فائن۔ بس اب سوؤں گا۔"

"اوکے۔ اب تم آرام کرو۔" وہ چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لیے وہاں سے ہٹ گئیں تو ریان دروازہ کھول کر اندر کمرے میں چلا آیا۔

شام کو جب وہ سو کر اٹھا تو فریش ہو جانے کے بعد کمرے سے باہر نکلتے ہی لگا تھا کہ اپنے ذکر پر اس کے قدم خود بخود رک گئے۔

"میرا خیال ہے اس نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔" اس کی سماعت سے ڈیڈ کی گمبھیر آواز ٹکرائی۔ وہ غور سے سننے لگا۔ "اگر وہ خود نہ کرتا تو میں اسے یہی مشورہ دیتا۔"

"ڈیڈ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔" یہ علی تھا۔ "آپ کو یاد نہیں مما! ان لوگوں نے ہمیں کتنا تنگ کیا تھا۔ کس طرح ہمیں ہرٹ کیا تھا۔"

"وہ ٹھیک ہے علی! لیکن اگر دونوں نبھا کر لیتے تو بہتر تھا۔" انیہ کی آواز میں گہرا تاسف تھا۔

"اوہو۔ ایک تو تم عورتیں بھی نا، انتہائی کم عقل اور بے وقوف ہوتی ہو۔" علی نے جھنجھلا کر کہا۔

ریان کے لبوں پر مسکراہٹ اور پورے وجود پر سرشاری سے پھیل گئی۔ وہ بالکل مطمئن تھا۔

☆☆☆

وہ نڈھال سا ہو کر صوفے پر گر گیا۔

پہلے کبھی ایکسرسائز کرنے کے بعد اس کو اتنی تھکاوٹ نہیں ہوئی تھی۔ جتنی آج ہوئی تھی۔

وہ گہری سانسیں لیتے ہوئے اپنا تنفس بحال کرنے لگا۔

وہ ابھی ابھی جم سے آیا تھا۔ اس کے ڈاکٹر نے اسے جم جانے سے منع کیا تھا اور جسمانی مشقت نہ کرنے کی تاکید کی تھی مگر ریان پچھلے اتنے برس ڈاکٹروں کے زیر سایہ رہنے کے بعد ان سے مکمل طور پر فیڈ اپ ہو چکا تھا۔

"اس سے کچھ فاصلے پر قالین پر جبرائیل بیٹھا اسکول کا کام کر رہا تھا۔ وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے ان کے پاس رہ رہا تھا۔ اس کا باپ بے حد مصروف آدمی تھا۔ اس لیے مما اسے لے آئی تھیں۔"

جب چھ مہینے تک اس کے باپ نے رجوع نہیں کیا تو وہ قانونی طور پر ان کے گھر کا فرد بن گیا۔

"ہے۔ جبرائیل!" اس نے اسے پکارا۔ کام کرتے جبرائیل نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔ اس کی بھوری آنکھیں، تیکھی ناک، پتلے ہونٹ، سب کچھ میرین سے مشابہ تھا اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔

"سنو۔ تم یہاں بور تو نن...... نہیں ہوتے؟" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نو......''اس نے جھٹ نفی میں سر ہلا دیا۔

''میں ۔ میں ایک دو دن لاہور جا رہا ہوں تم چلو گے میرے ساتھ؟'' وہ بغور جبرائیل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھنے لگا۔

وہ کام چھوڑ کر اس کے پاس چلا آیا اور میز پر بیٹھنے لگا تو ریان نے اسے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

''لاہور میں فن لینڈ ہے؟''

''ہوں۔''اس کے شانوں کے گرد بازو حمائل کر کے ریان نے بڑے پیار سے جواب دیا۔

''اور Zoo ہے؟''

''بالکل ہے۔'' وہ بے اختیار مسکرا پڑا۔

''اور واٹر پارک ہے اور وہاں سی این آتا ہے؟''

''ہاں۔ سب ہے۔''

''بس پھر ٹھیک ہے۔'' جبرائیل نے ہاتھ اٹھا کر حتمی لہجے میں کہا تو وہ بے ساختہ ہنس دیا۔

☆☆☆

لاہور کا یہ گھر اپنے اندر بے شمار یادیں سمیٹے ہوئے تھا۔ اس نے زندگی کا ایک بڑا حصہ یہاں گزارا تھا۔ اتنا عرصہ گھر بند رہنے کے باعث دیواروں پر جالے لگ چکے تھے۔ لان کی گھاس کافی اگ آئی تھی۔ غرض پورا گھر ہی مٹی سے اٹا تھا۔

''ہک......ہا'' ریان نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''میں یہ سب صاف کرنے لگا ہوں، تم میری ہیلپ کرو گے؟'' اس نے جبرائیل سے پوچھا، اس نے جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا۔

سارا سامان پورچ میں رکھ کر ریان نے اسٹور روم سے جھاڑو اور ڈسٹنگ کرنے والے کپڑے نکالے اور دونوں شروع ہو گئے۔

تقریباً پون گھنٹے میں چمکنے لگا تھا۔ ابھی لان کو بھی صاف کرنا تھا مگر ان دونوں میں حوصلہ نہ تھا۔ وہ تھک کر چور ہو چکے تھے۔ فوراً پیزا ہٹ فون کر کے دو عدد پیزا منگوائے اور بستر پر لیٹ گئے۔

''تھک گئے؟'' ریان نے اس کی صورت دیکھ کر پوچھا۔

''ہوں۔'' اس نے مرے مرے انداز میں جواب دیا اور ریان کو دیکھا دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر بے اختیار ہی ہنس پڑے۔

دونوں اس وقت انتہائی مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔ گرد سے اٹی صورتیں، الجھے الجھے بال، بے ترتیب حلیہ۔ بیل ہوئی تو ریان شرٹ پہن کر باہر گیا اور پیزا وصول کر کے ادائیگی کی۔ پیزا ہٹ کے باوردی ملازم نے اسے بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔

اندر پہنچتے ہی وہ دونوں پیزا پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ریان نے شرٹ دوبارہ اتار دی تھی اور پیزا کھاتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ جبرائیل اس کی دائیں پسلی کے قدرے نیچے موجود زخم کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ کیا ہوا؟'' اس نے سرخ نشان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ۔'' ریان نے پرانے زخم کو دیکھا ''نہیں، یہ تو کافی پرانا ہے بال لگی تھی۔''

''او ہ اچھا۔ اس میں درد تو نہیں ہوتا؟'' وہ معصومیت سے پوچھنے لگا۔

''نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اس کے گال پر چٹکی لی۔ ''میں نہانے جا رہا ہوں، پھر تم بھی نہا لو۔ اس کے بعد سو جاتے ہیں کل پھر انشاءاللہ ان کی صفائی کریں گے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''آل رائٹ بابا!'' اس نے ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ وہ اب اسے بابا کہتا تھا۔ ریان نے اسے اپنا بیٹا جو بنا لیا تھا۔

☆☆☆

بہت عرصے بعد اس نے اس آفس میں قدم رکھا تھا۔

وہ سست قدموں سے چلتا ہوا شیشے کی سطح والی ٹیبل تک پہنچا اور اپنی سوکھی ہوئی زرد انگلیوں سے چکنے، ٹھنڈے شیشے کو چھوا۔ وہ جیسے خود کو یقین دلانا چاہ رہا تھا کہ وہ حقیقت ہے، خواب نہیں۔

اس نے اپنی قذافی سٹیڈیم میں واپسی کا منظر تخیل میں اتنی بار دیکھا تھا کہ اب اس کو اصل میں محسوس کرتے ہوئے وہ سب خواب سا لگ رہا تھا۔

کتنی ہی دیر وہ اس ''پاور آفس'' میں گھوم پھر کر جائزہ لیتا رہا، پھر اس کرسی پر بیٹھ گیا جس پر بیٹھ کر ہر شخص کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔

ارمغان پچھلے ڈھائی سال سے کپتان تھا، مرزا صاحب کا اقتدار تو ظاہر ہے اپنے وقت پر ختم ہونا تھا۔ اب جب تک انہوں نے رہنا تھا ارمغان نے بھی رہنا تھا۔ ویسے وہ اچھا کپتان تھا مگر بہت جلد پریشر میں آ جاتا تھا۔

لیکن ہر شخص کا ایک وقت ہوتا ہے اگر آپ کا دن نہیں ہے تو آپ جتنی کوشش کر لیں کامیاب نہیں ہو سکتے اور مرزا صاحب کا وقت ختم ہو چکا تھا۔

وہ دن، 21 اگست کا وہ دن، صرف اور صرف ریان حیدر کا دن تھا۔

☆☆☆

وہ عجلت میں دروازہ کھول کر اندر آئے تھے، ریان کھڑکی کے آگے کچھ اس طرح سے کھڑا تھا کہ اس کی پشت مرزا صاحب کی جانب تھی۔ اس نے بڑی بے نیازی سے دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔

''آپ کی تعریف؟'' پیچھے سے ہی مگر اس کی شخصیت دیکھ کر مرزا صاحب تھوڑے بہت مرعوب ضرور ہوئے تھے۔ اس لیے خوش مزاجی سے پوچھا۔

ریان ان کے سوال پر زیر لب مسکراتے ہوئے مڑا آنکھوں پر لگے خوبصورت اور اسٹائلش سیاہ گلاسز اتار کر

شرٹ کے گریبان میں لاپرواہی سے لگاتے ہوئے وہ بولا تھا۔

''مجھے ریان عظیم حیدر کہتے ہیں۔''

بچھو ڈنگ مارے تو انسان کی وہ حالت نہیں ہوتی جو اس وقت مرزا صاحب کی تھی۔ ان کے چہرے پر پہلے شاک کے آثار دکھائی دیے پھر یہ تبدیل ہو کر حیرت اور پریشانی میں ڈھل گئے۔ وہ بیورو کریٹ تھے۔ ''مستقبل'' کا اندازہ کر سکتے تھے۔

''ر......ر......ریان......'' انہوں نے بمشکل تھوک نگلا تھا۔

''تت......تم اس وقت۔ میرا مطلب ہے تم ہسپتال تھے۔'' اور......وہ تو اس شخص کو ساڑھے تین برس پہلے دفنا چکے تھے یہ پھر کہاں سے نکل آیا تھا۔

''میں تو ڈھائی تین سال پہلے ہی ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آ گیا تھا۔'' وہ آج ہکلا نہیں رہا تھا، اس کا لہجہ اور آواز بالکل متوازن اور مضبوط تھی۔

''آ......آ......اچھا'' انہوں نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا ''آؤ بیٹھو نا۔'' وہ اپنی کرسی کی جانب بڑھے۔

''مجھے بیٹھنے کے لیے آپ کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے مرزا صاحب!'' وہ بے تاثر لہجے اور سپاٹ چہرے کے ساتھ کہتے ہوئے بیٹھ گیا۔

اپنی سیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے انہوں نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا تھا۔ ریان حیدر ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ انہیں ''سر'' کہہ کر بلاتا تھا اور آج......

''آ......کیا لوگے؟ ٹھنڈا یا چائے، کافی وغیرہ؟'' وہ نشست سنبھالتے ہوئے محتاط انداز میں پوچھنے لگے۔

''کیا لوں گا؟'' ریان نے استہزائیہ انداز میں ان کی بات دہرائی۔ ''میں کپتانی واپس لوں گا۔''

''ریان! ایسا ہے کہ......'' وہ خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''تم میرا مطلب ہے تم ساڑھے تین سال کرکٹ سے دور رہے ہو، اس لیے تم ایک دم تو کرکٹ میں واپس نہیں آ سکتے۔ تمہیں کچھ عرصہ پریکٹس اور ڈومیسٹک لیول پر کھیلنے کی ضرورت ہے۔''

ریان کے لبوں پر ایک تبسم بکھر گیا۔

''مرزا صاحب!'' وہ چبا چبا کر کہنے لگا۔ ''میں نے آپ سے مشورہ نہیں مانگا۔''

اس کے اور مرزا صاحب کے درمیان آبنوسی لکڑی کی بنی وہ میز اور چند مصلحتیں حائل تھیں۔ ورنہ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے گردن سے دبوچ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیں، مگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔

''دیکھو ریان!'' وہ نپے تلے انداز میں گویا ہوئے۔

''جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''جذباتی کون ہو رہا ہے؟'' اس نے ان کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔ وہ لب بھینچ کر رہ گئے۔

''ریان! میری بات سنو۔'' وہ بے چارگی سے بولے۔

''نہیں۔ آپ میری بات سنیں۔'' وہ اسی ٹھنڈے انداز میں بولا۔ ''میں نے ساڑھے تین برس انتظار کیا ہے، اب اور نہیں۔ آپ نے مجھے ''مردہ'' اور ''لاش'' سمجھ لیا تھا، آپ کے خیال میں، میں واپس نہیں آسکتا تھا مگر میں آگیا ہوں اور میں آپ سے اپنی کیپ مانگنے نہیں آیا، میں آپ کو انفارم کرنے آیا ہوں۔ آپ وزیراعظم کو جواب دہ ہیں، جس دن حکومت گئی آپ فارغ ہو جائیں گے۔ پھر کیا ہوگا؟ آپ گھر واپس چلے جائیں گے اور ساتھ ارمغان بھی۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ وزیراعظم کے حکم کے غلام ہیں۔ وزیراعظم صاحب ملک سے زیادہ اسٹاک ایکسچینج کی فکر کرتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ اسٹاک ایکسچینج میرا باپ چلاتا ہے اس لیے مجھے مجبور نہ کریں۔''

اس کے باپ کو تو وہ بھول ہی گئے تھے۔

انہوں نے شکست خوردگی سے ریان کو دیکھا۔ اس کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی تھا۔

''آپ مجھے انکار کریں، میں ابھی اور اسی وقت پریس کانفرنس بلاؤں گا۔ سب کچھ میڈیا کو بتادوں گا۔ عوام کے ''ہیرو'' کے ساتھ ہونے والے سلوک کی روداد سناؤں گا، پھر آپ.....''

''مجھے صرف ایک بات بتاؤ۔'' انہوں نے اس کی بات کاٹ کر تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ارمغان ٹیم میں رہے گا یا نہیں؟''

''رہے گا۔'' اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا۔

☆☆☆

''بہت سے لوگوں کو مجھ سے شکایت تھی کہ میں نے اپنے بیٹے کو کرکٹ ٹیم کا کپتان بنا دیا ہے۔ دیکھیں، ارمغان صرف اور صرف ایک میرٹ پر کپتان بنا تھا۔ یہاں جو کھیلے گا ٹیم میں رہے گا، میرٹ پر رہے گا۔ وگرنہ نہیں رہے گا۔ اور جہاں تک تعلق ہے ریان حیدر کا تو جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہی ہے کہ ریان ایک خوفناک المیے سے دوچار ہو کر کرکٹ سے کنارہ کش ہو چکے تھے مگر اب وہ بالکل ٹھیک ہیں اور چونکہ واپس آگئے ہیں تو میرا خیال ہے وہ پاکستان کرکٹ ٹیم کے تمام پلیئرز سے زیادہ اہل ہیں، میرے بیٹے سے بھی زیادہ اور کپتانی ان کا حق ہے۔''

مرزا صاحب اس وقت ریان اور چیف سلیکٹر کے ہمراہ قذافی سٹیڈیم میں پریس کانفرنس کر رہے تھے۔

وقفے وقفے سے کیمروں کی فلش لائٹس اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں مگر وہ بے تاثر انداز میں بظاہر میز پر نصب ہر چینل کے مائیکس پر نگاہیں جمائے، مرزا صاحب کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔

''ریان حیدر سب سے زیادہ ڈیزروِنگ ہے۔ یہ ہمارا لیجنڈری پلیئر ہے، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم اس کو ٹیم میں کپتانی سے نیچے کوئی عہدہ دیں۔'' ایک صحافی کے یہ پوچھنے پر کہ ریان کو کپتان بنانے کے بجائے بطور آل راؤنڈر بھی شامل کیا جا سکتا تھا پھر کپتان کیوں بنایا جا رہا ہے؟ مرزا صاحب بڑے جوش سے بولے تھے۔

ریان اب جھوٹ سن سن کر تھک چکا تھا۔ اس کو البتہ یہ بات بخوبی سمجھ میں آرہی تھی کہ اسے کپتان مرزا صاحب نے محض ''دباؤ'' میں آنے کے باعث نہیں بنایا بلکہ انہوں نے اپنا الو بھی سیدھا کیا تھا۔

ارمغان کی پرفارمنس گزشتہ دو ٹورنامنٹس میں بے حد خراب رہی تھی۔ مرزا صاحب پر اقربا پروری کے باعث کڑی تنقید کی جا رہی تھی۔ ریان کا واپس آنا ان کے لیے ارمغان کو ہٹانے کا جواز بن گیا تھا۔ اِس طرح نہ ہی ان کے بیٹے کی سبکی ہوئی نہ ہی وہ خود برے بنے۔ سارا گیم اسے اب سمجھ میں آیا تھا مگر وہ خاموشی سے بیٹھا رہا۔

تین دن بعد اس نے باقاعدہ طور پر کیمپ میں رپورٹ کر دی۔ وہ فزیکل فٹ قرار دے دیا گیا یہاں اس نے بھی تھوڑی سی چیٹنگ یہ کی کہ کبھی کبھی ہونے والا کمر کا درد چھپا گیا۔ بہر حال ایک دفعہ فٹ قرار دے دیے جانے کے بعد اس نے پریکٹس سیشن میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔

ٹیم میں کئی نئے لڑکے آچکے تھے وہ ان میں سے کئی کا ہیرو تھا۔ اور وہ سب اس کی آمد سے خوش تھے مگر اسے یہ دیکھ کر کافی حیرانی ہوئی کہ ارمغان اس کے ساتھ مکمل طور پر کوآپریٹ کر رہا تھا۔ وہ فطرت کا اچھا تھا۔

کچھ لڑکے جو ریان کے پرانے ساتھی تھے انہوں نے ریان کی خاموشی کافی حد تک محسوس کی تھی وہ کام کے علاوہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا نہ ہی پہلے کی طرح بات بے بات پھلجڑیاں چھوڑتا تھا۔

ریان زندگی میں کبھی پریکٹس کرتے وقت یا کرکٹ کھیلنے کے دوران تھکاوٹ کا شکار نہیں ہوا تھا مگر اب جلد ہی اس پر تھکن طاری ہو جاتی تھی لیکن اس نے یہ بات ٹیم فزیو سے بھی چھپائے رکھی۔ وہ ہر وقت سبز کیپ سر پر ایسے رکھتا تا کہ کوئی اس کے سفید بال نہ دیکھ لے۔

وہ کسی احساس کمتری میں ہرگز مبتلا نہ تھا بس اپنی جانب اٹھنے والی ترحم آمیز نگاہیں برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔

☆☆☆

زندگی بھی عجیب چیز ہے جس شے کے پیچھے جتنا بھاگا جائے وہ ہی فاصلے پر چلی جاتی ہے اور جس کے لیے کوئی جستجو نہ کی جائے وہ خود جھولی میں آن گرتی ہے۔ آپ اپنے مقدر کو بدل نہیں سکتے۔

عقل سے کبھی دنیا پر حکمرانی نہ کسی نے کی ہے اور نہ ہی کوئی کر سکے گا۔ کوئی بھی انسان عقل اور حسن سے نہیں جیتا جا سکتا۔ آپ کسی کو اپنے حسن سے متاثر تو کر سکتے ہیں اسیر بھی کر سکتے ہیں مگر زبردستی اسے خود سے محبت نہیں کروا سکتے۔ حسن سے محبت کرنے والے کی محبت بھی سطحی ہی ہوگی۔

محبت قدرت کی طرف ودیعت ہوتی ہے۔ جس کو آپ سے محبت نہیں ہے، آپ چاند تارے بھی توڑ لائیں تو وہ آپ سے محبت کر ہی نہیں سکے گا۔ کسی بھی انسان کے پیچھے پاگل ہونے سے صرف اپنا نقصان ہوتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ انتقام کی آگ میں جلتے ہیں وہ بدلہ لینے کے بعد بھی خوشی نہیں حاصل کر سکتے۔ انتقام تو کسی دوسرے کی بربادی ہوتا ہے یہ بھلا کسی کو خوشی کیسے دے سکتا ہے؟

بہت دیر سے ہی سہی مگر یہ بات اس کی سمجھ میں آ ہی گئی تھی۔

کتنے برس وہ ایک شخص کے پیچھے بھاگی، اسے گنتی ہی بھول چکی تھی اور ہاتھ اس کے کیا آیا؟ کچھ بھی نہیں۔ جب انسان اپنے لیے خیر طلب کرنے کے بجائے دوسروں کی بربادی مانگنا شروع کر دے تو اس کے ہاتھ کچھ آتا بھی

نہیں ہے۔

کتنی ہی بار وہ ہسپتال گئی تھی ریان سے ملنے مگر اسے ملنے نہیں دیا گیا۔ اس دن وہ نرس کی منتیں کر کے وہاں تک پہنچی اور پھر اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی۔ وہ انگوٹھی جو اس نے کتنے ہی برس سنبھال کر رکھی تھی وہ اسے واپس کر آئی۔

اسے یہ خبر بھی ہو چکی تھی کہ ریان واپس کرکٹ کی دنیا میں قدم رکھ چکا ہے۔

عرصہ ہوا دل پر، جذبوں پر اوس پڑ چکی تھی مگر پھر بھی دور اندر حاریہ سے ایک فطری جلن ضرور محسوس ہوئی تھی۔

اس نے سر جھٹک کر گویا خیالات جھٹکنے کی کوشش کی، مگر خیالات بھلا سر جھٹکنے سے پیچھا چھوڑ دیتے ہیں؟

اس نے آزردگی سے جالی کے اس پار کھلے میدان میں چوکڑیاں بھرتے ہرنوں کو دیکھا۔ وہ اس وقت یونہی وقت گزاری کے لیے چڑیا گھر چلی آئی تھی۔ عفت بیگم کی وفات کے بعد اس نے عفت کا بوتیک بھی تو عرصہ ہوا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ گلبرگ میں واقع ایک عام سی فیشن ڈیزائنر کے بوتیک پر کام کرتی تھی، امل کو دیکھ کر اب لگتا نہیں تھا کہ یہ وہی امل ہے۔

وہ جو کبھی بے حد اسٹائلش ہوا کرتی تھی اب فیس واش کے بجائے صابن سے منہ دھو لیتی تھی۔ وہ دوپٹہ جو کبھی گردن میں جھولتا تھا اب دوبارہ سر پر آ گیا تھا۔

ایک ہرن جو قد میں قدرے چھوٹا تھا۔ جالی دار جنگلے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا پتا نہیں کیوں اس نے سر جھکایا ہوا تھا اور اس کی موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں اتنی یاسیت اور وحشت تھی کہ امل کو اس کی آنکھیں اپنے جیسی لگیں۔

"Don't you ever smile"

اس کی سماعت سے ایک آواز ٹکرائی تو اس نے چونک کر اپنے دائیں جانب دیکھا۔

وہ ایک چھوٹا سا بچہ تھا جو بے حد تیکھی نظروں سے امل کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا؟'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''میں کافی دیر سے آپ کے ایکسپریشنز دیکھ رہا ہوں آپ کو مسکرانے سے الرجی ہے؟'' اس نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

''کیوں'' وہ سرد مہری سے بولی۔

''کیوں کیا۔ کم از کم انسان کو smile تو دینی چاہیے نا۔ ویسے کیا آپ انسان نہیں؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

امل نے بغور اسے دیکھا وہ بمشکل چھ سات برس کا ہوگا مگر اپنی عمر سے کہیں زیادہ تیز تھا۔ اس کی شکل بھی مقامی لوگوں جیسی نہیں تھی۔ شاید وہ پٹھان تھا، کیونکہ اس کی رنگت بے حد گوری اور بال اور آنکھوں کا رنگ براؤن تھا۔ اس کی آنکھیں بہت چمکتی ہوئی، ذہانت سے لبریز تھیں۔ بالکل ریان کی آنکھوں کی طرح۔ امل نے ایک گہری سانس لی۔

پھر وہ جالی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا ''میرے بابا کہتے ہیں جو بندہ مسکراتا نہیں ہے وہ بہت بری زندگی

گزارتا ہے۔"

چند ثانیے کے بعد۔اس نے ہاتھ میں پکڑا پاپ کارن کا پیکٹ اس کی جانب بڑھایا۔

"نو تھینکس۔"اس نے شائستگی سے انکار کیا تو بچے نے منہ بنایا۔

"ایک تو لوگ پہلی دفعہ انکار کر کے یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ اگلا دوسری مرتبہ بھی آفر کرے گا؟ میں دوسری مرتبہ بالکل آفر نہیں کیا کرتا۔"اس نے دھمکی دی تھی۔امل کو پہلی مرتبہ اس میں دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔

"نام کیا ہے تمہارا؟"

"جبرائیل۔"اس نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے بتایا۔

"جبرائیل؟"امل کو حیرت ہوئی۔"پہلی دفعہ کسی کا یہ نام سنا ہے۔"

"آپ کو منکی اچھا لگتا ہے؟"اس نے پنجرے میں اچھلتے کودتے بندر کو دیکھ کر سوال کیا۔

امل نے اس کی جانب دیکھا۔

"مجھے کیوں دیکھ رہی ہیں، منکی ادھر نہیں، اپنے پنجرے میں ہے۔"

امل اس بار بے اختیار ہنس پڑی۔

"واٹس یور گڈ نیم؟"وہ پاپ کارن کھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"امل۔"

"کین آئی کال یو ایمی؟"

"نو۔"

"اوکے۔"اس نے کندھے اچکائے۔"ویسے امل! تمہارے کپڑے بہت اچھے ہیں۔لگتا نہیں تمہارے ہیں۔"وہ اپنے سے کم از کم بیس بائیس سال بڑی لڑکی کو"تم"کہہ رہا تھا۔

"تمہارے بھی کپڑے اچھے ہیں لگتا نہیں تمہارے ہیں۔"

"وہ تمہیں اس لیے نہیں لگ رہا کیونکہ صرف اچھے ہیں۔اگر میرے ہوتے تو بہت اچھے ہوتے۔"

"تم باتیں بہت بناتے ہو؟"وہ جل کر بولی۔

"اب تمہیں بے وقوف تو بنانے سے رہا، جن کو خدا نے بنایا ہو، ان پر میں زیادہ محنت نہیں کیا کرتا۔"

"بہت لمبی زبان ہے تمہاری۔"وہ ہنس پڑی۔

"ویسے لمبی زبان ہونا کیا بری بات ہے؟ کل بابا کہہ رہے تھے کہ کم بولا کرو۔"وہ کچھ سوچتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"پتا نہیں۔"اس نے سر جھٹکا۔"خیر میں اب جا رہی ہوں۔""کین وی میٹ اگین؟"وہ پھر بولا۔

"آں......وہ......پتا نہیں۔"اس نے ٹالنا چاہا مگر وہ بضد تھا۔

"تم میرا فون نمبر لے لو، مجھے کل چار بجے کال کر لینا، اس ٹائم بابا اکیڈمی گئے ہوں گے۔"اس نے جلدی جلدی اپنا نمبر لکھوا دیا۔

وہ چلی گئی تو جبرائیل واپس ہرن کے پاس چلا آیا۔

"تم ادھر ہو اور میں تمہیں اتنی دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں۔" تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اسے ریان کی جھلائی ہوئی صورت دکھائی دی۔

"سوری بابا!" وہ شرمندگی سے بولا۔

"مت پھرا کرو اکیلے، کوئی اغوا کر کے لے جائے، پھر؟" وہ برہمی سے کہہ رہا تھا یہ الگ بات تھی کہ جبرائیل چہرے پر شرمندگی کا تاثر لانے کے باوجود بھی شرمندہ نہ تھا۔

وہ آخر کو میرین کا بیٹا تھا۔

☆☆☆

تقریباً آدھے گھنٹے کی محنت سے تیار کردہ اسکیچ کو اس نے تنقیدی نگاہوں سے دیکھا۔ ایک جگہ اسے کمی سی نظر آئی تھی۔ اس نے اسے درست کرنا شروع کیا۔ اگلے سات منٹ تک وہ غلطیوں کو ٹھیک کرتی رہی پھر ایک اور صاف کاغذ لے کر اس پر وہ ڈیزائن اتارنے لگی یکایک اس نے سر اٹھا کر گھڑی دیکھی۔

کل شام جبرائیل نے چار بجے فون کرنے کی تاکید کی تھی۔ وہ بچہ اس کو اچھا لگا تھا لیکن ایسے ہی کسی بچے کے کہنے پر......وہ سوچ میں پڑ گئی۔

چار ماہ بعد کویت میں ان کی ایگزبیشن ہو رہی تھی، ان کے پاس ٹائم کم اور لوڈ کافی زیادہ تھا۔ اب وہ اپنا قیمتی وقت یوں بچوں سے سر کھپا کر ضائع تو نہیں کر سکتی تھی۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی جب امل نے سر اٹھا کر ایک دفعہ پھر گھڑی دیکھی۔

"ایسے ہی اس بچے نے مجھے نمبر دے دیا، مجھے کون سا اسے فون کرنا ہے؟"

خاکہ اس وقت اختتامی مراحل میں تھا جب وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور تپائی پر دھرا فون سیٹ اٹھا کر گود میں رکھا اور نمبر ملانے لگی۔ نمبر اسے زبانی یاد تھا۔

دوسری ہی گھنٹی پر فون ریسیو کر لیا گیا تھا۔

"ہیلو!"

"ہیلو! میں امل بول رہی ہوں۔" وہ اسے پہچان گئی تھی اسی لیے اطمینان سے بتانے لگی۔

"او امل! تھینک یو سوچ تم نے مجھے فون کیا۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے میرا خیال تھا تم بھول جاؤ گی۔" خوشی اس کی آواز سے جھلک رہی تھی۔

"میں کیوں بھولتی؟ شیطانوں کو کون بھولتا ہے؟" اس نے آرام سے بستر پر ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، شیطانوں کو شیطان یاد رکھتے ہیں۔"

"ضروری تو نہیں ہے، شیطانوں کو انسان بھی یاد رکھ سکتے ہیں جیسے میں نے تمہیں رکھا۔" وہ برجستہ بولی۔

"اچھا اپنی ممی سے تو بات کراؤ۔"

''ممی سے؟'' اسے حیرت ہوئی۔'' کیوں؟''

''انہیں بتاؤں نا کہ ان کا بیٹا کتنا بڑا شیطان ہے۔''

''نو۔ یو کانٹ ڈو دس۔ میری تو ممی ہیں ہی نہیں۔'' اس نے عام سے انداز میں کہا۔

''کہیں گئی ہوئی ہیں؟'' اس کے لہجے اور انداز سے امل سمجھ نہ پائی تھی۔

''او نہیں ...... وہ ...... میرا مطلب ہے she's dead'' اس نے وضاحت کی۔

امل بھونچکی رہ گئی۔'' آئی ...... آئی ایم سوری۔'' بمشکل اس کے لبوں سے نکلا۔

''اٹس او کے۔'' وہ خاموش ہو گیا۔''امل!'' چند لمحوں بعد ریسیور میں اس کی آواز گونجی۔'' تمہاری ممی ہیں؟''

''امل کو بہت کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے دھیرے سے کہا تھا''نہیں۔''

''ڈیڈی ہیں؟'' وہ پھر پوچھنے لگا۔

''نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی''تمہارے ہیں؟''

''ڈیڈی؟ ہاں، ہیں۔''

''کس کے ساتھ رہتے ہو؟ بہن بھائی نہیں ہیں؟'' اسے اس بچے سے بے حد ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

''بہن بھائی؟ نہیں، میں اکیلا ہوں بابا کے ساتھ رہتا ہوں۔''

''سنو، ممی کی ڈیتھ کیسے ہوئی تھی؟'' وہ تفصیلات جاننے کے لیے بے تاب تھی۔

ان کو کینسر تھا''بلڈ کینسر۔''

''کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟'' امل کا دل بہت تڑپا تھا۔

''چار، پانچ سال تو ہو گئے ہیں۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔'' وہ متانت سے بتا رہا تھا۔

''تو ...... آہ ...... مطلب ...... کیسے رہتے ہو۔ ان کے بغیر۔'' وہ اتنا چھوٹا سا بچہ، بغیر ماں کے کیسے رہتا ہوگا؟ اس کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔

''رہ لیتا ہوں۔ میرے بابا کی مما بہت اچھی ہیں۔ ادھر کراچی میں ہوتی ہیں۔''

''بابا کی مما یعنی دادی؟'' اس نے اندازہ لگایا۔

''دادی نہیں، نانی۔''

''نانی کیسے، بابا کی مما دادی ہوتی ہیں۔'' اسے الجھن ہوئی تھی۔

''ہاں۔ پتا نہیں۔ مگر وہ میری نانی ہیں۔'' وہ اپنی بات پر قائم تھا۔

''اچھا وہ تو کراچی میں ہوتی ہیں نا، یہاں کیسے رہتے ہو؟''

''یہاں بابا ہوتے ہیں، اور ایک کراچی میں ملازم تھا، بشیرو وہ بھی کراچی سے یہاں آ گیا ہے۔ بابا چلے جاتے ہیں تو وہ گھر پر ہوتا ہے۔''

''بابا کہاں جاتے ہیں؟''

"اکیڈمی۔"

(اکیڈمی؟ کون سی اکیڈمی؟ اوہ ہاں۔ ٹیوشن اکیڈمی ہوگی۔ ٹیچر ہوگا اس کا باپ) اس نے خود ہی سوچ لیا۔

"اچھا۔ تو تم پیچھے کیا کرتے ہو؟ کوئی دوست ہے تمہارا؟"

"دوست؟ نہیں۔ بس ایک تم ہو۔" اس نے سادگی سے کہا تو اسے اس بچے پر بے حد ترس اور پیار آیا تھا۔ اس کی ماں نہیں تھی اور کوئی دوست بھی نہ تھا۔

"تم ہونا میری دوست؟" وہ یقین دہانی چاہ رہا تھا۔

"آف کورس میں تمہاری دوست ہوں۔ اگر نہ ہوتی تو تمہیں کال کرتی؟" وہ پیار سے بولی۔ "ویسے کیسے سوتے ہو ممی کے بغیر؟ ڈر نہیں لگتا؟"

"کمرے میں سوتا ہوں۔" وہ اپنی فطری معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

"اکیلے کیوں سوتے ہو؟ بابا ساتھ نہیں سلاتے؟"

"بابا نے تو کہا تھا مگر میں ان کے ساتھ نہیں سوتا۔ وہ لائٹ جلا کر سوتے ہیں اور مجھے لائٹ میں نیند ہی نہیں آتی۔"

"بابا لائٹ جلا کر کیوں سوتے ہیں؟" اسے فطری تجسس ہوا۔

"بس وہ لائٹ آف نہیں کرتے۔" جبرائیل نے ٹالنا چاہا۔

"کیوں؟" اس نے کریدا۔

"نہیں......انہیں ڈر لگتا ہے۔"

امل نے انتہائی حیرت سے ریسیور کو گھورا۔ پھر دوبارہ کان سے لگالیا۔

"عجیب باپ ہے!" وہ سوچ کر رہ گئی۔

☆☆☆

"چائے، کافی کچھ چاہیے؟"

وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا جب اپنے عقب میں اسے آواز سنائی دی۔ اس نے دھیرے سے سر اٹھایا اور گردن موڑ کر پیچھے کھڑے ارمغان کو دیکھا۔ وہ ہاتھ میں دو ڈسپوزیبل کپس لیے کھڑا تھا۔

"ویسے چائے چاہیے تو بتا دیں۔ میں کہہ آتا ہوں، لیکن اگر کافی چاہیے تو لیجیے حاضر ہے۔" اس نے اس کے ساتھ سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

ریان نے لمحہ بھر کو اسے بغور دیکھا۔

"کافی ٹھیک ہے۔" اس نے اس کے ہاتھ سے کپ لے کر لبوں سے لگا لیا۔

وہ دونوں اس وقت لارڈز کرکٹ سٹیڈیم کے ڈریسنگ روم کے آگے بنی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ کل ان کا پہلا ٹیسٹ میچ اسٹارٹ ہونا تھا۔

واپسی کے بعد یہ ریان کا پہلا غیر ملکی دورہ تھا۔

"مجھے لگتا ہے کل بب...... بارش ہوگی۔" ریان نے بادلوں سے سیاہ ہوتے آسمان کو دیکھ کر کہا۔ ارمغان نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ اس کے سامنے ریان پہلی دفعہ ہکلایا تھا مگر اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

"اگر کل ٹاس جیت گئے تو پہلے باؤلنگ لیں گے، کل وکٹ بڑا باؤنسی ہوگا۔" وہ اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا کہ ارمغان کو خاموش پا کر رک گیا۔ "کچھ کہو نا۔" اس نے نائب کپتان کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں ریان بھائی؟" اس کا سوال قدرے غیر متوقع تھا۔ ریان ششدر رہ گیا۔

"مم میں؟ کک...... کیوں؟" اسے ارمغان کی طرف سے اس سوال کی امید نہیں تھی۔ "ارمغان!" ریان نے کافی ختم کر کے کپ سائیڈ پر رکھا پھر نرمی سے بولا۔ "میں تم سے خفا نہیں ہوں، میں کسی سے بھی خفا نہیں ہوں۔"

"یہ آپ کی بڑائی ہے۔"

وہ شکریہ ادا کر کے دونوں کپ اٹھا کر لے گیا۔

اس نے گہری سانس لے کر سٹیڈیم پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ شام ڈھلنے کو تھی۔ شام کے ملگجے سائے پھیلتے ہی ٹیم نے واپس ہوٹل روانہ ہو جانا تھا۔

اور وہ اسے سٹیڈیم میں ہوٹل اور لندن کے بیشتر تفریحی مقامات پر بیسیوں جگہ ڈھونڈ چکا تھا۔ وہ جو ہر جگہ اس کے ہمراہ ہوا کرتی تھی اب کہیں بھی نہیں تھی۔

"شاید وہ مجھے بھول گئی ہے ورنہ ضرور آتی۔" اس نے اداسی سے سوچا تھا۔

☆☆☆

کوئی بھی کرکٹر اگر تین ماہ کے لیے بھی انجری کے باعث کرکٹ سے آؤٹ ہو جائے اسے واپس اپنے فارم میں آنے کے لیے کچھ ٹائم چاہیے ہوتا ہے اور ریان تو تین ساڑھے تین برس بعد واپس آیا تھا۔

لارڈز میں کھیلا گیا پہلا ٹیسٹ میچ ویسے تو ڈرا ہو گیا مگر اس میں ریان کی انفرادی پرفارمنس کچھ خاص نہ تھی۔ وہ اب صرف بیٹنگ کر رہا تھا کیونکہ باؤلنگ سے اس کی کمر میں درد ہوتا تھا۔ اس نے مجموعی طور پر ستائیس رنز بنائے تھے۔ دوسری اننگز بارش کے باعث کھیلی نہیں جا سکی تھی اور وہ اپنی پرفارمنس سے کافی ناخوش تھا۔

مگر دوسرے ٹیسٹ میں اس کے دونوں اننگز کے 72 اور 89 رنز نے جیت میں اہم کردار ادا کیا۔ پھر اس کی شاندار کپتانی، وہ دوسرے میچ میں واقعی کرکٹ میں "واپس" آ چکا تھا۔

اس کے بعد وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا تھا۔

صحافیوں اور اخبار نویسوں کے کیمروں کی فلیش لائٹس، انٹرویوز کی فرمائشیں، آٹوگراف لینے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ، فینز کی لمبی قطاریں۔ لائم لائٹ اس کے لیے نئی نہیں تھی مگر اب وہ اس کی اصلیت سمجھ چکا تھا۔

یہاں صرف چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی تھی، صرف اس شخص کو دیوتا بنایا جاتا تھا جو ان ہو اور ریان فی الحال کافی سے زیادہ "ان" تھا۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ اہل نے اپنے سیل کی تلاش میں ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اسے وہ صوفے پر پڑا دکھائی دیا۔ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بستر سے اٹھی اور سیل اٹھا کر نمبر دیکھا۔ پھر مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔ اس نے فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔

''ہیلو؟''

''ایمی؟'' اس کے پوچھنے پر دوسری جانب سے بے تابی سے پوچھا گیا۔

''اہل نام ہے میرا۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

''واٹ ایور۔ کیسی ہو؟'' وہ پرجوش سا ہو کر پوچھ رہا تھا۔

''میں تو ٹھیک ہوں۔'' اہل نے ایک ہاتھ سے سیل کان پر لگائے، دوسرے سے بستر پر بکھرے کاغذ سمیٹنا شروع کر دیے۔ ''تم سناؤ گھوم آئے۔''

''ہاں۔ بہت انجوائے کیا۔''

جبرائیل نے تقریباً پانچ ہفتے قبل اسے فون پر بتایا تھا کہ وہ اپنے بابا کے ساتھ کسی کام سے لندن جا رہا ہے۔ ''کام'' کیا تھا اس نے وضاحت نہیں کی تھی۔ ویسے بھی اس نے کبھی یہ بات نہیں بتائی تھی کہ اس کا ''باپ'' کیا کرتا ہے اور اس کا نام کیا ہے۔

''کہاں، کہاں گئے؟'' اس نے تمام پیپرز سمیٹ کر فائل میں رکھے اور فائل کو احتیاط سے الماری میں رکھ دیا۔

''کئی جگہوں پر'' پھر وہ اسے بتانے لگا۔ بیچ میں اس نے اولڈ ٹریفورڈ کا بھی ذکر کر دیا۔

''تم اولڈ ٹریفورڈ بھی گئے؟ وہ تو مانچسٹر میں ہے۔'' اہل کو حیرت اس لیے ہوئی تھی کیونکہ جبرائیل نے صرف لندن کی بات کی تھی۔

''ہاں۔'' وہ مزے سے بولا۔

''ہاں نہیں، جی کہتے ہیں۔'' اس نے ٹوکا۔

''اوہ...... جی...... میں تو مانچسٹر، کارڈف، لیڈز، برمنگھم، سب شہروں میں گیا۔''

''اتنا کام تھا؟''

''ہاں...... بابا کا تھا۔'' وہ گڑبڑایا۔ ''میرا مطلب ہے، جی، بابا کا تھا۔''

اہل ہنس دی۔ ''اچھا۔ کیا کر رہے ہو؟'' وہ بستر پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''سانس لے رہا ہوں، تم سے بات کر رہا ہوں، ہاتھ میں ریسیور پکڑا ہوا ہے، سامنے والی دیوار کو دیکھ رہا ہوں''

''اچھا بس بس!'' اسے ٹوکنا پڑا۔ ''میرا مطلب تھا...... اچھا چھوڑو۔ تمہارے اسکول کا حرج نہیں ہو رہا ہے؟ تم نے کہا تھا نا کہ تم چھٹیوں پر لاہور آئے ہوئے ہو؟''

''ہاں۔ پتا نہیں، ابھی تو ٹرم اسٹارٹ ہوئی ہے، بابا کہتے ہیں، وہ مجھے ادھر ہی داخل کرا دیں گے۔ ان کو یہاں عرصے تک رہنا ہے۔''

''تو وہ تمہیں کراچی کیوں نہیں بھیج دیتے؟''

''وہ کہتے ہیں، بچوں کو ماں باپ سے دور نہیں رہنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں مجھے کبھی، کسی دوسرے شہر یا بورڈنگ وغیرہ پڑھنے کے لیے نہیں بھیجیں گے۔''

''کیوں؟''

''پتا نہیں، ان کو پتا ہوگا۔'' جبرائیل نے شانے اچکائے۔

''ویسے جبرائیل! تمہارا نام کس نے رکھا تھا؟'' وہ یونہی پوچھنے لگی۔

''بابا نے، وجہ مجھے پتا نہیں، مگر ممی نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ ممی اور بابا کی کوئی ناراضی ہوگئی تھی۔ وہ تین چار سال ایک دوسرے سے ناراض رہے، پھر میرے پیدا ہونے پر بابا، ممی سے ملنے آئے اور ان دونوں کی صلح ہوگئی اور بابا نے میرا نام جبرائیل رکھا۔''

''لیکن جبرائیل! تین چار سال بعد تمہارے بابا تمہاری ممی سے ملنے آئے، وہ بھی تمہارے پیدا ہونے پر؟ کیا بات کر رہے ہو؟ کیا دونوں میں علیحدگی ہوگئی تھی؟''

''علیحدگی؟ نہیں، وہ بس ناراض تھے۔ پھر صلح ہوگئی۔ جب میں پیدا ہوا تو ممی عمان میں تھیں۔ بابا کراچی سے اسپیشلی انہیں ملنے آئے تھے۔'' وہ پورے اطمینان سے بتا رہا تھا۔

''پھر؟'' اس کے لبوں سے پھسلا۔

''پھر کیا، مل کر واپس چلے گئے۔''

''کیا مطلب؟ اپنی بیوی کو چھوڑ کر چلے گئے؟'' وہ حیرت سے چلائی۔

''بیوی؟ نہیں۔ بابا کی تو اس وقت شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔''

''جبرائیل، تمہارا دماغ درست ہے؟''

''کیا ہوا؟'' وہ پریشان ہوگیا۔

''تمہارے پاپا کی ممی سے شادی نہیں ہوئی تھی کیا؟'' وہ کنفیوژ ہوگئی۔

''نہیں، میرے بابا کی تو ممی سے شادی نہیں ہوئی۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''تم۔ تم اپنے بابا کے بیٹے ہو، ممی اور بابا کے؟'' امل کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اس سے کس طرح پوچھے۔

''نہیں، میں تو ممی اور ڈیڈ کا بیٹا ہوں۔''

''ڈیڈ؟ ڈیڈی یعنی بابا؟''

''نہیں، تم سمجھ نہیں رہی ہو امل، اچھا میں تمہیں بتاتا ہوں دیکھو، بابا میری ممی کے کزن تھے۔ انہوں نے مجھے ممی کے مرنے کے بعد ایڈاپٹ کیا ہے۔''

''تو اس طرح کہو نا۔'' وہ جھنجھلائی۔

''کیا کہوں؟ یہی کہ تم بالکل عقل سے پیدل ہو؟ تو وہ تو تم میرے۔کہے بغیر بھی ہو۔ میرے کہنے کی کیا

ضرورت ہے؟''

''میں تم سے بڑی ہوں، تمیز سے بات کرو۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

''تمیز کون ہے اور اس سے بات کیوں کروں؟''

''جبرائیل، تم میرے ہاتھوں کسی دن قتل ہو جاؤ گے۔''

''پھر تم جیل چلی جاؤ گی۔''

''میں جیل سے بھاگ جاؤں گی۔''

''بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟'' وہ اسے ستا رہا تھا۔ وہ تھا تو چھوٹا سا بچہ مگر بے حد تیز طرار۔

''دور۔ کہیں بہت دور!''

''یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس تو...... وہاں...... جانے کے لیے جیل میں پھانسی چڑھ جانا، بھاگو گی کیوں؟''

''میں mars پر چلی جاؤں گی۔'' اس نے نیا شوشہ چھوڑا۔

''ہاں جہاں کی مخلوق ہو، وہیں جاؤ گی نا۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تو وہ ہنس دی۔

''اچھا سنو ال! تم کبھی میرے گھر تو آؤ۔'' اس نے بڑے اشتیاق سے آفر کی تھی۔

''نہ بابا نہ۔'' ال کو پروفیسرز ویسے ہی بہت برے لگتے تھے اور جبرائیل کا باپ بھی تو پروفیسر ہی تھا۔

''کیوں؟''

''دیکھو، تمہارے بابا مائنڈ کریں گے، میں......'' اس نے ٹالنا چاہا۔

''کم آن، تم اس وقت آنا جب وہ اکیڈمی گئے ہوتے ہیں اور ان کے واپس آنے سے پہلے چلی جانا۔'' اس نے چٹکی بجاتے ہی مسئلہ حل کر دیا تھا۔

''نہیں دیکھو، مجھے...... اصل میں اچھا نہیں لگتا'' وہ ٹال مٹول کر رہی تھی۔

''ال پلیز! میں بالکل تنہا ہوں میرا تو کوئی فرینڈ بھی نہیں ہے، ایک تم ہی فرینڈ ہو، آ جاؤ۔'' جبرائیل کی آواز دکھ سے لبریز ہوگئی تو اسے ہار ماننا ہی پڑی۔

''اچھا، میں آؤں گی۔'' بالآخر وہ مان گئی۔

''سچ؟ کب؟ کس دن آؤ گی؟'' کچھ دیر پہلے کا لب و لہجہ اب یکسر غائب ہو چکا تھا۔ اس نے مشکوک نگاہوں سے ریسیور کو گھورا۔

''تم جبرائیل، بہت بڑی شے ہو۔'' اس نے گویا بالکل ہی ہتھیار ڈال دیے تھے۔

☆☆☆

''ٹھیک تو ہو نہ تم؟ تکلیف تو نہیں ہوتی؟'' مما کا ہمیشہ کا وہی کیئرنگ انداز ریان کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔

''جی بالکل ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں؟'' اب وہ ہر دو ایک دن بعد رانیہ کو خود فون کیا کرتا تھا۔

''بس اللہ کا شکر ہے۔ کسی دن چکر لگاؤ۔ ویک اینڈ پر آجاؤ۔'' وہ یقیناً اسے بے حد مس کر رہی تھی۔

''چلیں آجاتا ہوں خوش؟''

وہ کافی دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا، جس وقت فون رکھا تو احساس ہوا کہ جبرائیل کتنی ہی دیر سے اس کے ساتھ بیٹھا اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چپس کا پیکٹ تھا جس سے گاہے بگاہے چپس نکال کر وہ کھا رہا تھا۔ ریان کو متوجہ پا کر اس نے پیکٹ اس کی جانب بڑھایا۔

''کچھ کہنا ہے؟'' اس نے پیکٹ میں سے چپس نکالتے ہوئے پوچھا۔ جبرائیل کے انداز میں جو تذبذب تھا، وہ ریان کے لیے نیا ہرگز نہیں تھا۔ یہ انداز میرین کا ہوا کرتا تھا۔

''جی۔ وہ ایک بات بتانی تھی۔'' وہ بڑے لاڈ سے اس کے بازو پر سر رکھ کر لیٹ سا گیا اور چپس دانتوں سے کترنے لگا۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔

''کیا کہنا ہے میرے اینجل کو؟'' اس نے پیار سے اس کے براؤن بال بکھیرے۔

''وہ بابا۔ میری ایک فرینڈ ہے'' اس نے بات کا آغاز کیا۔

''آ۔ ہاں۔''

''تو۔ میں اس کو گھر میں انوائٹ کرلوں؟'' وہ ریان کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''وہ کراچی سے آرہی ہے؟'' ریان سمجھا تھا یہ اس کی کراچی کے اسکول والی فرینڈ ہے۔

''نہیں، وہ تو لاہور میں رہتی ہے۔''

''اوہ۔ تو تم نے لاہور میں بھی فرینڈز بنالی ہیں۔'' وہ دھیرے سے ہنسا پھر مصنوعی خفگی سے بولا ''مجھے بتایا تک نہیں؟''

''بتا تو رہا ہوں۔ ابھی انگلینڈ جانے سے پہلے بنائی تھی۔''

''کون ہے؟''

''اِل نام ہے، مجھ سے تھوڑی سی 'بری' (بڑی) ہے'' وہ ''ڑ'' نہیں بول سکتا تھا۔

''ہاں تو کرلو انوائٹ۔'' اسے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

جبرائیل نے چپس کا پیکٹ خالی کر کے جیب میں ٹھونس لیا ریان کو یاد تھا وہ بچپن میں ایسے ہی کیا کرتا تھا۔

''بابا۔'' کچھ دیر بعد وہ بولا۔

''ہوں۔'' وہ اس کے نرم نرم بال سہلا رہا تھا۔

''میں آج آپ کے ساتھ سو جاؤں؟''

''سو جاؤ۔''

''آپ لائٹ آن رکھیں گے؟''

ریان ایک لمحے کو چپ سا ہوگیا۔ پھر خود پر قابو پا کر بولا ''تم کہتے ہو تو آف کردوں گا۔''

''نہیں نہیں، کوئی بات نہیں۔ بس میں آپ کے ساتھ سوؤں گا۔'' جبرائیل نے اپنا سر اس کے کندھے سے ہٹا کر سینے پر رکھ دیا۔ ریان اس وقت بستر پر نیم دراز تھا۔

کتنے ہی پل یونہی بیت گئے، ریان سمجھا وہ سو چکا ہے، جب اس نے اسے پکارا ''جبرائیل'' وہ چاہتا تھا کہ اب وہ سیدھا ہو جائے اس کی کمر کافی تکلیف دے رہی تھی۔

''جی۔'' اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

''سوئے نہیں؟ میرا خیال تھا سو چکے ہو۔'' اسے حیرت ہوئی تھی جبرائیل جلدی سو جایا کرتا تھا۔

''پھر بلا کیوں رہے تھے اگر لگ رہا تھا کہ میں سو گیا ہوں؟'' وہ اپنی بات پر خود ہی ہنس دیا۔

''الو۔ گدھے۔'' اس نے اس کی سر پر چپت لگائی ''سو جاؤ۔''

''آپ کیوں نہیں سوتے بابا؟'' وہ الٹا سوال کرنے لگا۔

''میں بہت سویا ہوں جبرائیل۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں اتنا سویا ہوں بیٹا! کہ اب نیند سے ڈر لگتا ہے۔ سوتا ہوں تو یہ خوف روح میں پھیلا ہوتا ہے کہ جانے اگلی صبح اٹھ بھی سکوں گا یا نہیں۔''

''آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں بابا؟'' وہ پریشانی سے دیکھنے لگا۔

''سوچنا پڑتا ہے بیٹا؟'' وہ تھکے تھکے انداز میں بولا۔ ''میری ایک بات یاد رکھنا۔ کبھی کسی کو بددعا نہ دینا۔ چاہے اس بندے نے تمہارے ساتھ کتنا ہی برا کیوں نہ کیا ہو۔ کسی کو بددعا نہیں دیا کرتے، خود کو بھی نہیں دیتے۔''

''ہیں؟ خود کو کیسے بددعا دیتے ہیں؟''

ریان نے لحہ بھر کو اسے دیکھا۔ ''تم نہیں سمجھ سکتے۔ اب سو جاؤ۔'' جبرائیل نے ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھا، پھر آنکھیں موند لیں۔ ریان اسی طرح دیواروں کو دیکھتا رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆☆☆

''بشیر؟ تمہیں پتا ہے آج میری ایک فرینڈ آ رہی ہے۔'' جبرائیل صوفے پر بیٹھا سیب کھا رہا تھا، جب اچانک ڈسٹنگ کرتے ہوئے اس نے بشیر کو مخاطب کیا۔

''اچھا جی۔'' بشیر کی آنکھوں میں اشتیاق در آیا۔

''ہاں، اور تم ذرا تمیز سے رہنا اس کے سامنے کوئی بونگی بات مت کر دینا''

اتنے میں اطلاعی گھنٹی بجی۔ جبرائیل نے جلدی سے ادھ کھایا سیب پاکٹ میں (عادتاً) ٹھونس لیا اور باہر کی جانب بھاگا، بشیر بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

گیٹ کھولتے ہی امل اپنی سوزوکی اندر لے آئی۔ گیراج میں گاڑی کھڑی کر کے وہ باہر نکلی، جبرائیل نے بڑی تمیز سے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

''امل! یہ جو میرے ساتھ کھڑا ہے، یہ ڈفر لگتا بھی ہے اور ہے بھی۔ یہ بشیر ہے۔'' اس نے بشیر کا تعارف کرایا۔

''اوں۔ بری بات۔'' امل نے مسکراہٹ دباتے ہوئے تنبیہ کی۔

جبرائیل اسے اندر لے آیا۔ امل ناقدانہ نگاہوں سے گھر کا جائزہ لیتی رہی۔

(گھر تو اچھا ہے۔ بڑا کماتے ہیں پروفیسر صاحب) وہ مرعوب ہوئی تھی۔

''گھر اچھا ہے تمہارا۔'' اس نے بے اختیار تعریف کی۔

''اس لیے کہہ رہی ہو کیونکہ صوفوں کا کلر تمہارے ڈریس جیسا ہے؟'' اس کا اشارہ کریم اور ٹی پنک شیڈز کے صوفوں کی جانب تھا، اتفاق سے امل نے بھی ان ہی رنگوں کا ڈریس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کی گوری شفاف رنگت پنک دوپٹے کے ہالے میں بہت کھلی کھلی اور گلابی سی لگ رہی تھی۔

''اچھا۔ میں تمہیں اپنی بکس دکھاتا ہوں۔'' جبرائیل نے اس کی بات نامحسوس طریقے سے بدل دی۔

''ہاں دکھاؤ۔'' وہ مسکرائی۔

تھوڑی دیر میں جبرائیل اپنی کلرنگ بکس، نرسری رائمز اور کہانیوں کی کتابیں اٹھا کر لے آیا۔

''یہ دیکھو، میں نے ایلی فینٹ بنایا ہے۔'' اس نے ایک کلرنگ بک میں سے ہاتھی، پر انگلی رکھ کر بتایا۔ ''اور یہ منکی بنایا ہے۔ تمہیں منکی اچھے لگتے ہیں نا، اس دن تم منکی کو دیکھ رہی تھیں۔''

امل کو حیرت ہوئی تھی، بچے عموماً ایسی باتیں یاد نہیں رکھا کرتے مگر جبرائیل کو یاد تھا۔

اتنے میں بشیر جوس لے آیا۔

بشیر کے جانے کے بعد وہ دنوں ٹی وی لگا کر بیٹھ گئے۔ اکثر چینلز لاکڈ تھے۔ امل، پروفیسر صاحب کی سمجھ داری کو داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔

ایک نیوز چینل پر کسی مووی کا ٹریلر چل رہا تھا۔

''یہ کل آٹھ بجے آئے گی۔ بابا کی بڑی فیورٹ ہے۔'' جبرائیل جوش سے بتانے لگا۔

''ہاں، مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔'' وہ بھی مسکرا کر بولی۔

''مجھے اس کے ایک کیریکٹر کے بال بہت اچھے لگتے ہیں۔ بالکل Salt Pepper۔ پتہ ہے امل! میرے بابا کے بال بھی بالکل ایسے ہی ہیں۔''

(ہاں ظاہر ہے، خشک، سبجیکٹس ...... پڑھا پڑھا کر پروفیسر صاحب کا سر چٹا نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا)

''اچھا۔'' اس نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے سر ہلا دیا۔ ''ویسے بابا نے آنا کس ٹائم ہے؟'' وہ دراصل چاہتی تھی کہ ان کے آنے سے پہلے ہی واپس چلی جائے۔

''وہ شام کو آئیں گے، پانچ بجے تک۔ ابھی تو بہت دیر ہے۔'' جبرائیل نے لاپروائی سے کہا تو وہ مطمئن سی ہوگئی۔

اور واقعی، ریان پانچ بجے ہی گھر آیا اور اس کے آنے سے دو گھنٹے پہلے ہی امل واپس جا چکی تھی۔

☆☆☆

ویسٹ انڈیز کے خلاف ہوم سیریز جیسے جیسے قریب آ رہی تھی، پریکٹس سیشنز کا دورانیہ بڑھتا ہی چلا جا رہا

تھا۔ دن بھر کی پریکٹس سے وہ بے حد تھکاوٹ کا شکار ہو جاتا تھا مگر یہ بات اس نے کسی کو بتائی نہیں تھی اس کو ڈاکٹر نے سختی سے چیک اپ کراتے رہنے کی تاکید کی تھی مگر وہ لاہور آنے کے بعد کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا تھا۔

وہ جو کبھی کبھار کا کمر کا درد تھا، وہ اب ہوتا تو نہیں تھا البتہ وہ تھکنے بہت جلدی لگا تھا۔

اس شام بھی وہ بے حد تھکا ہارا گھر پہنچا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اسے جبرائیل کہیں دکھائی نہ دیا ورنہ عموماً وہ اس کے استقبال کے لیے گیٹ پر ہی ہوتا تھا۔

اس نے بشیر کو بلا کر اس کے متعلق استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ وہ کھانا کھا کر سو گیا تھا اور ابھی اٹھا نہیں تھا۔ ویسے بھی اس پر بے حد تھکاوٹ طاری تھی، اسی لیے اس نے زیادہ غور نہیں کیا اور کپڑے بدل کر سو گیا۔

رات کافی دیر سے آنکھ کھلی، نو بج رہے تھے۔ وہ کسلمندی سے اٹھا اور واش روم میں جا کر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے چہرے پر مارے کچھ دماغ بیدار ہوا تو باہر نکل آیا۔

وہ لاؤنج میں پہنچا تو بشیر نے بتایا کہ کھانا وہ ڈائننگ ٹیبل پر لگا چکا ہے۔

''میں آ رہا ہوں۔'' وہ کہہ کر کچھ دیر تو لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھتا رہا، پھر ڈائننگ ہال میں چلا آیا۔

حیرت کا جھٹکا اسے اس وقت لگا جب بشیر نے جبرائیل کی بابت پوچھنے پر اسے مطلع کیا کہ وہ کھانا کھا کر سو چکا ہے۔

ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ جبرائیل نے اس کے بغیر کھانا کھا لیا ہو اور وہ کبھی بھی اتنا نہیں سوتا تھا۔ اسے یاد آیا جس وقت وہ گھر پہنچا تھا، جبرائیل سو رہا تھا اور اب بھی......

''پرابلم کیا ہے؟'' وہ بڑبڑایا، پھر اس کے کمرے کی طرف چلا آیا۔

کمرے کا بند دروازہ دھکیل کر کھولنے پر اسے وہ بازو آنکھوں پہ رکھے بستر پر لیٹا دکھائی دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کر دی تو پورا کمرہ روشنی سے نہا گیا۔

''جبرائیل!'' اس نے پکارا کیونکہ اس کے لیٹنے کے انداز سے وہ یہ قیاس کرنے سے قاصر تھا کہ وہ سو رہا تھا یا نہیں۔

جبرائیل نے کوئی ریسپانس نہیں دیا تو وہ آگے بڑھ کر اس کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

اس نے آہستگی سے اس کا بازو آنکھوں پر سے ہٹایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''اٹھ گئے؟'' حالانکہ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ جاگ رہا تھا۔

جبرائیل چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر کہنے لگا میں نے کھانا کھا لیا ہے آپ کھا لیں۔''

اس کا چہرہ ریان کو اترا اترا لگا تھا۔

''چلو، مجھے کمپنی تو دے دو۔'' اس نے اسے بستر سے اٹھانے کے لیے کہا۔

''مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''دوپہر کو بھی سوئے تھے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔ جبرائیل کا رویہ اس کے لیے ناقابل فہم تھا۔

''ہوں۔ٹھیک ہوں۔''

''ہاں، وہ تمہاری فرینڈ جو روز میری غیر موجودگی میں آجاتی ہے اس نے تو کچھ نہیں کہا؟''

''نہیں تو۔''

''پھر کسی اور نے کچھ کہا ہے؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کوئی فون وغیرہ آیا تھا میرے پیچھے؟'' اس نے پھر استفسار کیا۔

''جی۔'' ریان نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کس کا؟''

''ماما کا؟'' وہ رانیہ کو ماما کہتا تھا۔

''کیا کہہ رہی تھیں؟'' وہ چوکنا ہوا۔

''کچھ نہیں۔ کچھ خاص نہیں۔''

ریان ابھی اور کچھ پوچھنے ہی لگا تھا کہ وہ بول اٹھا۔

''انکل سے بھی بات ہوئی تھی۔'' وہ عظیم صاحب کو انکل کہتا تھا۔

''اچھا۔ کیا کہہ رہے تھے؟''

جبرائیل خاموش ہوگیا تو ریان کو بے چینی سی ہوئی۔ اس نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو وہ بجھے بجھے لہجے میں گویا ہوا ''وہ کہہ رہے تھے کہ میری پڑھائی ضائع ہو رہی ہے۔ میں واپس آجاؤں۔''

''واپس کراچی؟'' اب اس کو سارا معاملہ سمجھ میں آیا تھا۔

''جی۔''

''تو تم نے کیا کہا؟''

''میں نے کہا بابا سے پوچھوں گا۔'' اس نے اپنی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ریان نے لب بھینچ لیے اور کچھ سوچنے لگا۔

''ویسے صحیح کہہ رہے تھے وہ تمہاری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''جی اب میں سو جاؤں؟'' اس کا انداز بجھا بجھا سا تھا۔

ریان نے سوچا وہ کوئی خوشگوار بات کہہ کر اس کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کرے مگر پھر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

وہ اس کے کمرے سے نکل آیا مگر پتا نہیں کیوں اس سے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر ٹہلتا رہا پھر تھک کر بستر پر لیٹ گیا۔

مگر وہ سو نہیں سکا۔ اسے نیند ہی نہیں آئی۔ وہ صرف اور صرف جبرائیل کے متعلق سوچ رہا تھا۔

میرین کے حوالے سے جبرائیل، ریان کو بے حد پیارا تھا مگر جب سے دونوں نے ساتھ رہنا شروع کیا تھا ریان کو اس سے بہت محبت ہوگئی تھی۔ وہ اس بچے میں اپنا عکس، اپنا بچپن دیکھتے تھے۔

وہ اضطراب کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اگر جبرائیل چلا گیا تو یقیناً وہ اکیلا رہ جائے گا اور ریان کو اس لفظ سے بے حد ڈر لگتا تھا۔

وہ انگلیاں بالوں میں پھنسائے کافی دیر تک کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر ایک فیصلہ کر کے وہ اس کے کمرے کی جانب چل دیا۔

رات کے دو بج رہے تھے مگر وہ جاگ رہا تھا۔ آہٹ پر اس نے جھٹ آنکھیں کھول دیں اور اندھیرے میں آنے والے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ ریان دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے بیڈ کے قریب آ کر کھڑا ہوگیا۔

''جبرائیل!'' اس نے آہستگی سے پکارا۔

''بابا!'' وہ بستر پر ہی کھڑا ہوگیا۔ اب اس کے کندھے ریان کے برابر پہنچ رہے تھے۔

''جبرائیل تم مت جاؤ۔'' شدت ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''اگر تم چلے گئے تو میں اکیلا رہ جاؤں گا۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

اندھیرے میں بھی اسے اس چھوٹے سے بچے کا چہرہ کھلتا دکھائی دیا تھا۔ وہ بے اختیار ریان کے گلے لگ گیا۔

''بابا! مجھے بھی نہیں جانا۔'' اس کے کندھے سے سر ٹکائے وہ کہہ رہا تھا۔ ریان کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

''میرے ساتھ سونا ہے؟''

''جی بابا۔'' اس نے جھٹ سر ہلا دیا۔

''اور میں لائٹ بھی آف رکھوں گا۔'' ریان نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اور بھی کھل اٹھا۔

ایک بوجھ سا تھا جو اس کے کاندھوں سے سرکتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

''یہ لیں بی بی جی! میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں۔'' بشیر نے پکوڑوں کی پلیٹ اس کے آگے کی تو اس نے ایک پکوڑا اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔

''پھر تو ہم کھاتے ہی ہاسپٹل پہنچ جائیں گے۔'' جبرائیل نے منہ بنایا تو وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ وہ دونوں بڑے شوق سے کرکٹ میچ دیکھ رہے تھے جو کہ انگلینڈ اور نیوزی لینڈ کے مابین کھیلا جا رہا تھا۔

''بہت اچھے بنائے ہیں۔'' پکوڑے چکھتے ہی اس نے تعریف کرنا ضروری سمجھا۔ بشیر، خوش ہوگیا اور تھوڑی دیر بعد کچن میں واپس چلا گیا۔

''یار! کیا انگلینڈ جیت کر جائے گا۔'' امل نے پریشانی سے کہا، وہ اس وقت انگلینڈ کو سپورٹ کر رہی تھی۔

اتنے میں باؤلر کا ایک زوردار باؤنسر بیٹسمین کے ہیلمٹ پر لگا اور وہ بے اختیار ہی نیچے بیٹھ گیا۔ پھر اپنا ہیلمٹ اتار کر وہ گھومتے سر کو سہلانے لگا۔

''اوہ مائی گاڈ! یہ تو انجرڈ ہو گیا ہے، شاید نہیں ہوا۔ اللہ کرے یہ انجرڈ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ پلیز!'' امل بے اختیار دعا مانگنے لگی تھی۔

''امل!'' جبرائیل زور سے چیخا ''کیا کر رہی ہو تم؟''

''کیا ہوا؟'' وہ حیرت زدہ سی اسے دیکھنے لگی۔

''تم اس کے لیے ill wish کر رہی ہو؟ ایسے نہیں کرتے۔ بابا کہتے ہیں، کبھی کسی کو بد دعا نہیں دیتے اور تم اس کو بد دعا دے رہی ہو۔'' وہ اس پر برس پڑا تھا۔

وہ چپ سی ہو گئی۔

''بابا مجھے اتنا ڈانٹتے اگر میں ایسا کرتا تو۔''

امل نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

''ٹھیک کہتے ہیں تمہارے بابا کبھی کسی کے لیے بد دعا نہیں کرتے چاہے خواہ وہ ہمارا کتنا ہی بڑا دشمن کیوں نہ ہو۔''

اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ اسے بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔

☆☆☆

''بشیر...... بشیر پانی لاؤ۔'' صوفے پر نڈھال سا ہو کر گرتے ہوئے اس نے بشیر کو آواز لگائی۔

وہ ابھی ابھی قذافی سٹیڈیم سے لوٹا تھا اور اس کے جلد لوٹنے کی وجہ وہی کمر کا درد تھا جو کچھ عرصہ غائب رہنے کے بعد بڑی شدت سے لوٹ آیا تھا۔ پہلے تو ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھتی تھیں آج نہایت شدت اختیار کر گئی تھیں۔ نہ صرف کمر بلکہ کندھے کے پٹھوں میں بھی درد سا ہو رہا تھا۔

''السلام علیکم بابا۔'' آواز پر جبرائیل اپنے کمرے سے نکل آیا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی کیونکہ ریان اتنی جلدی کبھی نہیں لوٹا تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے سانس درست کرتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اس کو یوں نڈھال سا دیکھ کر جلدی سے قریب آیا۔ ''بابا! آر یو آل رائٹ؟''

''یس آئی ایم فائن۔'' ریان نے اسے مطمئن کرنا چاہا مگر وہ فکر مندی سے اسے دیکھتا رہا۔

پھر آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''اوں...... ٹمپریچر بھی نہیں ہے۔ سر میں درد ہو رہا ہے کیا؟'' وہ بڑی فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔ وہی میرین کا انداز ریان کے دل میں ایک کانٹا سا چبھا تھا۔

''بس بیٹا! اب لگتا ہے کہ بوڑھا ہو گیا ہوں۔'' وہ پژمردگی سے کہہ رہا تھا۔

''ارے نہیں بابا! آپ تو بہت ینگ ہیں۔''

''میرے بال تو وائٹ ہیں۔''

''سارے تو نہیں ہیں، تھوڑے ہیں۔''

''پتہ ہے جبرائیل۔'' وہ قدرے توقف سے کہنے لگا۔'' آج کل پتا نہیں کیوں میری کمر میں درد رہتا ہے۔''

''تو آپ ڈاکٹر کو چیک کرائیں۔'' اس نے جھٹ حل پیش کیا تھا۔ ریان نے اس کا چہرہ دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔''ڈاکٹر کے پاس جانے کو دل نہیں کرتا۔'' اس کی مسکراہٹ میں بھی ایک عجیب بے چارگی تھی۔

''ویسے بابا۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے پوچھنے لگا'' کہیں آپ دوبارہ تو ویسے..... میرا مطلب ہے ویسے نہیں ہو جائیں گے؟'' اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔

''ویسے کیسے؟'' وہ بالکل نہ سمجھا۔

''ویسے جیسے آئی مین وہیل چیئر پر تھے۔'' وہ ڈرتے ڈرتے کہہ رہا تھا۔

''پتا نہیں۔'' اس نے سامنے والی دیوار کو دیکھتے ہوئے شانے اچکا دیے۔''بس بیٹا! قدر کیا کرو ان ہاتھ پاؤں، آنکھوں، کانوں، زبان کی، ان سب چیزوں کی جو اللہ نے تمہیں دیں اور جن سے کئی لوگوں کو محروم رکھا ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے ہم دیکھ سکتے ہیں، بول سکتے ہیں، چل سکتے ہیں، یہی بہت بڑی نعمت ہے۔ خدا کا شکر ادا کیا کرو اور ہمیشہ دعا مانگا کرو کہ اللہ ہمیں مالی یا جسمانی لحاظ سے کسی کا محتاج نہ کرے۔ کسی کی محتاجی بہت بڑا عذاب ہے۔ بس اللہ کسی پر یہ عذاب نہ ڈالے۔'' وہ اس سے زیادہ خود سے کہہ رہا تھا۔

کمر اور کاندھوں میں ہونے والے درد کی شدت میں کچھ کمی واقع ہوئی تھی۔

☆☆☆

''امل! ایسا کرتے ہیں، آج بشیر کے ساتھ مل کر کچھ بناتے ہیں۔ ٹھیک؟'' جبرائیل کی تجویز خاصی معقول تھی وہ فوراً مان گئی۔

''چلو کچن میں چلتے ہیں۔'' وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی تو جبرائیل بھی اس کے پیچھے ہولیا۔

لیکن کچن میں آ کر امل نے ارادہ تبدیل کر دیا۔

''جبرائیل! بشیر کو اس کا کام کرنے دیتے ہیں ہم کچھ اور کر لیتے ہیں۔''

''کچھ اور؟ فار ایگزیمپل؟'' اس نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

''لان کی صفائی کرتے ہیں۔ پودوں کی، آئی مین۔'' اس نے کئی دفعہ نوٹ کیا تھا کہ لان پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔

''ایسا کرتے ہیں، ہم آج گوڈی کر کے نئے پھول لگاتے ہیں، ٹھیک؟'' وہ پرجوش سی ہو کر کہہ رہی تھی پھر کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی''بابا کچھ کہیں گے تو نہیں۔''

''نہیں تو۔''

''بس پھر ٹھیک ہے کچھ پودے منگوا لیتے ہیں اور کام شروع کرتے ہیں، رائٹ؟''

''رائٹ۔'' وہ بھی پرجوش ہو گیا۔

بشیر کو انہوں نے پودے لینے بھیج دیا۔ کچھ گلاب کی قلمیں اور چند گملے منگوائے تھے۔ پیسے امل دینا چاہ رہی تھی مگر بشیر نے کہا کہ صاحب کو برا لگے گا اسی لیے پےمنٹ اسی رقم سے ہوئی جو ریان بشیر کو دے کر جاتا تھا۔

اس کے جانے کے بعد انہوں نے کھرپی کی مدد سے پورے لان کی گوڈی شروع کر دی۔ خودرو جھاڑیوں اور پودوں کانٹوں اور سخت گھاس سے لان کو پاک کر لینے تک بشیر بھی آ گیا۔ ایک جنگلی پودا اہل نے یونہی رہنے دیا۔ وہ لان کے کنارے پر اگ آیا تھا۔ اہل کو اس کا نام نہیں آتا تھا مگر اس کا پرپل سا پھول دیکھنے میں کافی خوش نما تھا۔

جب اپنے نئے لگائے گئے پودوں کو اس نے کھاد اور پانی دیا تو اس پودے کو خاص طور پر اچھی والی کھاد ڈالی، تاکہ وہ مرجھا نہ جائے۔ اسے پتا نہیں کیوں وہ پودا اچھا لگا تھا۔

تقریباً ساڑھے تین گھنٹے میں صفائی مکمل ہوئی تو وہ بہت خوش تھی۔

اس نے بشیر کو ان کی کھاد اور پانی کے متعلق ڈھیر ساری ہدایات ذہن نشین کرا دیں۔

شام کو جب ریان گھر آیا تو لان کو دیکھ کر چونک پڑا۔

"یہ سب کس نے کیا ہے؟" اس نے بشیر سے پوچھا۔ کم از کم اسے بشیر سے ایسی امید نہ تھی کہ وہ اتنی دلجمعی سے کام کرے گا۔

"یہ وہ جبرائیل صاحب کی دوست ہیں نا۔ اہل باجی، انہوں نے کیا ہے۔ پودے منگوائے تھے مجھ سے اور......"

"اچھا، اچھا ٹھیک ہے۔" اسے جبرائیل کی دوست میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر وہ کم از کم متاثر ضرور ہوا تھا کہ کتنی اچھی بچی ہے کتنی نفاست سے لان صاف کیا ہے۔

ظاہر ہے، اس کے خیال میں جبرائیل کی دوست بچی ہی ہونا تھی۔

☆☆☆

"ریان! میں آپ کو ایمان داری سے ساری بات بتاؤں گا۔ مجھے آپ کو پہلے بھی کہنا تھا کہ زیادہ مشقت آپ کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہیں۔ آپ اپنی ہمت سے زیادہ بوجھ اٹھا رہے ہیں۔ ابھی آپ کو ٹھیک ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور آپ کرکٹ کھیلنے لگے ہیں، درمیان میں آپ نے اپنا چیک اپ بھی نہیں کرایا۔ یہ آپ کو نقصان دے گا۔ آپ جسم پر بوجھ ڈال رہے ہیں۔"

ڈاکٹر رضا کچھ خفگی سے کہہ رہے تھے۔

ریان ویک اینڈ پر جبرائیل کو لے کر کراچی آیا تھا اور بالآخر ایک فیصلہ کر کے ڈاکٹر رضا اپنے نیورولوجسٹ کے پاس گیا تھا اور وہ تو سخت بھرے بیٹھے تھے۔

"آپ کا جسم ابھی اتنا اسٹرانگ نہیں ہوا کہ وہ اتنا کام کر سکے میں نے کہا تھا آپ اپنا خیال رکھیں۔ ذہن اور جسم دونوں پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں ورنہ آپ دوبارہ بھی خدانخواستہ بستر پر پڑ سکتے ہیں۔ پھر کیا کریں گے آپ؟"

وہ خاموشی سے ٹیبل کی شیشے والی سطح کو دیکھتا رہا۔

"فی الحال تو میں کچھ دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں، انہیں استعمال کریں، زیادہ ورزش اور اچھل کود سے پرہیز کریں اور اس کے علاوہ میرا مشورہ سمجھ لیں، کرکٹ چھوڑ دیں۔"

ریان نے چونک کر سر اٹھایا اور بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

''کرکٹ نہیں چھوڑیں گے تو پھر یہی ہوگا، تھکاوٹ، درد اور سستی بہتر ہوگا کہ چند دن کے لیے کسی پُرفضا مقام پر چلے جائیں۔'' وہ اب نرم لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ریان کچھ سوچتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور نسخہ جیب میں ڈال کران کے آفس سے نکل گیا۔

پرفضا مقام تو قذافی سٹیڈیم ہی تھا جہاں چھ دن بعد ویسٹ انڈیز کے خلاف پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا جانا تھا۔

''ڈاکٹر جتنا کہے، میں کرکٹ نہیں چھوڑوں گا۔'' اس کے اندر کے ضدی ریان حیدر نے سر اٹھایا تھا۔

☆☆☆

''تم نے اس کو کھاد ڈالی تھی؟'' وہ نہایت فکر مندی سے اس پودے کو دیکھ رہی تھی جو پہلے سے کافی مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔

''جی، بی بی جی اور روز پانی لگاتا ہوں۔'' بشیر جو اس کے قریب ہی کھڑا تھا نے مودب سا ہو کر بتایا۔

''تو پھر کیا وجہ ہے کہ یہ اتنا کمزور ہو گیا ہے؟'' اسے اس پودے کی بے حد فکر ہو رہی تھی۔

''معلوم نہیں جی۔''

''کیا ہوا؟'' جبرائیل اپنے ہاتھوں میں ایک البم تھامے باہر آیا تو ان دونوں کو یوں پریشان پا کر پوچھنے لگا۔

''جبرائیل! یہ پودا کیوں سوکھتا جا رہا ہے؟'' اس کے استفسار پر اس نے شانے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

''مجھے تو نہیں پتا، شاید وہ جو چیز تم نے ڈالی تھی، اس کے لیے صحیح نہیں تھی۔''

''کیا؟ کھاد؟ نہیں، وہ تو ٹھیک تھی خیر تم یہ کیا لے کر آئے ہو؟'' اس نے البم کی جانب اشارہ کیا۔

''یہ فوٹوز ہیں، میری مما کی۔''

''اچھا، آؤ دیکھتے ہیں۔'' وہ اشتیاق سے بولی۔

''یہ دیکھو۔'' وہ دونوں برآمدے کے عین وسط میں رکھی سفید میز کے گرد بچھائی گئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''یہ میری ممی ہیں۔'' اس نے میرین کی ایک تصویر پر انگلی رکھ دی۔ اس نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ میرین کی آنکھوں میں ریان کی بے حد مشابہت تھی۔

''نام کیا تھا تمہاری ممی کا؟''

''میری اینے آئر۔'' اس نے بتایا۔

''تمہاری ممی کرسچن تھیں؟'' اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

''ہاں۔''

''اور ڈیڈی؟''

''وہ بھی رومن کیتھولک تھے۔''

''اور تم؟''

''میں تو مسلم ہوں۔ کیونکہ میرے بابا مسلم ہیں۔'' اس نے سادگی سے بتایا۔

اہل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ممی یاد آتی ہیں؟'' وہ یونہی پوچھنے لگی۔

''ہاں بہت۔'' وہ یکدم اداس سا ہو گیا تھا۔

''کچھ نہیں ہوتا، دیکھو سب نے مرنا ہے۔ اچھا میری بات سنو۔ اگر......اگر، اگر میں مرگئی تو تم کیا کرو گے؟'' وہ اس کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تو تمہیں یاد کر کے رووں گا۔''

''اچھا، ذرا رو کر دکھاؤ۔''

''پہلے تم مر کر دکھاؤ۔'' اہل بے اختیار ہنسنے لگی تھی۔

''سنو آج میچ کا آخری دن ہے۔ پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے پہلے ٹیسٹ کا۔ چلو دیکھتے ہیں۔'' جبرائیل کو اچانک یاد آیا تھا۔

''نہیں جبرائیل، چلو کچن میں چل کر کچھ ککنگ کر لیتے ہیں، ٹھیک؟''

''تم پاکستان کا میچ نہیں دیکھو گی؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''میرا دل نہیں کر رہا، چلو کچھ پکاتے ہیں۔'' وہ اسے ٹالتے ہوئے کچن میں لے گئی۔

☆☆☆

''نومی! تم ڈیپ اسکوائر لیگ میں چلے جاؤ اور ارمغان! تم سلپ میں آجاؤ۔'' اس نے زور سے چلا کر کہا جو اس سے کافی فاصلے پر کھڑے تھے۔

''میں تھرڈ سلپ میں آؤں؟'' ارمغان اس کے قریب آ رہا تھا۔

''نہیں، سیکنڈ سلپ پر۔''

''مگر سیکنڈ پر تو اکرم ہے۔''

''ارمغان! بحث نہیں کرو۔ وہ گلی پر چلا جائے گا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ ترش ہو گیا تو ارمغان موقع کی نزاکت کا خیال کر کے خاموش ہو گیا اور اس کی بتائی ہوئی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان پہلے ٹیسٹ کا آج آخری دن تھا اور ویسٹ انڈیز کی ٹیم بری طرح ہار رہی تھی۔ ان کے پاس دو وکٹیں باقی تھیں جبکہ شام تک دو سو پچھتر رنز بنانے تھے۔ ظاہر ہے وہ ہارنے والے تھے مگر ریان کی اس وقت حالت عجیب ہو رہی تھی۔

اس کی کمر بے طرح درد کر رہی تھی اور اب وہ درد کمر کے ساتھ ساتھ ٹانگوں میں بھی سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے اور اسے کھڑا رہنا مشکل لگ رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ کسی بھی وقت اپنا توازن کھو سکتا تھا۔

اپنے درد سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ بے چینی سے کبھی دو قدم آگے اور کبھی دو قدم پیچھے چلتا تھا مگر کوئی

افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دولڑکوں کوخوامخواہ ڈانٹ بھی چکا تھا جس سے فیلڈ میں ایک عجیب سا خوف پھیل گیا تھا اور لڑکے ڈر کے مارے اور مستعدی سے کھیل رہے تھے۔

ریان چاہتا تو فیلڈ سے باہر جا کر اپنی جگہ ایک subsitute فیلڈر بھیج سکتا تھا مگر ایسا کرنے پر اس کی کمزوری یعنی کمر کے درد کا راز آشکار ہو جاتا جس سے بعض لوگوں کو بے حد خوشی ہوتی اور ریان ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

اور یہ انا اسے اس وقت بری طرح تڑپا رہی تھی۔ اس انا نے اسے تب تک لٹکائے ہی رکھا جب تک آخری وکٹ نہ گر پڑی اور میچ کا اختتام نہ ہو گیا۔

وہ جلد از جلد ڈریسنگ روم میں جا کر آرام کرنا چاہتا تھا مگر ٹیم کے دیگر کھلاڑیوں اور آفیشلز سے ملنا ناگزیر تھا۔

کافی دیر تک وہ لبوں پر جبری مسکراہٹ سجائے مبارکبادیں وصول کرتا رہا پھر ڈریسنگ روم میں جا کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

پریزنٹیشن سیریمنی کے بعد اس سے رہا نہ گیا، وہ ڈریسنگ روم میں موجود ... سرسری انداز میں کہنے لگا۔

"آپ مائنڈ نہ کریں تو مساج کر دیں۔" ذوین نے چونک کر ...

ریان اندر کاؤچ جا کر اوندھا شرٹ اتار کر لیٹ گیا۔ ... ذوین اس کا مساج کرنے لگے۔ ... پندرہ منٹ بعد وہ کافی بہتر فیل کر رہا تھا۔ مگر اس پندرہ منٹ میں اس نے ایک اہم فیصلہ کر لیا تھا۔

کچھ دیر بعد قذافی سٹیڈیم میں ہونے والی پریس کانفرنس میں اس نے اعلان کیا تھا۔

"میں ریان حیدر، بطور کپتان اور کھلاڑی، ٹیسٹ اور ون ڈے کرکٹ سے ریٹائرمنٹ لے رہا ہوں۔"

کانفرنس روم میں موجود صحافیوں اور میڈیا کے نمائندوں کو پہلے تو سانپ سونگھ گیا۔ یہ اچانک ہی ہونے والا فیصلہ ٹیم منیجر کے لیے بھی شاک کا باعث تھا کیونکہ ریان نے پریزنٹیشن سریمنی میں اگلے میچز سے متعلق حکمت عملی کا ذکر کیا تھا۔

ادھر میڈیا کے نمائندے سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کا چہرہ تک رہے تھے۔

کرکٹ میں کبھی ریٹائرمنٹ سیریز کے درمیان نہیں لی جاتی ہمیشہ ٹورنامنٹ کے ختم ہونے کا انتظار کیا جاتا ہے جبکہ وہ پہلے ہی ٹیسٹ میچ کے بعد ریٹائر ہونے کا کہہ رہا تھا۔

"کیا آپ اس ٹورنامنٹ کے بقیہ سات میچز کھیلیں گے؟" ایک صحافی کو ذرا ہوش آیا تو اس نے سوال کیا۔

"نہیں۔" ریان نے بے تاثر چہرے کے ساتھ دوٹوک انداز میں کہا اور اس کے بعد تو سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔

"کب؟"

"کیوں؟"

"کیسے؟"

"اچانک فیصلے کی وجہ؟"

''یہ فیصلہ اچانک نہیں ہوا۔ میں نے کافی عرصے سے سوچ رکھا تھا۔'' اس نے مختصراً بتایا۔

''کیا آپ نے بورڈ کو اس فیصلے سے مطلع کیا ہے؟'' ایک رپورٹر نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

''میں بورڈ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔'' ریان نے اس سے زیادہ تیکھے انداز میں کہا، وہ سر ہلاتے ہوئے لکھنے میں مصروف ہو چکا تھا۔

ایک صحافی لڑکی نے نہایت مدبرانہ انداز میں سوال کیا۔

''آپ نے یہ فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ آپ سمجھتے ہیں آپ بوڑھے ہو رہے ہیں۔''

''نہیں میں بوڑھا نہیں ہوں میں 34 سال کا جوان ہوں۔'' اس کی بات پر کانفرنس روم میں زوردار قہقہے گونجے تھے۔

''آپ سب نے ہنس لیا ہو تو میں اجازت چاہتا ہوں اور جہاں تک بات ہے ریٹائرمنٹ لینے کی وجہ کی تو وہ آپ کا دردِ سر نہیں ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ اپنے کوچ اور منیجر کے ہمراہ وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆

ڈریسنگ روم میں آ کر اس نے آہستگی سے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا وہ اب تھک چکا تھا۔ اب اور کتنا کھیلتا؟ دس سال بھی مزید کھیل کر ریٹائر ہوتا تو گیارہویں برس دنیا اسے فراموش کر چکی ہوتی۔

کرکٹر جب تک شاٹس لگاتا اور وکٹس لیتا رہے، مصور جب تک شاہکار پینٹ کرتا رہے، مصنف جب تک بیسٹ سیلرز لکھتا رہے اور ایکٹر جب تک ہٹ فلموں میں کام کرتا رہے وہ یاد رکھا جاتا ہے، وہ ذرا سا اپنے ڈگر سے ہٹے، دنیا اسے فراموش کرنے میں دیر نہیں لگایا کرتی۔

وہ چاہتا تھا کہ دنیا اسے نہ بھولے مگر یہ تو خلافِ فطرت بات ہوتی اور ایک ناممکن بات کو ممکن بنانے کے لیے وہ اپنی صحت داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔

یہی خواہش تھی نا اس کی کہ وہ دوبارہ کرکٹ کے میدان میں قدم رکھے تو وہ پوری ہو چکی تھی پھر جانا تو سب کو ہوتا ہے۔ اگر کرکٹرز کا کیریئر کبھی نہ ختم ہونے والا ہوتا تو بھلا وہ اس جگہ کس طرح پہنچتا؟ اس سے پہلے کرکٹرز گئے تھے تو وہ آیا تھا۔ اب اسے بھی جانا تھا اپنے بعد آنے والوں کے لیے۔

اپنا بیگ کاندھے پر ڈالے وہ باہر نکل آیا اور بنا کسی سے بات کیے ایگزٹ ڈور کی جانب بڑھ گا۔

صحافیوں کا ہجوم اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ ایک لفظ بھی کہے بغیر پارکنگ ایریا میں موجود اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور اسے گھر کے راستے پر ڈال دیا۔

پریس کانفرنس میں کہا گیا آخری جملہ وہ نہیں تھا جو ریان نے اس وقت سوچا تھا جب ڈیرن اس کا مساج کر رہا تھا۔ اس نے کئی فقرے وہ ''وجہ'' بتانے کے لیے ذہن میں جمع کیے تھے جس کے باعث وہ ریٹائر ہو رہا تھا مگر جس وقت وہ ''وجہ'' بتانے لگا تمام الفاظ حلق تک پہنچ کر دم توڑ گئے۔

اس نے پوری منصوبہ بندی کی تھی کہ وہ جاتے جاتے چیئرمین صاحب اور ارمغان کو پھنسا دے گا کہ ان کے "نازیبا رویے" کے باعث وہ کرکٹ سے کنارہ کشی اختیار کر رہا ہے۔

ریان بھولنے والوں میں سے کبھی نہ تھا اس کو اپنا انتقام تو مرزا صاحب اور ان کے بیٹے سے لینا ہی تھا مگر عین وقت پر اسے ایک اور خیال آیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اللہ انسان سے کتنی محبت کرتا ہے، ماں سے بھی زیادہ، تو کیا ماں سے غلط چیز مانگو تو وہ دے گی نہیں نا۔ تو پھر اللہ نے کیوں اسے وہ سب دیا جو اس کی غلط خواہشات کا نتیجہ تھا۔

اور اس لمحے، قذافی سٹیڈیم کے پریس کانفرنس روم میں بیسوں رپورٹرز اور آفیشلز کے درمیان گھرے اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اللہ نے اس کی "غلطیاں" معاف کیوں نہ کیں؟

کیونکہ وہ خود کسی کو معاف نہیں کرتا تھا اگر وہ معاف کرنا سیکھ جاتا تو شاید اللہ بھی اس کو معاف کر دیے۔ اور معافی ہے بھی کیا؟ کسی بھی شخص کے گناہ یا جرم سے اس وقت صرف نظر اور درگزر کرنا جس وقت انسان میں بدلہ لینے کی طاقت موجود ہو۔

زندگی میں پہلی بار اس نے "درگزر" کا راستہ چنا، زندگی میں پہلی بار اس نے معاف کرنا سیکھا تھا۔

☆☆☆

پورچ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے وہ بالکل پرسکون تھا، البتہ اب وہ آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اسے اصل وجہ جبرائیل اور پھر اپنے گھر والوں کو بتانی تھی۔

سوچوں میں گھرا جس وقت وہ لان عبور کر کے گھر میں داخل ہوا اسے باتیں کرنے کی آواز کچن اور پینٹری سے آتی سنائی دی۔ پتہ نہیں جبرائیل نے میچ دیکھا بھی ہوگا یا نہیں، وہ یہی سوچتا ہوا کچن کی جانب بڑھا جب ایک منظر نے اس کے قدم روک لیے۔

جبرائیل اس وقت ٹیبل کے اوپر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا جبکہ چولہے کے پاس کھڑی پتیلے میں چمچہ ہلاتی لڑکی کی اس کی جانب پشت تھی۔

"یہ جبرائیل کی وہ دوست ہے؟ کیا نام تھا، ہاں، امل مگر وہ تو اس کو تو چھوٹی سی بچی ہونا چاہیے تھا نہ کہ اتنی بڑی لڑکی۔" وہ کچھ الجھتے ہوئے اس کی پشت کو دیکھتا رہا۔

امل نے دوپٹہ گلے میں ڈالا ہوا تھا جبکہ اس کی پتلی کمر پر سیاہ لمبے بالوں کی آبشار بہہ رہی تھی۔

نجانے کیوں وہ ان بالوں کو دیکھتا رہا، اسے کچھ اور یاد آیا تھا۔ ایک دم ہی وہ مڑنے لگی تو وہ قدرے اوٹ میں ہو گیا۔ اس نے ریان کو نہیں دیکھا تھا مگر وہ اسے دیکھ چکا تھا۔

اور پھر......

وہ واقعی سانس لینا بھول چکا تھا۔

یہ وہی لڑکی تھی جسے اس نے بے حد ڈھونڈا تھا وہ اتنے عرصے سے اس کے گھر آتی جاتی رہی اور اسے علم بھی نہ ہو سکا۔

''اے بدتمیزی نہیں، آج کل میں ذرا جلدی مائنڈ کرتی ہوں۔'' وہ رعب جماتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''تم مائنڈ کرتی ہو؟ مگر مائنڈ کرنے کے لیے تو مائنڈ mind چاہیے ہوتا ہے جو کہ تمہارے پاس نہیں ہے۔ پھر کیا کسی سے ادھار لیا ہے؟'' جبرائیل نے برجستہ کہا تھا۔

ریان الٹے قدموں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ابھی اسے اس بات کا یقین کرنا تھا کہ وہ واقعی اسے دیکھ چکا ہے، وہ بھی اپنے گھر میں۔

☆☆☆

''آپ کب آئے؟ میں نے گاڑی کی آواز ہی نہیں سنی۔'' امل کے جانے کے بعد وہ فوراً ریان کے کمرے میں آیا تھا۔ اس کو پورچ میں اس کی گاڑی دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

''تم مصروف تھے اپنی فرینڈ کے ساتھ۔'' وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''آپ امل سے مل لیتے، ورنہ جب بھی وہ آتی ہے آپ نہیں ہوتے۔''

''پھر مل لوں گا، کل آئے گی نا؟'' اس نے مسکراہٹ دبائے پوچھا۔

''اچھا ایک بات بتاؤ۔ تم نے اسے بتایا تو ضرور ہوگا کہ میں ریان حیدر کا بیٹا ہوں۔'' وہ متجسس انداز میں پوچھنے لگے۔

''نہیں، میں نے نہیں بتایا۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیوں؟''

''میں نے سوچا وہ یہ نہ کہے کہ میں شو مار رہا ہوں۔ میری کلاس میں ایک لڑکا شو مارتا تھا مجھے سخت برا لگتا تھا وہ۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ، وہ کرکٹ میچز دیکھتی ہے؟'' کسی خیال کے تحت وہ پوچھنے لگا۔

''نہیں، مطلب پاکستان کے نہیں دیکھتی، باقی ساری دنیا کے دیکھتی ہے۔ پتا نہیں کیوں۔'' اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

''مجھے پتا ہے۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔ پھر سر جھٹک کر بولا۔ ''سنو تم ایک کام کرو۔ اسے کل گھر بلا لو، مگر یہ نہ بتانا کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔ رائٹ؟''

''پر آپ کیوں ملنا چاہتے ہیں؟'' جبرائیل نے کچھ مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

''کیونکہ وہ تمہاری دوست ہے نا؟'' اس نے ٹال دیا۔

یکدم فون کی گھنٹی نے اس کی سوچوں میں خلل ڈالا۔ اس نے چونک کر اپنے سیل فون کی اسکرین پر جگمگاتا نمبر دیکھا، پھر کال ریسیو کر لی۔

''السلام علیکم مما۔'' وہ بشاشت سے بولا۔

''ریان! یہ تم نے بغیر بتائے اچانک یہ کیوں کیا؟'' وہ سلام کا جواب دیے بغیر ہی شروع ہوگئی تھیں ان کے لہجے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔

''کیا؟ میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔

''تم نے ریٹائرمنٹ لے لی ہے رونی۔''

''اوہ اچھا وہ!'' اس کے بارے میں ذہن ایسا الجھا تھا کہ وہ یہ والی بات ہی بھول گیا تھا۔''وہ مما! میں بتا دیتا، مگر اچانک ہی فیصلہ کیا تھا۔''

''وہی تو بیٹا! کیوں فیصلہ کیا؟ خیریت تھی؟'' وہ اس کے لیے فکر مند ہو گئی تھی۔

''خیریت تو تھی مما مگر اب میں کرکٹ نہیں کھیل سکتا۔ میرا جسم درد کرتا ہے ڈاکٹر نے تو کہا تھا کہ میں ریٹائرمنٹ لے لوں مگر میں ہی اڑا رہا۔ لیکن اب فیصلہ کر ہی لیا۔''

''تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ جسم درد کرتا ہے؟''

''چھوڑیں مما! وہ بس کھیلتے ہوئے درد کرتا ہے۔'' وہ ٹالتے ہوئے بولا۔''اب کرکٹ چھوڑ دی ہے، اب بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کراچی کی سنائیں۔'' اس نے حسب معمول انہیں ہانڈی میں الجھا لیا تھا۔

☆☆☆

وہ روز کی طرح آج بھی اس گھر آئی ہوئی تھی مگر آج اسے اس بات پر حیرانی ہوئی تھی کہ جبرائیل کے بابا کی کار پورچ میں کھڑی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ دروازے سے ہی پلٹ جائے مگر جبرائیل اسے دیکھ چکا تھا اسی لیے اندر لا کر ہی چھوڑا۔

اور اس وقت وہ بیٹھے کارٹون دیکھ رہے تھے جب جبرائیل یکدم کھڑا ہوگیا اور اس کے پیچھے کسی کو دیکھ کر بولا۔

''السلام علیکم بابا!''

وہ کرنٹ کھا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جلدی سے مڑی

''اسلام عل۔'' سلام اس کے لبوں تک ہی رہ گیا تھا۔ وہ بے یقینی سے اپنے سامنے کھڑے ریان حیدر کو دیکھ رہی تھی۔

اس کا منہ حیرت سے آدھا کھل چکا تھا اور آنکھیں بے یقینی سے پھٹی رہ گئیں۔ وہ کبھی جبرائیل کو دیکھتی تو کبھی ریان کو۔ اس کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے، کیا کرے۔

''اسلام علیکم۔'' ریان نے سنجیدگی سے سلام کیا۔

''جبرائیل میرا بیٹا ہے۔''

''مگر تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے بابا وہ......وہ کیمسٹری کے پروفیسر ہیں، وہ اکیڈمی میں ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔'' جو اس کے منہ میں آیا وہ بول پڑی۔

''واٹ؟ میں نے؟ میں نے کہا تھا۔'' جبرائیل حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔''میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ وہ اکیڈمی جاتے ہیں۔''

''آ...... ہاں وہ۔'' وہ بے چارگی سے کبھی اس کو اور کبھی اس کے باپ کو دیکھتی۔

''میرا خیال ہے باقی باتیں آپ نے خود ہی فرض کر لی ہوں گی۔ آپ ہمیشہ سے خود سے باتیں کرنے میں اچھی ہیں۔''

امل نے چونک کر اسے دیکھا، پھر نگاہیں چرالیں۔

''مم، میں چلتی ہوں۔'' وہ جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔

''ایسے کیسے جائیں گی آپ؟ پہلے یہ طے تو کر لیں کہ...... میں کیمسٹری کا پروفیسر ہوں یا نہیں، یا میری کیمسٹری کیا ہے۔'' وہ مسکراہٹ دبا کر بظاہر سنجیدگی سے کہنے لگا۔

جبرائیل اس کا اشارہ پا کر کھسک گیا، تو اس نے نرمی سے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

''نہیں، میں چلتی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''یہ پہلی دفعہ ہو رہا ہے الماس! کہ جہاں میں آیا ہوں تم وہاں سے جانا چاہ رہی ہو، ورنہ ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے کہ جس جگہ میں جاتا ہوں تم وہیں پہنچی ہوئی ہوتی ہو۔''

''امل!'' اس نے اپنے جوتوں کو دیکھتے ہوئے تصحیح کی۔

''واٹ ایور۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

وہ وہیں صوفے پر ٹک گئی، مگر یوں جیسے بھاگنے کے لیے تیار ہو۔

''میں نے بڑا ویٹ کیا تمہارا، انگلینڈ میں کہ شاید تم آؤ۔ مگر تم نہیں آئیں کیوں؟'' وہ اس کے مومی چہرے کو نگاہوں کی گرفت میں لے کر بولا۔

اس نے بالوں کو پونی ٹیل میں کسا ہوا تھا اور اس کے باوجود چند ایک آوارہ لٹیں اس کے چہرے پر آہی گئی تھیں۔ اس نے اسکائی بلیو اور لائٹ گرین کمبینشن کا سادہ سا لباس پہنا ہوا تھا۔ مگر وہ بہت پرکشش لگ رہی تھی۔

''غلطی تھی میری۔'' وہ لب کاٹ رہی تھی۔ ''میں سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی جو میرا مقدر نہیں تھا، اسے مقدر بنانے پر تلی ہوئی تھی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''مگر آپ کبھی میرا مقدر نہیں بن سکتے۔''

''تم ہر بات خود ہی کیوں فرض کر لیتی ہو؟ پہلے میری بات تو سنو۔'' وہ کچھ تیزی سے ابرو چڑھا کر بولا۔

''تم مجھ سے کس بات کا انتقام لینا چاہتی تھیں؟''

امل نے پلکیں اٹھا کر اسے شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا۔ ''کیا واقعی آپ کو نہیں معلوم؟'' اس کے لہجے میں طنز کے ساتھ ساتھ تلخی بھی در آئی تھی۔

''نہیں، مجھے نہیں معلوم۔''

''آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ میری ایگو کو ہرٹ کیا تھا۔ مجھے بے عزت کیا تھا۔'' اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

''کب؟'' وہ گویا تمہید باندھ رہا تھا۔

''کب؟'' امل نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''جب آپ فون پر میرے ساتھ ٹائم پاس کر رہے تھے تب۔'' وہ کچھ غصے سے بولی۔

''مجھے پتا ہے تم نے ایک لڑکے سے فون پر بات کی تھی لیکن مجھے اتنا تو بتاؤ کہ میں نے کیا برا کیا تھا؟''

اس نے بے حد خفگی سے اسے دیکھا ''کیا کسی کی عزت نفس مجروح کرنا اور دل دکھانا بری بات نہیں ہے؟''

''اور کیا کسی چیز کا غلط استعمال بری بات نہیں ہے؟'' وہ دو بدو بولا۔

''میں نے کس چیز کا غلط استعمال کیا ہے؟'' وہ روہانسی سی ہو کر اسے تکنے لگی۔

''کیا تم نے فون کا غلط استعمال نہیں کیا؟ کیا تم نے مما کے اعتبار اور اعتماد کو دھوکا نہیں دیا تھا؟ تم سارا الزام مجھ پر کیوں ڈال رہی ہو؟ جو میں نے کیا وہ غلط تھا وہ اس غلط کا غلط نتیجہ تھا جو تم نے کیا اہل! جو کام ساری دنیا سے چھپ کر غلط طریقے سے کیا جائے اس کا رزلٹ بھی غلط آتا ہے۔ جس چیز کی بنیاد ہی کسی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر رکھی جائے وہ کیسے پایہ تکمیل تک پہنچے گی؟ کیا تم نے کبھی یہ سوچا؟'' وہ جرح کر رہا تھا مگر اس کا لہجہ بے حد نرم تھا۔

وہ بے اختیار لب کاٹنے لگی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ جانتی تھی۔

''اور تم صرف میرے عمل کو غلط اور برا کیوں گردانتی ہو ہاں؟ کیا ساری لڑکیاں اتنی بے وقوف ہوتی ہیں کہ فون پر کسی لڑکے سے، جس کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بات کرنے سے ہی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں؟ کیا ساری لڑکیاں اتنی ہی بے وقوف اور کم عقل ہوتی ہیں کہ وہ لڑکوں کی نیچر کو نہیں سمجھ پاتیں؟ فون یا انٹرنیٹ پر لڑکیوں کے ساتھ ٹائم پاس کرنا تو لڑکوں کی ہابی ہوا کرتی ہے، پھر لڑکیاں کیوں جذباتی ہو جاتی ہیں؟ کیوں لڑکوں سے امیدیں وابستہ کر لیتی ہیں؟ کیوں یہ سمجھنے لگتی ہیں کہ لڑکے ان کی طرح بے وقوف اور اسٹوپڈ ہیں جو محض ان کی آوازوں سے ہی عشق میں مبتلا ہوں گے۔

جب کوئی لڑکی جذباتی ہو جاتی ہے تو لڑکے اسے ایسے ہی چھوڑ دیا کرتے ہیں جیسے میں نے تمہیں چھوڑا مگر ایمان داری سے بتاؤ۔ کیا میں نے تم سے فلرٹ کرنے کی کوشش کی تھی یا محض دوستی کرنے کی؟ صرف دوستی کی تھی میں نے اور پھر اسی طرح پیچھا چھڑایا جس طرح سب کرتے ہیں۔ سب لڑکیوں کو پتا ہوتا ہے ان باتوں کا، پھر بھی پتا نہیں کیوں وہ جذبات میں اندھی ہو جاتی ہیں۔''

''مجھے تو نہیں پتا تھا۔ میں نے تو کبھی کسی سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ صرف، صرف آپ سے کی تھی اور.....'' وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی، اس کی آواز بھیگ چکی تھی۔ وہ سر جھکائے انگلیاں چٹخاتی رہی۔

''کیوں کی تھی؟ یہ تو میں پوچھ رہا ہوں۔ کیوں تم نے مجھ سے بغیر میرے بارے میں کچھ جانے بات کی تھی؟ لڑکیاں کیوں اجنبیوں پر بھروسہ کرنے لگتی ہیں۔ تم میرے بارے میں کتنا جانتی تھیں؟ وہی جو میں نے تمہیں اپنے بارے میں بتایا اور جو تم نے مما سے سنا تھا۔ حالانکہ کبھی بھی کسی کے متعلق کہی گئی بات کا اعتبار نہیں کیا کرتے۔'' وہ تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میں نے غلط کیا تھا، میں، میں مانتی ہوں مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ مگر آپ نے، آپ نے اتنی بڑی سزا کیوں دی مجھے؟'' وہ اب رو رہی تھی۔

''میں نے تو کوئی سزا نہیں دی تھی۔ تم نے خود اپنے آپ کو سزا دی تھی۔ ہر انتقام لینے والا اپنے آپ کو سزا دیا کرتا ہے۔ اس کے دشمن کی تو زندگی خراب ہوتی ہے مگر ساتھ ساتھ اس کی اپنی زندگی بھی برباد ہو جاتی ہے۔ کبھی انتقام لے کر دل کو خوشی نہیں ہوا کرتی۔ کیا تمہارا دل خوش ہوا تھا جب تمہاری بد دعاؤں نے مجھے نیم مردہ حالت میں پہنچا دیا تھا؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر آنسو اسے بولنے نہیں دے رہے تھے۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ریان خاموش ہو گیا۔ اسے بے حد دکھ ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اس کے قریب جا کر اس کے بالکل سامنے دوزانو بیٹھ گیا اور دھیرے سے اس کے مرمریں ہاتھ چہرے سے ہٹائے۔

''ادھر دیکھو میری طرف۔'' وہ اس کی سرخ ہوتی آنکھیں اور آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھتے ہوئے نرمی اور ملائمت سے بولا۔ ''اب رو کیوں رہی ہو؟ رونے سے پچھلا وقت واپس آ جایا کرتا ہے کیا؟''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''میں جانتا ہوں میں نے غلط کیا۔ مگر قصور تو ہم دونوں کا ہے نا! پھر میں تو نہیں رو رہا۔'' وہ اس کے ہاتھ تھامے دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔

''لیکن آپ اس روز روئے تھے جب میں ہاسپٹل ......'' وہ ایک دفعہ پھر رونے لگی تھی۔

''اف دیکھو۔ تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ مجھے تمہاری بدعائیں لگی ہیں ...... وہ تو میری قسمت تھی۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

وہ روتے روتے رک گئی ''لیکن ابھی تو آپ نے کہا تھا۔''

''بکواس کی تھی میں نے ......'' وہ زچ ہو کر بولا۔

وہ اسی طرح اسے دیکھتی رہی، پھر اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ ریان کے ہاتھوں میں ہیں۔ کچھ جھجک کر اس نے اپنے ہاتھ نکالنے چاہے مگر اس کی مضبوط گرفت کے باعث وہ ناکام ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے کٹورے ایک دفعہ پھر لبالب بھر گئے۔

''اُفوہ ..... تم رونا تو بند کرو۔'' وہ چڑ گیا۔ ''ایک تو تم لڑکیاں بات بات پر رونے کیوں لگتی ہو؟''

''بڑا تجربہ ہے لڑکیوں کا۔'' وہ خفگی سے بولی تو وہ گڑبڑا گیا۔

''ج ..... جی نہیں مجھے کوئی لڑکیوں کا تجربہ نہیں، اچھا!''

''اچھا ..... اور وہ ......'' وہ نگاہیں جھکا کر آزردگی سے بولی۔ ''وہ آپ کی بیوی۔''

''میری بیوی؟'' وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا، پھر یاد آیا کہ ماضی قریب میں اس کی ایک بیوی بھی ہوا کرتی تھی۔

''اوہ ہاں، وہ ..... اس کو تو میں نے چھوڑ دیا ہے۔''

''واٹ؟'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی ''کیا مطلب؟ یہ کب ہوا؟ مجھے تو علم نہیں۔''

''کیوں؟ آپ کو بتا کر چھوڑنا تھا۔'' وہ مسکرایا تو کچھ خفیف سی ہو کر اس نے اپنے ہاتھ چھڑوا لیے۔

''میرا مطلب تھا، میں نے کہیں اخبار وغیرہ میں پڑھا نہیں۔'' وہ نظریں چرا کر کہنے لگی۔

''لگتا ہے تم اخبار پڑھتی ہی میری خبروں کے لیے ہو۔'' وہ لہجے کو مشکوک بنا کر بولا تو اس نے فوراً تردید کی۔

''جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کرنے لگی۔

وہ چند ثانیوں تک اس کی کارروائی ملاحظہ کرتا رہا، پھر زیر لب مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''تم ہر جگہ میرے پیچھے آتی تھیں، یقین کرو مجھے تمہاری عادت سی ہوگئی تھی۔ میں ہمیشہ لاشعوری طور پر تمہارا انتظار کیا کرتا تھا۔''

امل حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کا تو خیال تھا کہ اس نے شاید ہی کبھی اسے نوٹ کیا ہو۔

''مجھے تم بہت اچھی لگتی تھیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے تم سے محبت تھی یا ہے، مگر میں اتنا ضرور کہتا ہوں کہ میں تمہیں بے حد پسند کرتا ہوں۔ محبت کا کیا ہے، وہ تو بعد میں ہو ہی جائے گی۔''

''بعد میں؟'' اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

''ہاں بعد میں۔'' وہ بڑے مزے سے بولا ''کیوں، تمہیں میرا ساتھ قبول نہیں ہے کیا؟''

وہ سٹپٹا کر اسے دیکھنے لگی۔

''میں......وہ۔'' اس نے بمشکل تھوک نگلا۔ ''پتا نہیں۔''

''ویسے تم سوچ لو۔'' میں تمہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔ میں نہ تو پہلے جیسا خوب صورت رہا ہوں نہ ہی ایکٹو۔ میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرا دماغ اور جسم کافی کمزور ہو چکا ہے۔ ہوسکتا ہے میں چند ماہ یا سال بعد خدا نخواستہ معذور ہو جاؤں ہوسکتا ہے دوبارہ کومے میں چلا جاؤں یا ہوسکتا ہے بالکل نارمل لائف گزاروں۔ مجھے نہیں پتا بہر حال، تم کافی خوب صورت ہو مشکل سے تیس چوبیس کی لگتی ہو۔ اصل عمر نہیں پوچھوں گا کیونکہ لڑکیوں سے عمر اور مردوں سے تنخواہ نہیں پوچھا کرتے۔ تمہیں کوئی اور اچھا آدمی بھی مل سکتا ہے ویسے میں زیادہ لفاظی نہیں کروں گا۔ سیدھے سادے الفاظ میں کہہ رہا ہوں کہ تم میرے ساتھ خوش رہو گی۔''

''سب سے پہلے تو آپ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ آپ بوڑھے ہیں۔ آپ ماشاء اللہ کافی ینگ ہیں۔ دوسری بات، میں نے محبت کی ہے ریان! میں کبھی آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی چاہے آپ خدانخواستہ پہلے جیسے معذور ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہو۔ مگر میں ایک بات کر رہی ہوں'' اس نے جلدی سے کہا تھا۔

''میں بوڑھا نہیں ہوں؟ میرے بال ہی تو سفید ہیں۔'' وہ لبوں پر زخمی مسکراہٹ لیے بولا۔

''جبرائیل کو آپ نے ایڈاپٹ کیا ہے؟'' وہ کچھ یاد آنے پر پوچھنے لگی۔

''ہاں، میری کزن تھی میرین۔ اس کا بیٹا ہے۔'' پھر وہ شرارت سے مسکرایا۔

''تم کیا سمجھی تھیں؟ میں نے سات آٹھ سال پہلے بھی کوئی شادی کی تھی؟''

''نہیں، وہ مجھے بتا چکا تھا۔'' وہ جواباً مسکرائی۔

''تم سے بہت اٹیچڈ ہے۔ آئی ہوپ تم اس کا مستقبل میں خیال رکھو گی۔'' اس کی بات پر امل نے بے اختیار سر جھکا لیا مگر وہ اس کے چہرے کو سرخ ہوتا دیکھ چکا تھا۔

''سنو۔'' اس نے شہادت کی انگلی سے اس کی تھوڑی اوپر کی۔ ''تمہیں ایک بات بتاؤں۔''

امل نے سوالیہ نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''تم یوں سمپل سی بہت اچھی لگتی ہو۔''

اس کی نگاہوں کی حدت سے اس کے گال دہکنے لگے تھے۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں چلتی ہوں۔'' وہ باہر کی جانب بڑھی۔

''ایک منٹ۔'' وہ اس کے پیچھے لپکا۔

وہ تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی جب برآمدے کے فرش پر پلر سے کمر ٹکا کر بیٹھے جبرائیل کو دیکھا۔

وہ اس کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ اپنے عقب میں سنائی دیتے قدموں کی چاپ ریان کی آمد کا پتہ دے رہی تھی مگر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اسی پوزیشن میں کھڑی، لان میں پورچ کے قریب اگے ہوئے اس پر بیل پھولوں والے پودے کو دیکھنے لگی جو اس کی نگہداشت کے باوجود کافی کمزور سا ہوگیا تھا۔

''کرلیں آپ لوگوں نے باتیں؟'' جبرائیل کافی دیر تنہا بیٹھنے پر ناراض، ناراض سا لگ رہا تھا اسی لیے ریان کے آتے ہی اس سے پوچھا ''اب مجھے بھی ان کی سمری بتائیں۔''

''وہ تم اپنی فرینڈ سے پوچھ لو۔'' ریان اپنی جان چھڑا کر پورچ میں کھڑی گاڑی سے کمر ٹکا کر کھڑا ہوگیا۔

امل نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔

یہ وہ شخص تھا جس کے پیچھے وہ ایک عرصے تک بھاگی تھی اور وہ اسے نہیں مل سکا تھا اور اب اتنے عرصے بعد ملا بھی تو اس طرح جس کا گمان بھی اس کے ذہن میں نہ تھا۔

سفر طویل تھا، مگر کٹ گیا تھا، منزل قریب آچکی تھی۔ اب ماضی کی نادانیوں پر رنج کرنے کا نہیں، مستقبل کو بہتر بنانے کا وقت تھا۔

اس نے ایک دفعہ پھر ریان کو دیکھا، وہ کسی سوچ میں گم اسی پودے کو نگاہوں کا محور بنائے ہوئے تھا۔

''شاید اس کو بھی اس پودے کے یوں مرجھا جانے کا افسوس ہے۔'' اس نے دل میں سوچا تھا۔

''یہ بڑا ہی سخت جان پودا ہے'' ریان اس پودے کو نگاہوں کے حصار میں لیے ان دونوں سے کہنے لگا۔

''میں نے اتنا ڈھیٹ پودا آج تک نہیں دیکھا۔ میں جب بھی گھر آتا تھا یہ پودا مجھے سامنے دکھائی دیتا تھا زہر لگتا تھا مجھے یہ۔ بڑی کوشش کی میں نے اسے مارنے کی مگر یہ نہایت ڈھیٹ واقع ہوا ہے۔ میں ہر دو دن بعد اس میں دوا ڈالتا ہوں مگر اتنا زہر کھا کر بھی یہ نہیں مرتا۔ پتا نہیں کیسے اب تک سروائیو کررہا ہے۔''

امل اور جبرائیل دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

پھر یکدم ہی وہ دونوں کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگے۔ ریان نے سوالیہ نگاہوں سے ان کو دیکھا مگر وہ دونوں نان اسٹاپ ہنستے ہی چلے جارہے تھے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا وہ اپنے کسی سیکرٹ پر ہنس رہے تھے اور جو اسے ہرگز نہیں بتائیں گے۔

اس نے خفگی سے انہیں گھورا اور پھر رخ موڑ کر بظاہر سامنے مگر کن اکھیوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

وہ دونوں بدستور ہنس رہے تھے۔